بسمہ تعالیٰ

دارالعلوم لطیفیہ ویلور

کا

ادبی منظرنامہ

ڈاکٹر راہی فدائی

ناشر

ابوالحسان اکادمی، ۱۸۴/۶ برہان الدین اسٹریٹ

کڈپہ ۵۱۶۰۰۱

© راھی فدائی

DARUL ULOOM LATEEFIA VELLORE
KA
ADABI MANZAR NAMA

نام کتاب : دار العلوم لطیفیه ویلور کا ادبی منظر نامه

مصنف : ڈاکٹر مولانا ظہیر احمد باقوی راھی فدائی

کمپیوٹر کتابت : شارپ کمپیوٹرس، محبوب بازار کامپلکس، چادر گھاٹ، حیدر آباد۔ ۲۴ فون : 4574117

کمپوزیٹرس : محمد صلاح الدین بدر و محمد ذکی الدین لیاقت

مطبع : وجئے پرنٹرس، حیدر آباد۔

تعداد : ۸۶ء

اشاعت اول : ۱۹۹۷ء

زیر اہتمام : ڈاکٹر محمد علی اثر

سرورق : قیصر سرمست

قیمت : ایک سو پچیس روپے (Rs. 125/-)

☆ ملنے کے پتے ☆

۱۔ مصنف 6/184 برہان الدین اسٹریٹ ۔ کڈپہ ۔ 516001

۲۔ تمل ناڈو اردو پبلیکیشنس ۔ 26، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، مونٹ روڈ، مدراس ۔ 2

۳۔ شب خون کتاب گھر 313، رانی منڈی، الہ آباد ۔ 3

۴۔ مکتبہ ء جامعہ، جامعہ نگر دہلی ۔ بھنڈی بازار ۔ ممبئی

۵۔ ڈاکٹر محمد علی اثر 9/226۔4۔20 محبوب چوک ۔ حیدر آباد ۔ 2

انتساب

بنام

جناب محترم الحاج دانیال قاضی صاحب دام اقبالہ
جناب مکرم ایم۔ اے۔ منال صاحب زید لطفہ

من لم یشکر الناس یشکر اللہ (حدیث شریف)
(جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کیا، اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا)

ھدیہ امتنان

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب ــــــ جنہوں نے راہ تحقیق میں راہنمائی کی

پروفیسر معین الدین عقیل صاحب ــــــ جنہوں نے مقدمہ گرانقدر تحریر فرمایا

ڈاکٹر محمد علی اثر صاحب ــــــ جنہوں نے عمدہ تعارف قلم بند کیا

جناب علیم صبا نویدی صاحب ــــــ جنہوں نے نیک مشورے دیے

مولانا نور احمد بیگ باقوی صاحب ــــــ جنکی نیک تمنائیں ساتھ رہیں

جناب رزاق انسر صاحب ــــــ جنہوں نے قطعہ تاریخ رقم کیا

جناب قاضی غضنفر علی اسد ثنائی صاحب ــــــ جنہوں نے کتابت وطباعت کے مراحل میں ساتھ دیا

جناب م-ق-سلیم صاحب ــــــ جنہوں نے مسودے کی پروف خوانی کی

ان تمام احباب کی خدمات عالیہ میں جنہوں نے راقم کی دامے - درمے - سخنے - قدمے ہمت افزائی کی

جزاھم اللہ خیر الجزاء

فہرست

ڈاکٹر معین الدین عقیل

پیش لفظ

ہماری تاریخ نویسی، چاہے وہ سیاسی ہو یا علمی و ادبی، بالعموم سیاسی مرکز کے تابع رہی ہے اور اسی کے ماتحت تہذیبی مراکز کو اپنا موضوع بناتی رہی ہے۔ پھر ہمارے مؤرخین نے اسی روایت کو مرکزی رو قرار دے کر تاریخ کو محض مرکز کے دائرے میں محدود اور مخصوص رکھ کر دیکھا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ تاریخ تو دراصل حکمراں لکھواتے رہے اور ان کے دربار علماء و فضلاء کے ساتھ ساتھ مورخوں کی آماجگاہ بنے رہے سچناں چہ یہ مؤرخ تاریخ کو اپنے مربی کی نظر سے دیکھتے اور یوں تاریخ نویسی کے ایک ایسے رویہ اور رجحان کو رواج دیتے رہے، جو محض حکمرانوں کے "کارناموں" کا احاطہ کرتے ہیں۔ شاذ ہی ایسی مثالیں نظر آتی ہیں، جن میں کسی مؤرخ نے اس رویے سے ہٹ کر اپنی تحریر کردہ تاریخ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہو یا حکومت و دربار سے باہر نکل کر ملک کی معاشرتی اور علمی و ثقافتی اقدار پر کماحقہ، نظر ڈالی ہو اور اقتصادیات کے مسائل کو اپنے تجزیے کا موضوع بنایا ہو ــــ اور پھر خود کو غیر جانب دار بھی رکھا ہو!

یہ تو ہمارے عہد زوال نے ــــ جسے زوالِ عہد مغلیہ یا زوالِ ملت اسلامیہ بھی کہہ لیجیے۔ ہمیں خود پر نظر ڈالنے اور اپنی کم زوریوں کا شمار کرنے پر کسی حد تک ہمارے کسی حساس طبقہ کو آمادہ کیا تو ہماری تاریخ نویسی نے بھی اس احساس و شعور کے تحت جدید زمانہ میں سانس لیتے ہوئے وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے ایسے عوامل پر نظر ڈالنی شروع کی جو معاشرے کے عروج و زوال کا باعث بنتے ہیں سچناں چہ

اب، جب کہ زمانہ بھی بدل چکا تھا، قدریں اور روایتیں بھی تبدیل ہو رہی تھیں، "تاریخ" کے معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی اور پھر ادبی (یا تخلیقی) عوامل نے بھی اپنے ناگزیر ہونے کے احساس کو مستحکم کر دیا۔

لیکن ــــ اس عہد میں بھی، اگر ہماری کوئی علمی اور ادبی تاریخ لکھی گئی تو وہ اسی مرکزی رو کے جائزے و مطالعے تک محدود رہی جو سیاسی اور پھر تہذیبی مراکز سے منسلک تھی، یا اب بدلے ہوئے حالات میں، زیادہ سے زیادہ چند متمول ریاستی درباروں تک اپنا دائرہ بڑھا سکی تھی۔ پھر اس میں بھی ــــ مقربین و مربی یا صفِ اول کے گنے چنے معروف فاضل علم و ادب سے زیادہ کسی کو شاذ ہی جگہ مل سکی! یہ روایت (چاہیں تو یہاں رویہ بھی کہا جا سکتا ہے) اس قدر مستحکم رہی ہے کہ علم اور ادب کے اجتماعی یا موضوعاتی عام جائزوں کو اب تک بالعموم اسی مرکزی رو سے مخصوص کرنے کا رجحان موجود ہے ــــ جس کے دائرے میں شمالی ہند کے باہر کے علاقے یا علمی و تہذیبی مراکز شامل نہیں ہوتے ــــ چناں چہ اس رجحان کے تحت پیدا ہونے والا ردِ عمل ہی تھا کہ جس نے دکن، پنجاب، پھر مدراس و میسور اور بمبئی، بنگال و بہار جیسے تہذیبی مراکز کے علاقائی علمی و ادبی تذکروں اور جائزوں کی روایت قائم کی ــــ جو بڑھ کر برعظیم پاک و ہند (بلکہ جنوبی ایشیا) کے تمام علاقوں کی سیاسی، تہذیبی، علمی و ادبی تاریخوں کے مرتب کرنے کے عام رجحان میں وسعت اختیار کر گیا۔ اب شاید ہی جنوبی ایشیا کا کوئی قابلِ ذکر تہذیبی یا علمی و ادبی مرکز ایسا ہو ــــ جس کی ایسی تاریخیں مرتب نہ ہوئی ہوں۔ پھر اسی ذیل میں ان علاقوں میں وجود میں آنے والے علمی و ادبی تخلیقات کی تلاش و جستجو اور انھیں منظر عام پر لانے کی مستقل روایت بھی قابل تحسین حد تک مستحکم ہوئی ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ایسی ہی روایت نے ہمارے سامنے ایسی جزئیات پیش کی ہیں، جن سے کُل کی ایک ایسی تصویر بنتی ہے، جو ان ہی جزئیات کے باوصف مکمل ہوتی ہے۔

مرکز سے دور ایسے ہی مقامات میں ایک "ویلور" بھی ہے، جو اگرچہ ایسے دیگر

علاقوں سے اپنے رقبہ اور اپنی آبادی کے لحاظ سے نہایت مختصر اور غیر اہم ہے ـــ لیکن ایک تاریخ اور ایک تہذیب سے وابستہ رہنے کے باعث اور خود اپنے علمی و تہذیبی اظہار کے طفیل اپنی ایک شناخت بھی رکھتا ہے۔ آج اس کی اس شناخت کے اگر چند حوالے تلاش کیے جائیں ـــ تو میرے لیے اس کی یہ شناخت جناب راہی فدائی صاحب کے توسط سے بھی ہے، جن کی کاوشوں نے میری طرح نہ جانے کتنوں کو اس شناخت سے بہرہ ور کیا ہے۔ اگرچہ اس شہر کی علمی اور ادبی زندگی کے سرسری حوالے ہماری مذکورہ نوعیت کی تاریخوں میں گاہے گاہے مل جاتے ہیں اور پھر حالیہ کچھ برسوں میں چند مصنفین نے اس شہر کے بعض مشاہیر کے انفرادی مطالعہ کو بھی موضوع بنایا ہے لیکن راہی فدائی صاحب نے اس شہر کی علمی و ادبی تاریخ کے بسوط مطالعے کیے ہیں اور یہاں کی علمی اور ادبی تاریخ کے ربط کو مرتب صورت میں پیش کرنے کی بہت مفید کوششیں کی ہیں۔

ان کا یہ مطالعہ دو مرحلوں میں اب تک سامنے آیا ہے ـــ اور اس کے ربط و مطالعہ کو انھوں نے یہاں کی دو ایسی درس گاہوں کو حوالہ بنایا ہے ـــ جو ایک لحاظ سے اس شہر کی بڑی حد تک ساری علمی و تہذیبی زندگی کا محور و منبع کہی جا سکتی ہیں۔ یہ درس گاہیں: " مدرسہء باقیات الصالحات " اور " دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکاں " ہیں ـــ اور حقیقتاً ان ہی درس گاہوں کے قیام اور خدمات کا عرصہ ہی اس شہر میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخی اور تہذیبی زندگی کا مظہر رہا ہے۔ اور یہی درس گاہیں اس شہر اور اس کے اطراف و اکناف کے مسلمانوں کو اسلام اور اسلامی علوم سے آراستہ رکھنے اور ان میں اسلامی تعلیم اور علم و ادب کے فروغ کا باعث بنی ہیں۔

راہی فدائی صاحب نے اپنے اس مطالعہ کا آغاز قبل ازیں ـــ " مدرسہء باقیات الصالحات کے علمی و ادبی کارنامے " کی تصنیف (مطبوعہ: ۱۹۹۶ء) سے کیا تھا اور اس درس گاہ سے منسلک اساتذہ و علماء اور ان سے فیض یافتہ شاگردوں کی علمی و تصنیفی اور شعری خدمات کا اس طرح جائزہ مرتب کیا تھا کہ جس سے اس شہر کی علمی و

ادبی سرگرمیوں کا بڑی حد تک پورا منظر ہمارے سامنے نہ صرف تشکیل پاتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ یہاں کے مشاہیر کی مجموعی علمی و ادبی خدمات کی تفصیلات سامنے آتی ہیں اور ان کا امتیاز و اختصاص اجاگر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے مطالعہ کا یہ عرصہ اس درس گاہ کے قیام (۱۸۸۳ء) سے عہد حاضر تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اب انھوں نے اپنے اس جائزے کے عرصہ کو ماضی میں وسط اٹھارویں صدی تک پھیلا دیا ہے اور " دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان " سے منسلک علماء و اساتذہ اور ان سے مستفیض مشاہیر علم و ادب کی خدمات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس ادارے کا قیام، ان کے تعین زمانہ کے مطابق، ۱۷۶۶ء کے آس پاس کا واقعہ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی یہ زیر نظر تصنیف، ہمیں دو صدیوں سے زیادہ کے عرصہ پر مشتمل اس دور میں، اس شہر اور یہاں کے فضلاء کی ایک بھرپور علمی و ادبی تاریخ کی اس مرکزی رو میں، جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اپنی اپنی حیثیت کے ساتھ شمولیت کا موضوع بنتے ہیں۔ ایسے کتنے ہی علماء فضلاء اور ادیب و شاعر ہیں جن سے شاید پہلی بار فدائی صاحب کی ان تصانیف کے ذریعہ علمی دنیا متعارف ہوئی ہے —— یا ہو رہی ہے۔

یہ راہی فدائی صاحب کا وصف خاص ہے کہ انھوں نے اپنی دل چسپی، اپنی توجہ اور اپنی محنت کے ذریعہ اس شہر سے منسلک اکابر کو دنیائے علم و ادب میں متعارف کرانے اور انھیں ان کے مقام پر فائز کرنے کی ایسی مستحسن کوشش کی ہے، جس پر یقیناً نہ صرف یہ شہر بلکہ اس سے منسلک ادارے اور ان سے وابستہ افراد ان کے ممنون رہیں گے۔ ورنہ صورت یہ رہی ہے کہ ادب میں زیادہ سے زیادہ فراقی، آگاہ اور قربی معدودے چند تذکروں اور تواریخ ادب میں کچھ جگہ پاسکے ہیں، جب کہ دیگر متعدد قابل ذکر ادیبوں، شاعروں اور کئی علماء کا ذکر کہیں حاشیوں میں بھی نہیں ملتا۔ فدائی صاحب کی زیر نظر تصنیف متعدد اکابر و فضلاء کے بارے میں نہایت ضروری معلومات کو ایسی یکجا اور جامع صورت میں ہمارے سامنے لا رہی ہے، جس میں وسعت معلومات بھی ہے اور مصنف کی دقت نظر بھی۔ اس ذیل میں بعض

اکابر کے بارے میں جو معلومات انھوں نے یکجا کی ہیں اور جس طرح رتمام جزئیات اور ضروری پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے ، اس اعتبار سے ان کے رتحریر کردہ بعض ایسے موضوعات اور ابواب اپنی بسُوط اور مستقل حیثیت میں رشاید پہلی بار اس قدر جامعیت حاصل کر سکے ہیں۔

ان کا یہ مطالعہ کثرتِ ماخذ اور افراطِ معلومات سے مکمل ہوا ہے —— جو ہم عصر بھی ہیں اور متاخر بھی ۔ان کے اسنادِ محولہ کو دیکھنے سے ان کی فراہمی میں ان کی انتہائی مستعدی اور جان فشانی کا ثبوت ملتا ہے ۔فرد یا موضوعِ متعلقہ پر تو شاید ہی کوئی مطبوعہ ماخذ ہو جو فدائی صاحب کی نظر سے بچا ہو —— جب کہ غیر مطبوعہ ماخذ تک رسائی میں بھی انھوں نے شاید کوئی کسر نہیں چھوڑی ۔ان کی تلاش و جستجو کا یہ وصف ان کی تصانیف میں عام ہے اور بالخصوص " کڈپہ میں اردو " اور " مدرسہء باقیات الصالحات کے علمی وادبی کارنامے " میں بھی میرے لیے جاذب نظر رہا ہے ۔اور اب تو ان کی یہ زیر نظر تصنیف ان کی اپنی اس روایت میں مزید اضافہ نظر آتی ہے ۔

○ ○ ○

ڈاکٹر محمد علی اثر
ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
حیدر آباد

تعارف

مولانا ظہیر احمد باقوی اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں راہی فدائی کے قلمی نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ صوبہ آندھرا کے ضلع کڈپہ کے متوطن اور ایک علمی و مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم کڈپہ ہی میں ہوئی لیکن بہ حیثیت طالب علم اور استاذ انھوں نے اپنی عمر عزیز کا زیادہ حصہ تامل ناڈو کے شہر ویلور میں گزارا۔ ڈاکٹر راہی فدائی کی ذہنی نشو و نما اور فکری بالیدگی میں جنوبی ہند کی مشہورِ زمانہ دینی درس گاہ باقیات الصالحات کے قابل اساتذہ کے علاوہ ان کے استاد حضرت مولانا سید شاہ محمد یعقوب صاحب باقوی بغدادی، پیر و مرشد حضرت علامہ سید شاہ عبدالجبار صاحب قادری باقوی نیشاپوری اور استادِ سخن حضرت فدوی باقوی کا بھی حصہ ہے۔ اسی درس گاہ سے انھوں نے مولوی فاضل کا امتحان ۱۹۷۴ء میں کامیاب کیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں مدراس یونی ورسٹی سے ادیبِ فاضل اور افضل العلما کی اسناد حاصل کرنے کے بعد کم و بیش اٹھارہ سال تک وہ اپنی مادرِ علمیہ میں عربی کے استاذ کی حیثیت سے درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر راہی نے میسور یونی ورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کا امتحان بدرجۂ اول کامیاب کیا اور پھر ایس۔ وی۔ یونی ورسٹی تروپتی سے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی نگرانی میں "ویلور کے مدارس کی علمی و ادبی خدمات" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر کے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا راہی کو دار العلوم باقیات الصالحات کے دینی، علمی اور ادبی ترجمان "صفیر" و "نفیر" کی ادارت کا دیرینہ تجربہ بھی حاصل ہے۔ مذکورہ سال ناموں کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے پچیس شمارے مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔

جہاں تک ڈاکٹر راہی فدائی کے ادبی کارناموں کا تعلق ہے وہ جدید لب و لہجہ کے ایک باکمال سخن ور بھی ہیں اور دیدہ ور محقق و نقاد بھی۔ اب تک ان کی ایک درجن سے زائد تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

(الف) شعری مجموعے:

۱۔ لہجے	۱۹۷۴ء	(شراکتی تصنیف)
۲۔ انتسللہ	۱۹۷۸ء	(")
۳۔ تصنیف	۱۹۸۱ء	(")
۴۔ انامل	۱۹۸۷ء	
۵۔ ترقیم	۱۹۹۰ء	
۶۔ مصداق	۱۹۹۳ء	

(ب) تحقیقی اور تنقیدی تصانیف

۱۔ باقیات ایک جہاں	۱۹۸۰ء	
۲۔ تجزیہ	۱۹۸۸ء	
۳۔ اکتساب نظر	۱۹۹۱ء	
۴۔ مسلک باقیات	۱۹۹۱ء	
۵۔ کڑپہ میں اردو	۱۹۹۲ء	
۶۔ اوراق جاوداں	۱۹۹۴ء	(مکاتیب کا مجموعہ)
۷۔ مدرسہ باقیات الصالحات کے علمی و ادبی کارنامے	۱۹۹۶ء	
۸۔ ویلور تاریخ کے آئینے میں	۱۹۹۷ء	

متذکرہ بالا تصانیف میں سے بیش تر کو مختلف اردو اکیڈیمیوں سے انعامات مل چکے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر راہی کو آل انڈیا میر اکیڈیمی لکھنو نے ادبی ایوارڈ (امتیاز میر) سے بھی نوازا ہے۔ مندرجہ بالا کتابوں میں سے "مدرسہ باقیات الصالحات کے علمی و ادبی کارنامے" ڈاکٹر راہی کے پی۔ایچ ڈی کے مقالے کے ایک جزو کی

حیثیت رکھتی ہے۔

پیشِ نظر کتاب بھی مذکورہ مقالے کا تحقیقی اعتبار سے ایک اہم جزو ہے۔ " دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان " دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں فاضل مصنف نے ویلور کے دینی مدارس کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے جنوبی ہند کے سواحل ملیبار اور معبر پر مسلمانوں کی آمد اور مذہبِ اسلام کی ترویج و اشاعت پر طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ قدیم تذکروں کے حوالے سے ڈاکٹر راہی نے اطلاع دی ہے کہ تامل ناڈو کے شہر ویلور میں مسلمان ۷۰۰ھ مطابق ۱۳۰۰ء سے آباد ہیں اور اس علاقے کے قدیم ترین اولیا اور مذہبی رہنماؤں میں حضرت نور محمد قادری ویلوری حضرت بابا مظہر الدین المعروف بہ نظہر اولیا ترچنا پلوی (متوفی ۶۷۳ھ / ۱۲۷۴ء) حضرت سید اسمٰعیل حیدر ولی (متوفی ۶۶۸ھ / ۱۲۷۰ء) اور حضرت بابا فخرالدین گنج الاسرار (متوفی ۶۹۴ھ / ۱۲۹۵ء) کے نام نامی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ جنوبی ہند سے عربوں کے قدیم تعلقات و روابط کے سلسلہ میں ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر آرنلڈ اور سید سلیمان ندوی نے بالترتیب اپنی تصانیف " انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر " ۔ " پریچنگ آف اسلام " اور " عرب و ہند کے تعلقات " میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ انکشاف کیا ہے کہ مسلمان عرب، تبلیغ اور تجارت کے سلسلہ میں جنوبی ہند کے سواحل پر پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) سے آباد ہونے لگے تھے اور مقامی لوگوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اول الذکر دونوں مورخین نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں ملیبار کے راجہ نے ایک بزرگ شیخ ابن مالک کے دستِ حق پرست پر مذہب اسلام قبول کیا تھا۔ بہ قول ڈاکٹر راہی فدائی حضرت شیخ ابن مالک (مالک ابن دینار) کا مزار کاسر گوڑ (کیرلا) میں موجود ہے۔

ڈاکٹر راہی نے جنوبی ہند کے مختلف دینی و علمی مدارس کا پس منظر پیش کرتے ہوئے اپنے پیش رو مصنفین اور تذکرہ نگاروں کی تقلید کرنے کی بجائے ان کے بیانات کو بہ نظرِ غائر جانچنے اور پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ حضرت عبداللطیف بیجاپوری کا سالِ وفات پروفیسر فضل اللہ اور پروفیسر یوسف کوکن جیسے جغادری

محققین کے علاوہ دیگر مصنفین نے بھی ۱۱۴۹ھ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر راہی مذکورہ سال وفات سے اختلاف کرتے ہوئے مولانا رکن الدین شاہ محمد قادری ویلوری کے کہے ہوئے قطعہ، تاریخِ وفات کی روشنی میں شاہ عبداللطیف کی رحلت کا سال ۱۱۵۰ھ بتایا ہے۔ جس سے ان کی تحقیقی ژرف نگاہی کا پتہ چلتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ دارالعلوم لطیفیہ کے فیض یافتہ ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے پر مشتمل ہے جس میں ڈاکٹر راہی نے ابتداً جنوبی ہند میں قدیم اردو ادب کے فروغ کے سلسلہ میں بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار پر سرسری نظر ڈالی ہے اور پھر دکنی اردو کے نشو ونما اور ارتقا کے سلسلہ میں مذہبی رہنماؤں اور صوفیوں کی خدمات کا مدلل اور مفصل جائزہ لیا ہے۔

پیشِ نظر کتاب میں مدرسہ لطیفیہ کے ۲۰ فارغ التحصیل اہل علم کا تذکرہ شامل ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر راہی نے مختلف دلائل اور شواہد کی روشنی میں مدرسۂ لطیفیہ سے متعلق تمام علما، شعرا اور مصنفین کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ دارالعلوم لطیفیہ کے متوسلین میں قربی ویلوری، ذوقی ویلوری، آگاہ ویلوری محوی ویلوری حیات میسوری اور احقر بنگلوری نے اپنی غیر معمولی علمی وادبی صلاحیتوں کے ذریعے اقطاعِ عالم میں اس درس گاہ کا نام روشن کیا ہے۔

حضرت قربی ویلوری کے علمی و ادبی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے ڈاکٹر راہی ان کے واقعات حیات پیش کیے ہیں اور ان کی تصانیفِ نظم و نثر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے ادبی مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوص میں انھوں نے قربی کے کلام کا ولی، سراج اور درد کی شاعری سے تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر راہی کے اس بیان سے پوری طرح اتفاق مشکل ہے کہ قربی نے ولی کے صرف دورِ اول کے کلام کا تتبع کیا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں قربی نے ولی کے دورِ اول کی شاعری سے بھی استفادہ کیا ہے اور دورِ دوم کے کلام سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کی طرح قربی کے ہاں بھی تراکیب اور اضافتوں کا خوب صورت استعمال نظر آتا ہے جیسے رہِ وصل۔ وجودِ خدا۔ نوحہ۔ نوح۔ اشکِ داود۔ عشاقِ بے

نوا۔ گلشنِ ہستی۔ زلفِ مشک سا۔ ماہِ مہر سیما۔ موردِ عنایت مشتاق۔ وغیرہ۔

حضرت ذوقی ویلوری کی حیات و خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر راہی نے نہ صرف ان کی مختلف النوع تصانیف کا مفصل تعارف کروایا ہے بلکہ ڈاکٹر یوسف کوکن، ڈاکٹر افضل اقبال اور دیگر مصنفین کی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا ہے کہ مثنوی " غوث نامہ " ذوقی ویلوری کی نہیں بلکہ سید شاہ حسین ذوقی (بحرالعرفان) کی تصنیف ہے۔

مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری اردو کے اولین نقاد اور قادرالکلام شاعر تھے۔ ڈاکٹر راہی فدائی نے تمام ممکن الحصول ذرائع سے مواد اکٹھا کر کے آگاہ کی حیات اور علمی و ادبی خدمات کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے آگاہ کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کر کے بعض نئے انکشافات بھی کیے ہیں اور چند مفروضات کی تصحیح و تشریح بھی۔ مثنوی گلزارِ عشق " کی تاریخ تصنیف ڈاکٹر افضل اقبال نے " مدراس میں اردو " میں ۱۲۱۰ھ تحریر کی ہے اور اس مثنوی کے اشعار کی تعداد رائق مدراسی نے " گل دستۂ کرناٹک " میں ۴۰۰۰ بتائی ہے۔ ڈاکٹر راہی نے مذکورہ دونوں اہلِ قلم کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے خود آگاہ کے بیان کے مطابق اس مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۱۹۱ھ اور اشعار کی تعداد ۳۹۵۰ بتائی ہے۔ اسی طرح " خمسۂ متحیرہ اوجِ آگاہی " کی پہلی مثنوی " صبحِ نو بہار عشق " کی تاریخ تصنیف کے سلسلہ میں مولوی نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر افضل اقبال کے نتائجِ تحقیق بالترتیب ۱۲۰۹ھ اور ۱۲۱۳ھ کو مدلل طور پر غلط قرار دیتے ہوئے خود آگاہ کے پیش کردہ مادّہ تاریخ " شرارہ عشق کا ہے " کی روشنی میں مذکورہ مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۱۲ھ بتایا ہے۔

باقر آگاہ کی مثنوی " محبوب القلوب " سے متعلق ڈاکٹر راہی کا یہ بیان محلِ نظر ہے کہ " آگاہ سے پیش تر کسی دکنی شاعر نے حضرت غوثِ اعظم کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ نظم نہیں کیے "۔ جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے آگاہ سے قبل حضرت غوث اعظم کے مناقب و حالات میں افضل قادری اور غوثی ارکاٹی نے بالترتیب " محی الدین نامہ " اور " ریاضِ غوثیہ " کے زیرِ عنوان دو مثنویاں قلم بند

کی ہیں۔ "محی الدین نامہ" ۱۰۹۷ھ کی ایک مختصر سی تصنیف ہے لیکن "ریاضِ غوثیہ محبوب القلوب" سے ۳۷ سال قبل ،۱۱۶۹ھ میں لکھی گئی ہے اور ۵۷۶۰/ ابیات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم مثنوی ہے۔

دارالعلوم لطیفیہ کے مذکورہ بالا فیض یافتہ علما، شعرا اور نثرنگاروں کے مختلف الجہات علمی و ادبی کارناموں کی طرح ڈاکٹر راہی نے دیگر اصحابِ علم و فضل کی خدمات کا بھی داخلی شواہد اور خارجی دلائل کے ذریعے مکمل اور سیر حاصل جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

تحقیق سچائی کی تلاش اور حقیقت کی بازیافت کا نام ہے۔ تحقیق کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔آج کی تحقیقات مستقبل میں ساقط الاعتبار اور غلط بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر راہی فدائی نے حقائق کی چھان بین میں حزم و احتیاط سے کام لیا ہے۔اس لیے ان کے مستخرجہ تحقیقی نتائج سے اختلاف کی گنجائش بہت کم نکلتی ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا راہی کی پیشِ نظر کتاب اردو کے علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی سرمایے میں ایک قابلِ لحاظ اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "دارالعلوم لطیفیہ کے علمی و ادبی کارنامے" کی اشاعت پر میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس علمی و تحقیقی تصنیف کی اردو دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی ہو گی۔

○ ○ ○

تمہید

دنیا کی ہر تحریک چاہے وہ سماجی ہو یا دینی اس کا بالواسطہ یا بلا واسطہ ربط و تعلق سیاسی عوامل سے ہوتا ہے، سیاست کے دور رس نتائج بعض اوقات صدیوں پر محیط ہوتے ہیں شائد اسی لیے کہا گیا ہے "السیاسة والدین توامان" (سیاست اور دین جڑواں بچے ہیں) دونوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا فطرت کے عین مطابق ہے۔

شہر ویلور کے مدارس عربیہ مثلاً دار العلوم لطیفیہ اور مدرسہ، باقیات صالحات کا وجود و نمود بھی اسی قانون فطرت کا مرہون منت ہے لہذا مذکورہ مدارس عربیہ کے قیام کی تاریخ بیان کرنے سے قبل اس کی وضاحت بے جانہ ہوگی کہ شہر ویلور میں مسلمان کس عہد سے آباد ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ مذہب اسلام ہندوستان میں سب سے پہلے جنوبی ہند کے سواحل ملیبار و معبر سے داخل ہوا، جس کے ثبوت کے طور پر کیرلا اور مدراس میں موجود صحابہؓ اور تابعینؒ کے مزارات مقدسہ شاہد ہیں۔ چناں چہ درگاہ کولم شریف (مدراس) میں آرام فرما حضرت تمیم انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صحابئ رسولؐ ہونے کی روایت حد تواتر تک پہنچ چکی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی دور میں مسلمان ساحلی مقامات سے آگے بڑھ کر میدانی علاقوں تک رسائی حاصل کر چکے ہوں جس کے نتیجہ میں سرزمین ویلور اور اس کے اطراف واکناف کی راہیں مسلمانوں کے نقوش قدم سے منور ہو اٹھیں ہوں تاہم مذکورہ قیاس کی تقویت کے لیے کوئی دستاویزی ثبوت فراہم نہیں ہوا ہے البتہ اس امر کا انکشاف ضرور ہوا ہے کہ ویلور میں مسلمان سلطان علاؤ الدین خلجی (۱۳۱۶ء - ۱۲۹۶ء) کے مشہور سپہ سالار ملک

کافور کی پہلی فوج کشی (۷۰۹ھ مطابق ۱۳۰۹ء) سے قبل آباد ہو چکے تھے۔ اس دعویٰ کی دلیل کے لیے شہر ویلور کے دریائے پالار کے کنارے آسودۂ خاک حضرت نور محمد قادریؒ کا حوالہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔

حضرت نور محمد قادری قدس سرہ، آج سے تقریباً سات سو (۷۰۰) سو سال قبل اشاعت اسلام کے لیے ویلور تشریف لائے آپ نے یہاں پر پھیلی ہوئی کفر و ضلالت کی تاریکی میں ایمان وہدایت کی شمعیں روشن کیں۔ آپ بڑے ہی صاحب کمال بزرگ تھے۔ بہ قول حضرت غلام عبدالقادر ناظر (متوفی ۱۲۴۳ھ) "حضرت نور محمد قادری علیہ رحمتہ اللہ الباری کہ فرید عصر و مغتنم وہر بود۔ اکثر بتخانہا را از پایہ برانداخت و بعض را ویراں و بے چراغ ساخت، مدفن خود را ہم درجاے بظہور آورو کہ گردو پیش آں بتکدہا است، غرض صاحب قدرے، بود کہ بزرگیہایش یادگار زمانہ شدہ، زیادہ از پانصد سال است کہ از شمع وجود بیگانہ، خاک نور آگنیں نمود و بکنار رود نجواب راحت آسود۔" (۱)

یعنی "حضرت نور محمد قادری رحمتہ اللہ علیہ اپنے وقت کے مشہور و معروف بزرگ تھے، انھوں نے اکثر بت خانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا اور بعضوں کو ویران و بے چراغ کر دیا، آپ کی قبر بھی ان ہی ویران مندروں کے بیچ واقع ہے۔ بہر حال آپ کا شمار صاحب کشف و کرامت اہل اللہ میں ہوتا ہے۔ آپ کے وصال کو پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، مزار ندی کے کنارے واقع ہے" یاد رہے کہ حضرت ناظر نے "بہار اعظم جاہی" ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۳ء میں ختم کی تھی، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نور محمد قادری کی وفات آج سے سات سو سال قبل ہوئی تھی اور اس سے لازماً یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ شہر ویلور میں مسلمان تقریباً ۷۰۰ھ مطابق ۱۳۰۰ء سے آباد ہیں۔

یہ وہ دور تھا جبکہ ویلور "ہوے سیلا" سلطنت (۱۰۲۲ء تا ۱۳۴۲ھ) کے زیر تسلط تھا اور اس عظیم سلطنت کے پایہ تخت "دوارا سمندر" یعنی موجودہ "ہلے بید" ریاست

میسور تھا جس کا حکمران بلالہ دیو سوم ۱۲۹۱ء تا ۱۳۴۲ء) ولد سومیشور (۱۲۳۲ء ۔ ۱۲۶۷ء) تھا (۲)۔

حضرت نور محمد قادری ویلوریؒ کے معاصرین میں حضرت سید بابا مظہر الدین المعروف بہ نطہر اولیاء ترچنا پلوی قدسرہ، (متوفی ۶۷۳ھ مطابق ۱۲۷۴ء) اور آپ کے مشہور و معروف خلفاء حضرت سید اسمعیل حیدر ولی ملباگلیؒ (متوفی ۶۶۸ھ ۔ ۱۲۷۰ء) اور حضرت بابا فخر الدین گنج الاسرار پنگنڈویؒ (متوفی ۶۹۴ھ ۱۲۹۵ء) قابل ذکر ہیں ۔ مصنف بہارِ اعظم جاہی کی فارسی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نور محمد قادریؒ صفت بت شکنی میں معروف و ممتاز تھے اور مذکورہ بالا تینوں معاصر بزرگان دین کا وصف خاص بھی یہی بت شکنی و حق پرستی تھا جس کا بین ثبوت ان حضرات کے آستانوں کی تراش و خراش اور ان کے تاریخی کارناموں سے ملتا ہے علاوہ ازیں ان ہم عصر و ہم مزاج بزرگوں کی آخری آرام گاہوں یعنی ویلور ملباگل اور پنگنڈا کے قریب قریب اور ایک ہی ریجن (Region) میں واقع ہونا اس قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے کہ ان حضرات کا باہمی تعلق اور آپسی ربط و ضبط کسی نہ کسی حیثیت سے رہا ہے ۔ حضرت نور محمد قادریؒ کے بعد بھی ویلور میں مسلمانوں کی آبادکاری جاری و ساری رہی چوں کہ ملک کافور نے ۷۱۰ھ مطابق ۱۳۱۰ء میں پانڈوں کی سلطنت جو انتہائی جنوب میں تھی فتح کی تھی اور بعد ازاں مسلمانوں کی خود مختار ریاستیں وقتاً فوقتاً قائم ہوئیں اور ختم ہوتی رہیں جس کی وجہ جنوبی ہند میں مسلمان دور دراز علاقوں تک پھیلے اور آباد ہوتے رہے ۔ ان مسلمانوں کی دینی ضرورتوں کی تکمیل اور ان کی بہتر رہنمائی کے لیے ہر دور میں ہر مقام پر چند نفوس قدسیہ کا ورودِ مسعود قرینِ قیاس ہے ۔ شہر ویلور میں حضرت نور محمد قادری کے بعد تشریف لانے والے علمائے مصلحین و صوفیاء کاملین کی تاریخ پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں، صدیوں کی ان گم گشتہ کڑیوں کے بعد پھر سے کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے تو وہ حضرت شاہ علی حسینی چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ سے پھوٹنے والی ہلکی اور دھیمی روشنی ہے ۔ بقول حضرت مولوی غلام عبد القادر نائطی ناظر مدراسی

"آپ ویلور کے مشائخ قدیم اور نامور بزرگوں کے چشم و چراغ میں آپ کی رحلت تقریباً ۱۱۳۸ھ میں ہوئی اور آپ کا مزار شریف ایک خوش نما دیدہ زیب گنبد میں محفوظ ہے۔اس گنبد کے صحن میں مولسری کے درختوں سے لدا ہوا ایک دل کش وسیع چمن ہے جس کے احاطہ میں مسجد خانقاہ اور دیگر خاندانی مقابر موجود ہیں" (۳)۔

مذکورہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ علی باشاہ مکان کے آبا و اجداد شہر ویلور میں زمانۂ دراز سے رشد وہدایت اور تبلیغ و اشاعت کے دینی فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔مگر ان کے دینی اور علمی کارنامے امتدادِ زمانہ کے گرد وغبار میں نظروں سے اوجھل ہوگئے۔اسی دور کی ایک اہم شخصیت حافظ سید محمد فراقی ولد سید کریم محمد حسینی (متوفی ۱۱۰۵ھ) کی ہے حضرت فراقی دکن کے کہنہ مشق شاعر اور مثنوی "مراۃ الحشر" کے مصنف ہیں، اس وقت آپ کی شاعری کا غلغلہ نہ صرف سارے جنوب بلکہ شمالی ہند میں بھی تھا اسی لیے آپ کا ذکرِ خیر شمالی ہند کے تذکروں جیسے مخزنِ نکات، تذکرہ شعراءِ اردو، عمدۂ منتخبہ، مجموعۂ نغز، اور گلِ رعنا میں بھی ملتا ہے، اردو کا مشہور و معروف شاعر ولی دکنی بھی آپ کے شعری خدوخال کی رعنائی سے متاثر تھا۔اس نے آپ کے ایک مصرع پر اس طرح گرہ لگائی تھی:

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستین آوے

فراقی کی رحلت ۹/ شوال ۱۱۴۴ھ میں ہوئی تھی (۴)۔

جناب نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ "اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد فراقی نے کچھ عرصہ تک اورنگ آباد میں قیام کیا، پھر جنوبی ہند پہنچ کر ویلور میں مستقل سکونت اختیار کر لی (۵)۔

حضرت فراقی بھی نظام خانقاہی کے تربیت یافتہ تھے۔اصلاحی و دعوتی طرز فکر کے متحمل ہونے کے باوجود آپ کے کارہائے نمایاں کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا ہے۔ فراقی کے بعد ویلور میں قدم رنجا فرمانے والی اہم ترین شخصیت حضرت مولانا سید شاہ

عبداللطیف قادریؒ بیجاپوری قدس سرہ کی تھی ۔آپ کا سلسلہء نسب پچیس ۲۵ واسطوں سے حضرت امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن علی ابن حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے ۔آپ کے ساتویں جدِ اعلیٰ قاضی سید اسمعیل رحمتہ اللہ علیہ اکابر اولیاء گجرات میں سے اہم ترین تھے ۔آپ مشہور عالم بزرگ حضرت شاہ عالم گجراتیؒ (متوفی ۸۸۵ھ) کے خلیفہء خاص تھے ۔شاہ عبداللطیف بیجاپوری کے جدِ امجد حضرت سید عبداللطیف عرف باپو جی اپنے اجداد کے وطن احمد آباد (گجرات) کو خیرباد کہتے ہوئے بیجاپور تشریف لائے اس وقت بیجاپور پر سلطان محمد عادل شاہ (۱۶۱۷ء تا ۱۶۵۶ء مطابق ۱۰۲۶ تا ۱۰۶۷) کی حکمرانی تھی ۔ سلطان نے آپ کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں چار مواضع زمین اور چار ہون (ہون سونے کا سکہ ہے قریب ایک تولہ کے مقدار ہوتا ہے یومیہ برائے مدد معاش مقرر کیا تھا(۶) ۔

آپ غیر مسلموں میں بھی اس قدر معزز تھے کہ لوگ آپ کو بطور عقیدت "باپو جی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے، حضرت شاہ عبداللطیف کے والد ماجد حضرت میراں سید ولی اللہ بیجاپوریؒ (متوفی ۱۰۹۹ھ) نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بیجاپور ہی میں ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا تھا، ان ہی دنوں شاہ عبداللطیف قادری کی ولادت ۱۰۶۷ھ میں ہوئی (۷) ۔

آپ کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ مدتِ دراز تک اپنے والد بزرگوار ہی کے زیرِ نگرانی جاری رہا، پھر آپ نے اپنے نانا سید شاہ ابوالحسن عرف گورے حسن مصنف مخزن السلاسل (متوفی ۱۱۳۲ھ) کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور تمام ۹۹ سلسلوں میں اجازت و خلافت سے سرفراز کیے گئے ۔آپ کا نکاح حضرت سید ابوالقاسم کی دخترِ نیک اختر سیدہ ساجدہ بیگم صاحبہ سے ہوا ۔اورنگ زیب عالم گیرؒ نے حضرت ابوالقاسم کے علم و فضل سے متاثر ہو کر آپ کو منصب پنج ہزاری اور درایت خان کے خطاب سے نوازا تھا (۸) ۔

عادل شاہی سلطنت کے زوال (۱۰۹۸ھ مطابق ۱۶۸۶ء) کے بعد بیجاپور سیاسی

انتشار بد نظمی اور بد امنی کا شکار ہوا اور وفات عالم گیر (۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء) کے بعد شہزادوں کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے اس عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوریؒ عالمِ دل گرفتگی میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ ۱۱۲۲ھ میں جب کہ آپ کے صاحب زادے ابوالحسن قربی (ولادت ۱۱۱۸ھ) چار سال کے تھے بیجاپور کو خیرباد کہہ کر عازمِ شاہ نور ہوئے جو ہبلی (کرناٹک) کے جنوب میں تقریباً چالیس میل پر واقع ہے۔ شاہ نور (ساؤنور) پہنچنے کے بعد وہاں کی آب و ہوا بھی آپ کو راس نہیں آئی۔ آپ دو سال قیام فرما کر اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ ۱۱۲۵ھ میں وہاں سے نکل کر کرناٹک کے مشہور شہر "سرا" (ٹمکور سے ۳۳ میل پر واقع ہے) میں فروکش ہوئے۔ اس زمانے میں "سرا" علاقہ کرناٹک کا عظیم صوبہ تھا، جس کی نظامت کے فرائض سلطنتِ مغلیہ کے سپہ سالار داؤد خان پنی (متوفی ۱۷۱۵ء) کے نائب محمد سعید معروف بہ نواب سعادت اللہ خاں گلشن کے سپرد تھے۔ آپ نے "سرا" میں تقریباً سات سال قیام فرمایا۔ اس دوران بعض سیاسی حالات کی بناء پر نواب سعادت اللہ خاں گلشن نے "آرکاٹ" کی صوبہ داری پر قناعت کر لی تھی اور شہر آرکاٹ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ ادھر "سرا" پر مرہٹوں کے پے در پے حملے شروع ہو چکے تھے۔ ان پراگندہ حالات سے تنگ آکر حضرت عبداللطیف قادریؒ نے سرا سے نقلِ مکانی کیا اور بقول حضرت سید شاہ محمد قادری ۱۱۳۲ھ میں شہر آرکاٹ تشریف لائے۔ آرکاٹ (عرف محمد پور) میں آپ کا قیام مکمل چھ سال رہا (۹)۔

آرکاٹ صوبے کا مرکزی شہر ہونے کی بناء پر یہاں ہنگامہ آرائیوں کی کثرت تھی، ہر روز کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آتا تھا۔ حضرت عبداللطیفؒ کی گوشہ گیر طبیعت ان فتنہ سامانیوں سے چھ سال کی مدت میں بے حد اکتا گئی نتیجتاً آپ آرکاٹ سے کوچ کرتے ہوئے ۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۲۵ء میں دارالسرور شہر ویلور پہنچ گئے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ ویلور کو دارالسرور کا لقب ان ہی ایام میں عطا ہوا، سب سے پہلے آپ کے فرزند حضرت قربی ہی نے ویلور کو

دارالسرور کے خطاب سے یاد کیا۔چوں کہ دوسرے شہروں کے مقابلے میں حضرت قربی کو ویلور میں سکون و سرور حاصل ہوا تھا اس لئے آپ نے اس طرح اظہار خیال فرمایا:

دارالسرور ویلور شہروں میں بادشہ ہے
ارکاٹ اور چنجی اس دار کا گدا ہے

حضرت قربی سے پیشتر کہیں اس طرح کا استعمال دیکھا نہیں گیا۔ دارالسرور کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد فضل اللہ رقم طراز ہیں "اس خوں چکاں دور کے ابتدائی زمانے میں حضرت قربی آرکاٹ تشریف لائے اور یہاں کے ناخوش گوار حالات کا اندازہ کرتے ہوئے ویلور نقلِ مقام کیا جہاں انھیں قدرے اطمینان حاصل ہوا۔ بنا بریں کسی زمانے میں ویلور کو دارالسرور ویلور کہا جاتا تھا" (۱۰)۔

بہ ہر حال شاہ عبداللطیف بیجاپوری کو ویلور میں بے حد سکون حاصل ہوا۔ آپ نے باقی زندگی یہیں خدمتِ خلق اور اشاعتِ اسلام میں گزار کر بالاآخر ۱۰/شعبان ۱۱۵۰ھ کو اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔آپ کا مزار جامع مسجد (ویلور) کے صحن میں مرکزِ عقیدت بنا ہوا آج بھی موجود ہے۔ حضرت عبداللطیفؒ کے قیام بیجاپور سے ویلور پہنچنے کی درمیانی مدت کے تعلق سے آپ کے تذکرہ نگاروں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔چناں چہ حضرت مولانا عبدالحئ احقر بنگلوری (متوفی ۱۳۰۰ھ) خلیفۂ حضرت قطب ویلورؒ نے اپنی مثنوی "مطلع النور" میں حضرت قربی ولدِ حضرت عبداللطیف قادریؒ کے حالاتِ زندگی نظم کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

عمر تھی چار سال اس کی جب	ہمرہِ والدین لپنے تب
آیا شانور کی طرف وہ سلیم	وہاں "دوسال" تک ہوا ہے مقیم
پھر وہ دو سال آسرا میں رہا	بعد آرکاٹ کے طرف آیا
اور آرکاٹ میں رہا "چھے سال"	پھر وہاں سے نکل وہ ذوالاجلال
لایا تشریف جانبِ ویلور	ہوا ویلور اس سے مطلعِ نور (۱۱)

ان ابیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت قربی کے والد "شاہ عبداللطیف" نے شہر بیجاپور سے ۱۱۲۲ھ میں کوچ کیا، پھر دو سال شاہ نور میں، دو سال سرا میں اور چھ سال آرکاٹ میں گزار کر ۱۱۳۲ھ میں ویلور پہنچے۔ حضرت شاہ عبدالحی احقر کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے "خانوادۂ اقطاب ویلور قدس اللہ اسرار ھم" کے مؤلف نے رقم کیا کہ "اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ سید شاہ عبداللطیف نقوی القادری رضی اللہ عنہ ترکِ وطن فرما کر مع اہل و عیال شاہ نور تشریف لائے، دو سال آپ کا یہاں قیام رہا۔ شاہ نور سے "سرا" آرہے، یہاں دو سال رہنے کے بعد "ارکاٹ" چلے آئے۔ یہاں چھ سال گزارنے کے بعد حسبِ ارشاد جدِ امجد ۱۱۳۲ھ میں آرکاٹ سے ویلور آئے اور یہیں کہ ہورہے" (ص ۱۲) آپ کے ایک اور تذکرہ نگار مولوی محمد طیب الدین اشرفی مونگیری نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے "چناں چہ ۱۱۲۱ھ میں کہ حضرت قربی تقریباً چار سال کے تھے مع اہل و عیال بیجاپور سے روانہ ہو کر شاہ نور تشریف لائے پھر دو سال بعد وہاں سے منتقل ہو کر شہر میسور کے قریب ایک مقام سرا میں قیام فرمایا اور تقریباً دس یا بارہ سال تک رہے پھر جب یہاں کے حالات میں تبدیلی ہونے لگی تو وہاں سے چل کر آرکاٹ نزول فرمایا۔۔۔ پھر چھ سال بعد ۱۱۳۸ھ میں ویلور کو منتقل ہوگئے" (۱۳)۔

درج بالا عبارت سے یہ بات منتج ہوتی ہے کہ آپ بیجاپور سے ۱۱۲۱ھ میں نکل کر ۱۸ یا ۲۰ سال کے بعد ویلور پہنچے ہوں تو سال ورود ۱۱۳۹ھ یا ۱۱۴۱ھ ہونا چاہیے نہ کہ گیارہ سو اڑتیس ہجری (۱۱۳۸ھ) جیسا کہ اوپر مذکور ہے۔

پروفیسر سید فضل اللہ رقم طراز ہیں کہ ملک کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات اور اس کے ساتھ بڑھتی ہوئی بدامنی کے باعث قربی کے والد (شاہ عبداللطیف قادریؒ) نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ بیجاپور سے ہجرت کی، اس وقت قربی کی عمر چار سال کی تھی۔ وہ شاہ نور میں دو سال ٹھہرے، وہاں بھی چین نصیب نہ ہوا تو سرا پہنچے اور یہاں بارہ سال ٹھہرے۔ مرہٹوں کی شورش کی وجہ سے آرکاٹ کا رخ کیا یہاں چار یا پانچ

برس قیام فرمایا پھر دارالسرور ویلور آئے اور اس کو اپنا مسکن بنالیا (۱۴) فاضل مصنف کے بیان سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ شاہ عبداللطیف ۱۱۴۰ھ یا ۱۱۴۱ ھ میں ویلور پہنچے تھے۔ایک اور مصنف افضل العلماء محمد یوسف کوکن ایم۔اے۔ ایم۔لٹ نے اپنی تصنیف عربک اینڈ پرشین این کرناٹک (Adrbic and Perrian in Carnatic) میں جو کچھ زیب قرطاس فرمایا وہ اس طرح ہے

" After devastation of Bijapur of Syed Lateef first migrated with his family in 1121 A.H. to Shahnar, twenty miles south of Hubi. After two years of his stay there, he got shifted to Sira in Mysore. In 1138 he came down to Arcot and finally settled down at Vellore." (16)

اس عبارت سے شاہ صاحب کے وارد آرکاٹ ہونے کا اظہار تو ہوتا ہے مگر نازل ویلور ہونے کا سال واضح نہیں ہے۔

بہ ہر حال ان تاریخی اختلافات اور بوقلموں عبارتوں سے اصح قول کی دریافت کارے وارد ہے۔راقم کی رائے میں مذکورہ بالا تمام ماخذوں میں قدیم ترین ماخذ اور اولین تذکرہ حضرت مولانا باقرآگاہ ویلوریؒ شاگرد خاص حضرت قربی ویلوریؒ کی تصنیف تحفتہ الاحسن فی مناقب السید ابی الحسن القربی" ہے جس کے حوالے سے حضرت قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) کے ہم شیرزادے اور خلیفۂ خاص سید شاہ محمد قادری ویلوری نے اپنے مرشد کے حین حیات ۱۲۸۳ھ میں ضمیمۂ جواہر السلوک میں حضرت قربی کے خاندانی احوال نقل کیے تھے۔راقم نے اسی پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا مدعا مندرجۂ بالا عبارتوں میں پیش کیا ہے۔

الغرض جب حضرت شاہ عبداللطیف بیجاپوری ۱۱۳۸ھ میں دارالسرور ویلور پہونچے تو قلعے کے شمالی حصہ کے روبرو واقع میدان میں فروکش ہوئے۔آپ اسی رات خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔حضورؐ فرمارہے تھے کہ " اے نور عین اسی جگہ قیام کرو دیکھو یہاں مسجد، یہاں مدرسہ

اور یہاں خانقاہ تعمیر ہو گئی، تمہاری اولادِ امجاد سے ہمیشہ اہلِ عالم کو فیض پہونچے گا اور اس جگہ اسلام کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوگا" (۱۷) ۔آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت و پیشن گوئی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آخر کار اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے ۔آپ کے گنبد پر جو قطعہ ٔ تاریخ مرقوم ہے اس سے آپ کا سالِ رحلت ۱۱۵۰ھ برآمد ہوتا ہے ۔حالاں کہ بقولِ مصنفِ ضمیمہ ٔ جواہر السلوک آپ کی تاریخِ وصال ۱۰/ شعبان ۱۱۴۹ ہجری ہے ۔ گنبد پر موجود کتبہ کے اشعار درج ذیل ہیں:

قبلہ و کعبہ جدمن سید　　　شاہ عبداللطیف عرش پناہ
کرد رحلت بگفت رکن الدین　　　سالِ ترحیل غاب قطب الہ
۱۱۵۰ھ

یہ تاریخی قطعہ شمس العلماء حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری ویلوری (متوفی ۱۳۲۵ھ) فرزندِ ارجمند حضرت قطبِ ویلور قدس سرہ، (متوفی ۱۲۸۹ھ) کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے ۔اس قطعہ کے چوتھے مصرع کے عربی الفاظ "غاب قطب الہ" سے سالِ رحلت ۱۱۵۰ھ کا استخراج ہوا ہے ۔شاہ عبداللطیف قادریؒ کے گنبد کی پیشانی پر قبلہ رخ موجود کتبہ میں ۱۱۵۰ھ کی صراحت اعداد میں کر دی گئی ہے ۔معاملہ اس قدر صاف ہونے کے باوجود خدا جانے کس لیے حضرت مولانا سید محمد قادری خواہرزادۂ حضرت قطب ویلور قدس سرہ نے سالِ ارتحال ۱۱۴۹ھ تحریر فرمایا ہے ۔غالباً آپ ہی کی تقلید کرتے ہوئے "خانوادۂ اقطاب ویلور" کے تمام تذکرہ نگار جیسے مولانا ادیب خاور مولانا طیب الدین اشرفی ، مولانا بشیر الحق قریشی ، پروفیسر سید فضل اللہ اور افضل العلماء یوسف کوکن عمری اپنی تحریروں میں مغالطے سے دوچار ہوئے ہیں ۔

حضرت شاہ عبداللطیف قادری نقویؒ کے بعد آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوری نے قلعہ ٔ ویلور کی شمالی سمت کے روبرو واقع وسیع و عریض میدان میں جہاں اس قافلہ ٔ اہلِ دل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اپنا رختِ سفر کھولا تھا اور جہاں پر آپ کے والدِ ماجد نے تلقین و ارشاد اور تبلیغ و اشاعت کی داغ بیل ڈالی تھی ۔۱۱۷۹ھ مطابق ۱۷۶۶ء میں ایک عظیم خانقاہ

تعمیر فرمائی ۔اس مبارک موقعہ پر حضرت قربی کے نورِ نظر حضرت ذوقی اور آپ کے شاگرد ارشد حضرت باقر آگاہ نے تاریخی اشعار کہے ۔حضرت ذوقی نے جو تاریخی قطعہ کہا اس کے آخری مصرعہ سے ۱۱۷۸ء کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ۔شعر اس طرح ہے:

بجستم زدل سالِ تاریخ آں را
بگفتا زہے خانقاہِ مشین

۱۱۷۹ھ

علامہ باقر آگاہ نے اس ضمن میں ایک خوبصورت تاریخی رباعی کہی تھی جس کے چوتھے مصرعے سے سال بنا کا استخراج ہوتا ہے ۔مولانا یوسف کوکن نے اپنی کتاب "قربی" میں صفحہ ۲۵ پر اور مولوی بشیر الحق نے اپنے مقالہ "تذکرۂ اقطاب ویلور" میں رباعی اس طرح نقل کی ہے۔ رباعی:

اے خانقہِ نو کہ دہد شرحِ صدور
دل تازہ کند برنگ کعبہ زسرور
گفتند ملک بہ چرخ کایں قبۂ نور
والطور وسینین لبیت المعمور (۱۸)

مذکورہ بالا رباعی کے چوتھے مصرعے سے نہ تو خانقاہ کا سالِ بنا برآمد ہوتا ہے اور نہ اس مصرعے کی تقطیع رباعی کے چوبیس اوزان میں کسی بھی وزن میں کی جا سکتی ہے ۔لہذا راقم کی رائے میں اس مصرعے کو غالباً اس طرح ہونا چاہیے ۔

"واطورِ سینین والبیت المعمور" یہاں "و" بمعنی یا (حرف ندا) ہے اور "طور" کی

۱۱۷۹ھ

راء میں عملِ اشباع (یعنی حرکت کو دراز کر کے حرفِ علت بنا دینا) کریں تو یہ مصرع رباعی کے مقررہ اوزان میں سے "مفعولن مفعولن مفعولن فاع" کے وزن پر ٹھیک بیٹھے گا۔

یہی وہ مبارک خانقاہ ہے جو "حضرت مکان" کے نام سے آج بھی مرجعِ خاص و

عام ہے۔ حضرت قربی نے اس خانقاہ کا ایک حصہ درس و تدریس کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، جیسا کہ مؤلف انوار اقطاب ویلور نے تحریر کیا "آپ (حضرت قربی) نے قلعہ ویلور کے شمالی حصہ میں جواب "حضرت مکان" کے نام سے مشہور زمانہ ہے، ایک خانقاہ تعمیر فرمائی جس کا ایک حصہ "دار التدریس" کر دیا گیا (۱۹) مؤلف "تذکرۂ اقطابِ ویلور" نے لکھا ہے کہ "یہ خانقاہ محض صوفیانہ سلوک کی تربیت گاہ نہ تھی بلکہ اس عہد کے مزاج اور ماحول کی مناسبت سے قرآن و حدیث کی درسگاہ، علوم و فنون کا دار العلوم، مصالح عوام اور فقہی مسائل کے لیے دار الافتاء، دعوت و تبلیغ کے لیے افراد سازی کا قلعہ اور شعر و سخن کی بزم تھی۔" (۲۰) مذکورہ بالا بیانات کی تصدیق حضرت آگاہ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جس کو حضرت قربی کا اولین تذکرہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ اپنے استاذ و شیخ حضرت قربی کی توصیف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "واکثر مردماں تدرس نسخ متداولہ فارسیہ از حضرت یشاں خط کامل و نفع شامل گرفتہ اند" (۲۱)۔

ان شواہد سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ویلور کے اس اولین مدرسہ کی خشت اول باقاعدہ ۱۱۷۹ھ میں اسی وقت رکھی گئی تھی جبکہ وہاں خانقاہ کی مستقل عمارت تعمیر کی گئی۔ حالانکہ درس و تدریس کا مشغلہ انفرادی طور پر بہت پہلے سے جاری تھا، جیسا کہ مولانا یوسف کوکن مرحوم نے اپنی تالیف "باقر آگاہ" میں رقم کیا ہے "ویلور میں آگاہ کی تعلیم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ان کو کسی وجہ" سے نتھڑ نگر (نطہر نگر) یعنی تروچلاپلی چلا جانا پڑا۔

دو سال بعد یعنی ۱۱۷۷ھ میں باقر آگاہ نتھڑ نگر سے ویلور چلے آئے اور اس مرتبہ قربی سے نہ صرف تعلیم و تعلم اور مشقِ سخن کا سلسلہ جاری تھا بلکہ ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی اور ان کے مرید ہو گئے" (۲۲)۔

گو کہ اس خانقاہی مدرسہ کا ابتداء میں کوئی مخصوص نام نہیں تھا مگر زاید از ایک صدی بعد جبکہ خانقاہ کی عمارت سے کچھ فاصلہ پر ایک عظیم الشان مستقل

عمارت کا سنگ بنیاد ۵ / جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۳ / مارچ ۱۸۸۵ء کو اسی خانوادے کے چشم وچراغ فرزند وجانشین حضرت قطب ویلور شمس العلماء حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری ویلوری (۱۲۶۹۔۱۳۳۵) کے ہاتھوں رکھا گیا۔ اس وقت اس درس گاہ کو مدرسہء لطیفیہ کے مبارک نام سے موسوم کیا گیا۔ چوں کہ ویلور کے اس اولین مدرسہ کی تشکیل جدید ۱۳۰۲ھ میں ہوئی تھی۔ اسی لیے بعض اہل علم اس دار العلوم کے قیام کی تاریخ رقم کرتے ہوئے غلط فہمی کا شکار ہوگئے۔ چناں چہ مولانا یوسف کوکن عمری اپنی اپنی معرکہ آراء تصنیف عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک میں تحریر فرماتے ہیں:

" Darul uloom Lateefia ... was started at Vellore by Syed Shah Ruknuddin Muhammad (1269 - 1328 A.H.), son of Syed Shah Abdul Lateef Saheb (who died at Madina in 1289 A.H.). On 5th Jamadius Sani 1302 A.H. = 23rd March 1885 A.D. If was name by him " Darul uloom Lateefia دار العلوم لطیفیہ after the name of his father Syed Shah Abdul Lateef of Vellore. " (23)

تذکرۂ اقطاب ویلور کے فاضل مؤلف مولانا بشیر الحق قریشی ادھونی نے بھی اس مغالطے کا تدارک کیا ہے (۲۴)۔

مذکورۂ بالا حقائق سے ظاہر ہوتا ہے " دار العلوم لطیفیہ " کی ابتدائی شکل در حقیقت بارہویں صدی کے تقریباً نصف اول میں منصہء شہود میں آگئی تھی۔ اس امر کی تصدیق خود حضرت مولانا رکن الدین کی اس تقریر سے ہوتی ہے جو دار العلوم لطیفیہ کے اولین جلسہء دستار بندی منعقدہ ۱۹ / ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۶ / ۱۸۹۴ء بروز جمعہ کے مبارک موقع پر تقریباً دس ہزار سامعین کی موجودگی میں کی تھی اس طویل و موثر خطاب کے درج ذیل اقتباس سے اس بات کا اندازہ بھی ہوجاتا ہے کہ دار العلوم کی شروعات کے وقت صوبہء کرناٹک بالخصوص شہر ویلور کے دینی و مذہبی حالات کیسے تھے۔ چناں چہ حضرت رکن الدین فرماتے ہیں " اب میں اس مکان تقدس

نشان (خانقاہ لطیفیہ) کی کیفیت بیان کرتا ہوں کہ یہ مکان بارہ سو ہجری کے اوائل میں بنا ہوا اس کے بانی اس صدی کے مجدد (حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی رضی اللہ عنہ) ہیں جو حضرت قطب ویلور کے پردادا ہوتے ہیں یہ وہ بزرگ ہیں کہ نواب والا جاہ سالانہ بارہ ہزار روپے کا پروانہ نذر پیش کیۓ تو اس کو نوالہء چراغ بنائے اور یہ مقدس ذات ہے کہ اس ملک کرناٹک سے الحاد و زندقہ کی جڑ اکھیڑ کے خالص توحید قائم کیۓ اور عملاً واعتقاداً شرک و بدعت کی بیخ کنی کر کے سنت مطہرہ کو جاری فرمائے اور حضرت شاہ محی الدین ذوقی لطائف لطیفی میں اپنے پدر بزرگوار کے حالات میں لکھتے ہیں کہ حضرت کا وجود باجود اگر اس ملک (کرناٹک) میں نہ ہوتا تو یہاں کے اکثر لوگ بدعتی ہوتے یا ملحد اور حضرت کی ذات بابرکات سے علم اس قدر پھیلا کہ کوئی جائے ایسی نہیں جس میں حضرت کے شاگرد نہوں یا شاگرد کے شاگرد" (۲۵)۔

حاصل کلام تاریخی حقائق کی روشنی میں دار العلوم لطیفیہ کی تاریخ بنا مختلف ادوار میں پھیلی ہوئی ہے۔ حضرت سید شاہ عبداللطیف نقوی بیجاپوری ۱۱۳۸ھ میں جب ویلور تشریف لائے تو بحکم سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم وہیں قیام فرماتے ہوئے رشد وہدایت اور تعلیم و تعلم کی شروعات کر دیں۔ آپ کے بعد آپ کے لائق و فائق فرزند حضرت قربی (۱۱۱۸-۱۱۸۳ھ) نے اسی تعلیمی و اصلاحی سلسلہ کو آگے بڑھایا، چناں چہ آپ نے ۱۱۷۹ھ میں ایک خانقاہ تعمیر فرمائی جہاں ایک طرف تزکیہء نفس کا مشغلہ جاری تھا تو دوسری طرف درس وتدریس کا کام سرانجام پارہا تھا۔ پھر آپ کے اس مشن کو آپ کے قابل فخر فرزند حضرت ذوقی (۱۱۵۱ھ-۱۱۹۴ھ) نے اپنے سینے سے لگایا اور مزید آگے بڑھایا، بعد ازاں حضرت ذوقی کے نور نظر حضرت محوی (۱۱۸۶-۱۲۴۳ھ) نہ صرف خانقاہ کی توسیع کی بلکہ ایک خوبصورت مسجد اور عالی شان مدرسہ بنوایا، اس واقعہ کو مثنوی مطلع النور کے بزرگ شاعر نے اس شعر میں نظم کیا ہے:

مسجد و خانقاہ رباط کلاں
مدرسہ وہ بنایا عالی شاں (۲۶)

حضرت محوی کی رحلت کے بعد آپ کے صاحب کمال و عدیم المثال صاحب زادے حضرت محی الدین سید شاہ عبداللطیف نقوی معروف بہ قطب ویلور (۱۲۰۷-۱۲۸۹ھ) نے اپنے آباء و اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تعلیم و تعلم اور تبلیغ و تزکیہ کے دونوں شعبوں کو فروغ بخشا اور اس شمع ہدیت کی لو کو مزید تیز کر دیا جیسا کہ آپ کے خلیفہ شہر حضرت سید عبدالغفار بخاری قادری مسکین مدراسی (۱۲۵۱-۱۳۲۶ھ) حضرت قطب ویلور کے یومیہ مشاغل پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "نماز صبح کے بعد ذکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے اور اشراق پڑھ کر مسجد کے باہر نکلتے تھے اور مدرسہ و خانقاہ میں تشریف فرما کر مسافروں کے کھانے پینے کا انتظام فرمایا کرتے تھے پھر مکان میں داخل ہوتے اور مسافروں کے آرام، مریدوں کی آسائش اور طلباء کے خورد و نوش کا سامان مہیا فرما کر مدرسہ میں آتے اور تفسیر و حدیث کا درس بارہ بجے تک دیا کرتے تھے، دوپہر کے کھانے کے بعد تصنیف و تالیف اور مطالعہ میں مشغول رہتے۔ اگر فتاویٰ ہوتے تو ان کے جواب تحریر فرماتے اور ظہر کے بعد مریدوں اور مسترشدوں کی تعلیم و تفہیم میں مصروف رہا کرتے اور ہفتہ میں دو مرتبہ مدرسہ کے اندر وعظ فرمایا کرتے تھے" (۲۷)۔ حضرت قطب ویلور کے بعد آپ کے خلف الرشید شمس العلماء حضرت سید شاہ رکن الدین قادری ویلوری (۱۲۶۹-۱۳۲۵ھ) نے زمانہ کی تبدیلیوں اور حالات کے تقاضوں کے مدِ نظر اس خانقاہی مدرسہ کی تشکیل جدید کی۔ آپ نے نہ صرف وسیع و عریض دارالتدریس و دارالاقامہ از سر نو تعمیر فرمایا بلکہ ایک حسین و جمیل مسجد بھی بنوائی۔ دارالعلوم لطیفیہ کی نشاۃ ثانیہ کے محرکات روحانی بھی تھے، مادی بھی باطنی و وجدانی عوامل کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے مولانا ادیب خاور رائے چوٹی رقم طراز ہیں۔ "آپ (حضرت رکن الدّین) ایک رات مراقبہ میں بیٹھے ہوئے تھے کسی بزرگ ہستی کی گرج دار آواز سنائی دی، آپ چونک پڑے اور اس آواز کی طرف ہمہ تن گوش ہوگئے، بزرگ فرما رہے تھے۔ اے میرے محترم فرزند! تم اپنے آباء و اجداد کی روشن کردہ شمع علم کی لو اور تیز کر دو یعنی ایک علمی مرکز قائم کرو۔

اس بشارت کے چند دن بعد آپ اپنے جد امجد کی تعمیر کردہ مسجد کے پہلو میں ایک پختہ عمارت کی بنیاد ڈالی اور اس مرکز کا نام "دار العلوم لطیفیہ" رکھا" (۲۸)۔

قیام دار العلوم کے مادی و ظاہری اسباب و علل پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے مولانا محمد طیب الدین اشرفی مون گیری لکھتے ہیں "چناں چہ اس وقت میں جب کہ مغربی تہذیب کا اثر ہندوستان کے لوگوں پر حد سے زیادہ پڑا اور فرنگیوں کی غلامی سے مجبور ہو کر ان کے اشاروں پر رقص کرتے نظر آنے لگے تو مختلف جگہوں میں مسلمانوں نے مذہبی اداروں کی بنیاد ڈالی اور اسی طوفانی حالات میں بلائے ناگہانی کا مقابلہ کرنے تیار ہوگئے۔ اس سیلاب کا بارگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گدائے غیور کی جہاں بین نگاہیں جائزہ لے رہی تھیں وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے سینکڑوں برس پہلے اپنے آبا و اجداد کے قائم کردہ اس ادارہ کو جس کی گود میں حضرت ذوقیؒ، و باقر آگاہؒ و مولانا عبد الحیؒ، و مولانا محمد حنیف قدس سرہم وغیرہ جیسی شخصیات عظمیٰ نے تربیت پا کر ایک عالم کو زندگی عطا کی، تشکیلِ نو بخشی اور ایک بلند و ٹھوس و حسین عمارت کی بنا ڈال کر تیار فرمائی (جو دار العلوم لطیفیہ کے نام سے مشہور زمانہ ہے" (۲۹)۔

"دار العلوم لطیفیہ" اپنے قیام کے ابتدائی سال سے تاحال تقریباً تین صدیوں سے دینی و علمی خدمات میں ہمہ وقت مصروف ہے۔ یہاں تشنہ گانِ علم کے قافلے دور دراز علاقوں سے وارد ہوتے اور خوب سیراب علم ہو کر اپنے اپنے منازل کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے فیض یافتہ لوگوں میں علماء و صلحاء، شعراء و ادباء کی تعداد بھی خاطر خواہ ہے، جن سے علوم عربیہ و فارسیہ بالخصوص زبانِ اردو کو خوب فروغ حاصل ہوا ہے۔ علاقہ۔ کرناٹک یعنی صوبہ۔ دکن میں اردو کی نشو و نما اور اس کی ترقی و ترویج میں اس دانش گاہ نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کی خدمات بے حد نمایاں رہی ہیں۔ جس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات پر آئے گا۔

حواشی

(۱) "بہار اعظم جاہی" ص ۱۸۴ - از مولوی غلام عبدالقادر ناظر - مطبوعہ ۱۹۶۱ء مدراس - مطبع مدینہ الکٹرک لیتھو پریس، مدراس

(۲) "جنوبی ہند کی تاریخ" ص ۲۵۲ اور ص ۲۶۳ - از نیل کنٹھ شاستری - مطبوعہ سہ..... ترقی اردو بیوری دہلی

(۳) "بہار اعظم جاہی" ص ۱۸۶

(۴) "حافظ سید محمد فراقی ویلوری" از ڈاکٹر محمد علی اثر مشتملہ سالنامہ "نفیر" ویلور ۱۹۹۲ء ص ۳۰ تا ص ۳۳

(۵) "دکن میں اردو" ص ۵۷۳ - از نصیرالدین ہاشمی مطبوعہ ۱۹۶۳ء - نسیم بک ڈپو لکھنو -

(۶) "ضمیمہ جواہر السلوک" ص ۲۶۰ - از حضرت سید شاہ محمد قادری خلیفہ، خواہرزادۂ حضرت قطب ویلوری مطبوعہ ۱۲۸۳ھ مظہر العجائب مدراس

(۷) "انوار اقطاب ویلور" ص ۸ - از مولانا محمد طیب الدین اشرفی مونگیری، مطبوعہ ۱۹۶۳ء حضرت مکان، ویلور

(۸) دیوان قربی ص ۵ مرتبہ - پروفیسر سید محمد فضل اللہ، مطبوعہ ۱۹۶۴ء اعجاز پریس حیدر آباد دکن

(۹) ضمیمہ۔ جواہر السلوک ص ۲۶۳

(۱۰) دیوانی قربی ص ۸

(۱۱) مثنوی مطلع النور ص ۶ از شاہ عبدالحیٔ - احقر بنگلوری مطبوعہ ۱۲۹۰ھ مطبع محمدیہ بنگلور

(۱۲) خانوادہ اقطاب ویلور ص ۴ از مولانا مولوی حافظ محمد زکریا ادیب خاور رائے چوٹی - مطبوعہ ۱۹۵۸ء بنگلور

(۱۳) انوار اقطاب ویلور ص ۱۳

(۱۴) مجموعہ۔ رسائل قربی ص ۵ از مولانا مولوی محمد طیب الدین اشرفی مونگیری مطبوعہ ۱۹۶۶ء بنگلور

(۱۵) دیوان قربی ص ۶

(۱۶) Arabic and persian in Carnatic ص ۱۱۷ از مولوی یوسف کوکن عمری مطبوعہ ۱۹۷۴ء مدراس

(۱۷) انوار اقطاب ویلور ص ۱۳

(۱۸) تذکرۂ اقطاب ویلور ص ۳۳ از مولانا بشیرالحق قریشی لطیفی مشمولہ اللطیف ویلور شمارہ ۲۵ - خاص غیر مطبوعہ ۱۴۰۴ھ

(۱۹) انوار اقتاب ویلور ص ۲۱

(۲۰) تذکرۂ اقطاب ویلور ص ۳۳
(۲۱) تحفۂ احسن بہ حوالہ۔ اللطیف ص ۳۳ مطبوعہ ۱۴۰۴ھ از دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور
(۲۲) "باقر آگاہ" ص ۵ مؤلفہ مولانا یوسف کوکن عمری مطبوعہ مدراس
(۲۳) عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۵۳۲
(۲۴) سالنامہ اللطیف ۱۴۰۴ھ ص ۱۰۸
(۲۵) روئداد جلسہ۔ دستاربندی دار العلوم لطیفیہ ویلور مطبوعہ ۱۳۱۱ھ ص ۳۲
(۲۶) مثنوی مطلع النور ص ۱۷ از حضرت مولانا عبد الحیؒ احقر واعظ بنگلوری مطبوعہ ۱۲۹۰ھ در مطبع محمدیہ بنگلور
(۲۷) حیات المسلمین بہ حوالہ۔ سال نامہ اللطیف ۱۴۰۴ھ ص ۸۱
(۲۸) خانوادۂ اقطاب ویلور قدس اللہ سرارہم ص ۱۷
(۲۹) انوار اقطاب ویلورؒ ص ۱۱۴-۱۱۵

پس منظر

ادب کی تاریخ سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتی ہے۔ اسی لیے زبان و ادب کی نشو و نما میں مذکورہ عوامل کا بالخصوص سیاسی محرکات کا وافر حصہ ہوتا ہے۔ چناں چہ اردوئے قدیم یعنی دکنی کے پھولنے پھلنے میں بھی یہی عوامل کار فرما رہے ہیں۔

ہم جب آج دکن کہتے ہیں تو حیدر آباد اور اس کے اطراف و اکناف کا ایک محدود علاقہ ہی ہمارے پیش نظر رہتا ہے۔ حالاں کہ انگریزوں سے پہلے تک دکن کا اطلاق ڈاکٹر غلام یزدانی کی صراحت کے مطابق پونہ، اورنگ آباد سے لے کر کنیا کماری کے نواح میں موجود قصبہ۔ محمد پور تک کے وسیع و عریض علاقے پر ہوتا رہا ہے (۱)۔

سلطان علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کے نامور سپہ سالار ملک کافور کے اولین حملہ۔ جنوبی ہند ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء کے بعد شمالی ہند کے فوجی، صوفی عالم، تاجر اور فقیروں نے دکن کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ اپنے ساتھ ایک ایسی زبان لے آئے جو ہنوز تشکیل و تربیت کے مراحل میں تھی۔ خلجیوں کے زوال کے بعد جب سلطان و محمد بن تغلق کا دور (۱۳۲۵ء-۱۳۵۱ء) آیا تو اس نے اپنا پایہ۔ تخت دہلی کی بجائے دولت آباد کو بنانے کا تہیہ کر لیا اور ۷۲۸ھ / ۱۳۲۷ء میں دہلی اور دہلی سے چار چار کوس کے اندر واقع تمام آبادی کو دولت آباد منتقل ہونے کا شاہی حکم مل گیا۔ پیر، فقیر، امیر، غریب، مرد، عورت، بوڑھے، جوان اور بچے غرض تمام کے تمام ہجرت کرنے پر مجبور کیے گئے۔ یہی وہ اہم ترین واقعہ تھا جس کی وجہ سے اردو کو دکن میں نشو و نما کے مواقع

فراہم ہوئے۔ محمد بن تغلق کے دورِ آخر میں دکن کے جن امیران صدہ نے بغاوت کی تھی ان میں حسن گنگووہ تھا جو ۴۸ء۱۳۴۷ء میں علاؤ الدین شاہ بہمنی کے نام سے دکن کا بادشاہ بن گیا اور گلبرگہ اس کا دار السلطنت قرار پایا چوں کہ بہمنی سلطنت مرکز سے بغاوت کے بعد وجود میں آئی تھی اس لیے نفسیاتی طور پر اس کے سلاطین شمالی ہند کے رسم و رواج تہذیب و تمدن یہاں تک کہ زبان کے بھی مخالف ہوگئے۔ اسی لیے انھوں نے سلطنت کی سرکاری زبان فارسی کے بجائے دکنی کو منتخب کیا۔ بہمنی خاندان تقریباً دو سو سال برسر اقتدار رہا اور ۹۳۳ھ میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس عرصہ میں دکنی زبان ترقی کرتی رہی، بہمنی دور کے بعد سیاسی افراتفری کی بناء پر عادل شاہی (۱۴۹۰-۱۶۸۶ء) اور قطب شاہی (۱۵۰۸-۱۶۸۷ء) ادوار کا آغاز ہوا تو دکنی زبان کی اہمیت و وسعت میں اضافہ ہوا، اس کو مکمل طور پر شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں شمال سے جنوب تک بولی جانے والی یہ زبان مقامی اثرات اور دکن کی تہذیب و تمدن سے اس قدر متاثر ہوئی کہ تقریباً چار صدیوں تک اپنے مولد و مرکز سے دور رہنے کے بعد جب دلی پہنچی تو اس کو اپنے ہی وطن یعنی شمال میں اجنبیت اور بیگانگی کا سامنا کرنا پڑا۔ دکن کی سلطنتیں تقریباً چار صدیوں تک خود مختار رہیں اور پھر ۱۶۸۷ء میں عظیم مغل سلطنت میں ضم ہوگئیں۔ اس دوران شمال میں رائج اردو زبان دہلی کے سیاسی انقلابات اور ثقافتی اثرات سے برابر متاثر ہوتی رہی اور جنوب میں مستعمل ہونے والی اردو سے اس کا ناطہ ٹوٹ سا گیا تو ایک ہی زبان دو مختلف ناموں سے یاد کی جانے لگی۔ شمال کی زبان کا نام اردوئے معلیٰ اور جنوب کی زبان دکنی کے نام سے مشہور ہوگئی (۲)۔

عالمگیر اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے سبب دکنی زبان کے قدیم مراکز بیجاپور اور گولکنڈہ تاراج ہوگئے اور ان کا شیرازہ بکھر گیا تو سینکڑوں برس سے وہاں بسے ہوئے کاملانِ شریعت و طریقت اور حاملانِ شعر و حکمت کاروان در کاروان رختِ سفر باندھ کر جنوب کے دور دراز علاقوں کی طرف نکل پڑے، جہاں بھی انھوں نے

پڑاؤ ڈالا وہاں ایک علمی ادبی مرکز قائم ہو گیا، جہاں پر انھوں نے شعر و حکمت کی شمعیں روشن کیں وہیں انجمن آراستہ ہو گئی۔

ان ہی نو آباد علمی و ادبی مرکزوں میں دارالسرور ویلور کا نام بھی روشن نظر آتا ہے۔ دکنی کے مشہور محقق و فاضل جناب اکبرالدین صدیقی "ادبیاتِ میسور" کے پیش لفظ میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں "اردو کا ابتدائی گہوارہ دراصل دکن کی سلطنتیں گلبرگہ پھر گولکنڈہ اور بیجاپور ہیں، جب ان حکومتوں میں زوال کے آثار پیدا ہو گئے تو یہاں کے علماء بھی منتشر ہو گئے اور جہاں بھی وہ پہنچے علم کی توسیع و اشاعت میں مصروف رہے چناں چہ ان کی وجہ سے مدراس، چنگل پیٹ، وانم باڑی، ویلور، سرا، ارکاٹ، سدھوٹ، ادھونی، کڑپہ، کرنول، اورنگ آباد، سری رنگ پٹن اور میسور وغیرہ اردو کے مراکز بنے" (۳)۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور بہمنی سلطنت کی علمی و ادبی سرپرستی پر روشنی ڈالتے ہوئے زوالِ سلطنت کے بعد پیدا ہونے والے دوررس نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ "ان یادگاروں میں سب سے اہم اردو زبان اور ادب ہے جو ان ہی کی سرپرستی میں پورے دکن میں یعنی بحیرۂ عرب سے لے کر خلیج بنگال تک رائج ہو گیا اور اس وسیع ملک میں جگہ جگہ اس کے مراکز قائم ہو گیے جن میں گلبرگہ، بیدر، قندھار، گوگی، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، کرنول، کڑپہ، ویلور، مدراس، بودھن، اورنگ آباد وغیرہ تاریخِ ادب اردو میں اب تک یاد کیے جاتے ہیں" (۴)۔ مذکورہ بالا دونوں اقتباسات میں ویلور کا نام موجود ہے، ڈاکٹر زور مرحوم نے غالباً اختصار کا خیال کرتے ہوئے تقدیم و تاخیر کی رعایت اور قدیم وجدید مراکز کا لحاظ کیے بغیر تمام ناموں کو ایک ہی صف میں جگہ دے دی۔

زوالِ بیجاپور و گولکنڈہ کے بعد وجود پذیر ہونے والے مراکز میں اہم ترین علمی مرکز کی حیثیت سے آرکاٹ کا نام نمایاں رہا ہے، اس کی وجہ ایک تو یہ کہ شہر آرکاٹ صوبہء آرکاٹ کا پایہ تخت تھا اور دوسری وجہ یہ کہ نواب سعادت اللہ خاں (متوفی ۱۰۱۷ھ ۔ ۱۷۳۲ء) جیسا علم دوست حکمران برسراقتدار تھا جس کے سبب سے اہلِ علم و

اصحابِ کمال کثیر تعداد میں وہاں جمع ہوگیے تھے۔ یہی حال شہر مدراس کا بھی تھا کہ وہ آرکاٹ کے بعد کرناٹک کا دار الخلافہ قرار پایا جہاں نواب محمد علی والا جاہ (۱۷۴۹ء۔ ۱۷۹۵ء) کی جامع شخصیت اصحابِ فضل و کمال کے لیے مقناطیس بنی ہوئی تھی، باوجود ان تمام باتوں کے چند صاحب بصیرت، اہلِ دِل عارفوں نے محسوس کیا کہ شاہی سرپرستی میں پروان چڑھنے والی کسی بھی علمی تحریک کو دوام و ثبات حاصل نہیں ہوگا بلکہ زوالِ سلطنت کے ساتھ ساتھ وہ بھی تنزل کا شکار ہوجائے گی، یہاں تک کہ مسلمانوں کا شان دار اور روشن ماضی کا ایک حصہ بن کر رہ جائے گی۔ یہ اللہ والے بوریا نشین اس قدر محتاط و متوکل تھے کہ کسی امیر و وزیر کی طرف سے تعاون کی پیش کش کو بھی صاف ٹھکرا دیتے تھے۔ مشتبہ مال سے ان نفوس قدسیہ نے ہمیشہ اپنا دامن بچایا، اسی لیے ان کی خانقاہوں اور مدارس میں ایسی برکت ہوئی کہ ان کے کارنامے صدیوں پر محیط ہوگئے۔ ان ہی خانقاہوں، مدرسوں میں عربی و فارسی کی ترقی کے ساتھ اردو کی بھی ترویج و اشاعت ہوتی رہی۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے: "دکن میں اردو ادب خانقاہوں میں پرورش پاتا رہا جیسا کہ گجرات میں ہوتا رہا، دکن میں تاج داروں کی توجہ خاص کی وجہ سے زبان و ادب خانقاہوں سے نکل کر درباروں اور محلوں میں باریاب ہوگئے" (۵)۔ ڈاکٹر مدنی کی رائے سے کماحقہ، اتفاق مشکل ہے اس لیے کہ ان کا آخر جملہ محلِ نظر ہے۔ دکن کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات آشکار ہوجاتی ہے کہ تاج داروں اور تخت نشینوں کی خصوصی توجہات کے باوجود زبان و ادب خانقاہوں سے برخواست نہیں ہوئے تھے بلکہ امیرزادوں کے محلوں اور فقیروں کے تکیوں میں اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی وسعت کے موافق زبان و ادب کی خدمت ہوتی رہی بلکہ نظام شاہنشاہی اپنی طاقت و توانائی کے باوجود انقلابات کے تیز و تند آندھیوں میں گھر کر اپنا توازن کھو بیٹھا مگر نظامِ فقیری اپنے محدود کار اور بہ ظاہر ضعف و اضمحلال کے باوجود آج بھی کسی نہ کسی حیثیت سے نہ صرف جاری و ساری ہے بلکہ علوم و فنون اور زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں مقدور بھر کوشاں ہے۔

علاقہ، دکن میں اردو زبان کی نشو و نما میں صوفیاء اور ان کی خانقاہوں کا عمل دخل کس قدر رہا ہے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر حسینی شاہد رقم طراز ہیں :

"حضرت بندہ نوازؒ کے بعد اگر کسی کی شخصیت دکن کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی تو وہ صرف حضرت امین (امین الدین علی اعلیٰ متوفی ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء) کی شخصیت ہے۔ صاحب انوار الاخیار نے ان کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔ ان کے خلفاء اور سلسلہ کے بزرگوں کی خانقاہیں موجودہ مہاراشٹرا، آندھرا، کرناٹکا اور ٹمل ناڈو کے دور دراز علاقوں میں قائم تھیں جو شاہ پور کے سرچشمہ، فیض سے وابستہ اور اس کی تعلیمات کی تبلیغ کا مرکز تھیں، ان مرکزوں سے فیض نظر ہی نہیں فیضانِ قلم بھی عام ہو رہا تھا۔

حضرت امین کے خلفاء اور صاحبانِ سجادہ ہی نہیں بلکہ ان کے خانوادے کا ہر ذی علم مرید بھی "دکھنی" میں تصنیف و تالیف کو اپنا فرض منصبی تصور کرتا تھا جس کی وجہ سے اس زبان میں سینکڑوں رسائلِ نظم و نثر لکھے گیے اور یہ زبان رشد و ہدایت ہی کی نہیں شعر و ادب اور علم و حکمت کی زبان اور فکر و فن کے اظہار کا ذریعہ بنتی گئی" (۶)۔

صوفیائے کرام کا مطمح نظر مقصودِ دل اشاعت اسلام اور اصلاحِ عوام تھا اسی لیے انھوں نے عربی اور فارسی سے بہ خوبی واقف ہونے کے باوجود عوام الناس میں اس وقت رائج زبان، دکھنی کو ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ بنایا اور اسی زبان میں تقریری کمال اور تحریری جواہر پیش کیے جس کی وجہ سے یہ سیدھی سادی اور بھولی بھالی کم عمر زبان اس قدر بانکی سجیلی اور چنچل ناری بن گئی کہ دوسری زبانوں کو اس پر رشک آنے لگا۔ صوفیائے کرام نے اس زبان میں اپنے ارشادات و فرمودات کے ذریعہ معارف و حقائق اور رموز و اسرار کے علمی و فنی نکات سے اس کے خالی خالی دامن کو مالا مال کر دیا، یہی وجہ ہے کہ یہ زبان عام بولی سے بڑھ کر بہت جلد ادبی زبان بن گئی۔ صوفیائے کرام کی زبان کے تعلق سے اظہارِ خیال فرماتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ "خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے، اس لیے

تلقین کے لیے انھوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں، چناں چہ جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے ان ہی کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے، یہ بڑا گر تھا اور صوفیا اسے خوب سمجھتے تھے" (۷)۔ اردو زبان کی اہمیت و ہمہ گیری اور اہل اللہ کے ساتھ اس کے رشتے کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں "صوفیائے کرام کے ملفوظات اور شاعری کے نمونے جو ہم نے پیش کیے ہیں ان کے مطالعے سے جہاں زبان کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ یہ صوفیائے کرام براعظم کے مختلف علاقوں میں رشد و ہدایت کی روشنی پھیلا رہے ہیں ۔۔۔۔ ان نمونوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان اس دور میں ضرورت کی زبان بن کر سارے براعظم میں پھیل چکی تھی۔ فارسی تصانیف میں یہ اس لیے جھلکتی اور جھکتی بولتی نظر آتی ہے کہ یہ عام زبان تھی اور اس کے الفاظ اور محاروں کے بغیر اہلِ علم اپنی بات پورے طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے جو بھی ملک گیر تحریک اٹھتی وہ اسی زبان کا سہارا لیتی۔ صوفیائے کرام نے اسی لیے اسے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا" (۸)۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ خداترس درویشوں نے اپنی بصیرت سے جب یہ بھانپ لیا کہ اشاعتِ دین اور خدمت خلق سرکاری مشنری کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس سے فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہونے کا اندیشہ ہے تو انھوں نے اپنی بساط کے مطابق شاہی طمطراق اور درباروں سے دور اپنی اپنی پاک صاف اور سکون بخش جھونپڑیاں آباد کیں جو بعد میں آستانے، مکان اور خانقاہوں کے نام سے مشہور ہوئیں جہاں رشد و ہدایت کی تلقین ہوتی تھی۔ علم و ادب اور شعر و حکمت اسی ٹکسال میں ڈھل کے سکہ رائج الوقت بن جاتے تھے۔

خانوادۂ اقطاب ویلور قدس اللہ اسرارھم کے مورث اعلیٰ حضرت سید شاہ

عبداللطیف بیجاپوری (متوفی ۱۱۵۰ھ) نے اسی جذبہ علم پروری اور احساس خیرخواہی کے تحت سرکاری سرپرستی سے بے نیاز، دارالامارت آرکاٹ کی گھماگھمی سے دور شہر ویلور کے پرفضا ماحول میں ۱۱۳۸ھ میں ایک سرچشمہ علم و عرفان جاری فرمایا جو ہزاروں تشنگان علم و ادب کے لیے سیرابی کا باعث بن گیا، "حضرت مکان" کے معزز لقب سے عوام وخواص میں مشہور آپ کی یہ خانقاہ بیک وقت ذکر و فکر کے لیے عبادت گاہ، علم وحکمت کی درس گاہ اور شعروادب کی جلوہ گاہ تھی، اسی کا فیضان ہے کہ سینکڑوں شعرا ادبا نے اردو زبان و ادب کی آبیاری میں حصہ لیا، یہاں کے خوشہ چین ہر دور میں زبان و ادب کی خدمات میں مصروف رہے ہیں مگر افسوس کہ تاحال ان کے کارنامے ماضی کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہیں اور ان کی خدمات تاریخ ادب اردو کی زینت بننے کی بجائے وقت کے طاق نسیان کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ بہرحال جب ہم ان کی بازیافت اور تحقیق و تفحص کے لیے عزم مصمم کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہیں تو سب سے پہلے اسی سلسلہ ذہب کا جو حلقہ زریں ہمارے ہاتھ لگتا ہے وہ حضرت قربی ویلوری کے نام کا حلقہ ہے جو اس سلسلہ میں سب سے نمایاں اور وسیع تر ہے۔

حضرت قربی ویلوری

آپ کا اسم گرامی ابوالحسن، لقب رکن الدین اور تخلص قربی ہے، آپ کے والد ماجد حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری (م ۱۱۵۰ھ) اور جد امجد حضرت میراں سید ولی اللہ (م ۱۰۹۹ھ) ولد حضرت سید عبداللطیف عرف باپوجیؒ ہیں۔ حضرت باپوجی بیجاپور کے اولیائے کبار میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب انیس (۱۹) واسطوں سے امام حسن عسکریؓ سے ملتا ہے۔ حضرت قربی کی والدۂ ماجدہ کا نام نامی سیدہ ساجدہ بیگم تھا، جو بیجاپور کے متبحر عالم صوفیٔ کامل حضرت سید ابوالقاسم شہید (۹) کی صاحب زادی تھیں، حضرت ابوالقاسم شہید سلطان علی عادل شاہ ثانی (م ۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۲ء) کے وزیر تھے، بعد کو عالم گیر اورنگ زیب (م ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء) نے انہیں منصب پنج ہزاری

تفویض کرتے ہوئے "درایت خاں" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا (۱۰)۔

حضرت قربی کی ولادت ۱۴ / شعبان ۱۱۱۸ھ م ۱۳ / اکتوبر ۱۷۰۶ء کی رات یعنی شب برأت کی مبارک ساعت میں بہ مقام بیجاپور ہوئی۔ چناں چہ مصنف مثنوی مطلع النور نے اس واقعہ کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے:

سن تھا گیارا سے اور اٹھارا جب   اور مبارک تھی وہ برأت کی شب

ہوا پیدا بشہر بیجا پور   کیا دار السرور اس کو غفور (۱۱)

حضرت قربی کے والد نے یہ نذر کی تھی کہ ان کے ہاں اگر لڑکا ہوا تو وہ اپنے فرزند کا نام اپنے مرشد شیخ طریقت اور حقیقی نانا حضرت سید شاہ ابوالحسن مصنف مخزن السلاسل (متوفی ۱۱۳۲ھ) (۱۲) کے نام پر رکھیں گے، چناں چہ جب حضرت قربی تولد ہوئے تو آپ کا نام "ابوالحسن" رکھا گیا (۱۳)۔ اس حقیقت کی روشنی میں مولانا محمد یوسف کوکن عمری مرحوم کا یہ قول کہ آپ کا نام "رکن الدین محمد" تھا صحیح نہیں ہے (۱۴)۔

حضرت قربی کے سال ولادت کے تعین میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کے فرزند حضرت غلام محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقی (۱۱۵۱۔ ۱۱۹۴ھ) کے بہ موجب آپ کی پیدائش کا سال ۱۱۱۶ھ ہے، جیسا کہ آپ نے اپنی کتاب "انشائے عقائد" میں رقم فرمایا ہے: "مولودش در بیجاپور و سن ولادتش بہ تخصیص معلوم نیست، اما بارہا از آں حضرت شنیدہ ام کہ می فرمود کہ من در وقت وفات عالم گیر یک سالہ بودم و وفات اور در سن یک ہزار و یک صد و ہفدہ است بنابریں ولادت او در سن یک ہزار و یک صد و شانزدہ بود" (۱۵)۔ یعنی آپ (حضرت قربی) کی پیدائش شہر بیجاپور میں ہوئی اور آپ کا سن ولادت تعین کے ساتھ معلوم نہیں ہے۔ البتہ بارہا میں نے آپ سے سنا ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ میں عالم گیر اورنگ زیبؒ کے انتقال کے وقت ایک سال کا تھا اور عالم گیر کی وفات ایک ہزار ایک سو سترہ ہجری (۱۱۱۷ھ) میں ہوئی ہے تو اس لحاظ سے آپ کا سن ولادت ایک ہزار ایک سو سولہ (۱۱۱۶ھ) ہجری

قرار پاتا ہے۔

نواب محمد غوث خاں اعظم بہادر (تذکرۂ گلزار اعظم ص ۲۸۵) ، جناب افسر صدیقی (تعلیقات حدیقتہ المرام ص ۹۱) جناب سخاوت مرزا (ماہ نامہ اردو ۱۹۵۴ء، ص ۷) اور ڈاکٹر جمیل جالبی (تاریخ ادب دو جلد دوم حصہ، دوم ص ۱۰۱۰) نے حضرت قربی کا سال ولادت ۱۱۱۷ھ تحریر کیا ہے مگر حضرت شاہ عبدالحی احقر بنگلوری (مثنوی مطلع النور ص ۶) حضرت سید شاہ محمد ویلوری (ضمیمہ جواہر السلوک ص ۲۶۲) مولانا ادیب خاور (خانوادۂ اقطاب ویلور ص ۵) پروفیسر سید فضل اللہ (مقدمہ، دیوان قربی ص ۱) مولانا طیب الدین اشرفی (انوار اقطاب ویلور ص ۱۵) مولانا سید مصطفیٰ حسین بخاری (اللطیف شمارہ ۱۳۸۶ھ ص ۳۱) ڈاکٹر سید احتشام ندوی (اللطیف ۱۳۸۸ھ ص ۱۴۵) مولانا محمد یوسف کوکن عمری (عربک، پرشین ان کرناٹک ص ۱۱۵) ڈاکٹر سید صفی اللہ (متاع رفتگاں ص ۵۱) پروفیسر ڈاکٹر نجم الہدیٰ (تصوف اور کلام قربی ص ۴۱) جناب سید حسیب الدین قادری شرفی حیدرآبادی (حیات رحمت ص ۸۱) اور مولانا حافظ بشیرالحق قریشی لطیفی (صفیر ۱۹۸۱ء، ص ۶۷) وغیرھم نے حضرت قربی کا سال ولادت ۱۱۱۸ھ رقم کیا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں مؤخرالذکر تاریخ ہی صحیح اور قرین قیاس ہے۔ یہ اس لیے کہ حضرت قربی کے استاذ فارسی مولانا محمد حسین بیجاپوری نے آپ کی ولادت کا مادۂ تاریخ "نتیجہ کریم الطرفین" کہا ہے جس سے ۱۱۱۸ء کے اعداد برآمد ہوتے ہیں، چوں کہ آپ کا پدری سلسلہ نسب "حسینی" اور مادری "حسنی" ہے لہذا استاذ نے آپ کے سال ولادت کے لیے مناسب ترین مادۂ تاریخ نکالا تھا، اگرچہ یہ تاریخی مادہ آپ کی پیدائش کے بہت عرصہ بعد کہا گیا تھا تاہم اس طرح کے تاریخی اور بامعنیٰ مادے بہ غرض تحفظ ذہنی اور تسہیل حفظ کی خاطر کہے جاتے ہیں، اس لیے ان کی صحت میں چنداں قیل وقال کی گنجائش نہیں رہتی، اسی لیے اکثر تذکرہ نگاروں نے اسی تاریخی مادہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت قربی کا سن پیدائش ۱۱۱۸ھ بتایا ہے۔ اب رہا "آپ کے فرزند حضرت ذوقی کی رائے کا معاملہ تو اس تعلق سے اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ دراصل

آپ کو عالم گیر کے سال وفات میں مغالطہ ہوا تھا چوں کہ حضرت قربی فرمایا کرتے تھے "میں عالم گیر کی وفات کے وقت ایک سال کا بچہ تھا" اس سے آپ نے یہ قیاس فرمایا کہ عالم گیر کی وفات ۱۱۱۷ھ میں ہوئی تھی، بنابریں حضرت قربی کی ولادت ۱۱۱۶ھ میں ہوئی ہوگی۔" حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ عالم گیر اورنگ زیب کا انتقال بہ قول مولانا یوسف کوکن مرحوم بہ تاریخ ۱۷/ ذوالعقیدہ ۱۱۱۹ھ مطابق ۲۰/ فروری ۱۷۰۷ء ہوئی (۱۶)۔اس لحاظ سے حضرت قربی کی ولادت کا سال ۱۱۱۸ھ متعین ہوجاتا ہے جیسا کہ مادۂ تاریخ۔ نتیجہ۔ کریم الطرفین" سے بھی یہی سن مستخرج ہے۔اس کے برعکس جن اہلِ قلم نے عالم گیر کا سالِ وصال ۱۱۱۸ھ خیال کیا تھا ان حضرات کے نقطہ نظر سے حضرت قربی کا سال ولادت ۱۱۱۷ھ قرار پاتا ہے۔

حضرت قربی ابھی چار ہی سال کے تھے کہ آپ کے والد حضرت شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری نے بیجاپور کی سیاسی ابتری اور بدامنی سے دل برداشتہ ہوکر ۱۱۲۲ھ میں ترک وطن کیا، حضرت قربی نے اپنے والد کے ہم راہ شاہ نور، سرا اور آرکاٹ ہوتے ہوئے ۱۱۳۲ھ میں ویلور کی سرزمین پر قدم رکھا اور وہیں کے ہورہے، جس کی تفصیل باب دوم میں گزرچکی ہے۔جب آپ ویلور پہنچے تو آپ کی عمر چودہ سال تھی، گویا بیجا پور سے نکل کر ویلور پہنچنے تک آپ کو کامل دس سال لگ گئے، اس عرصہ میں آپ کی تعلیم آپ کے والد بزرگوار کی نگرانی میں جاری رہی، البتہ قیام آرکاٹ کے دوران کہ جس کی مدت چھ سال تھی، آپ نے ایک متبحر عالم مولانا محمد حسین بیجاپوری نزیلِ آرکاٹ سے کتب فارسی کی تعلیم حاصل کی، جیسا کہ مصنف مثنوی مطلع النور نے فرمایا:

تھا محمد حسین جو مشہور   واردوں سے زشہر بیجاپور
اولاً فارسی کتب بعضے   بے بترتیب وہ پڑھا اس سے (۱۷)

چونکہ عہدِ طفولیت ہی سے آپ میں ذہانت و فطانت بدرجہ اتم موجود تھی اور ذکاوت و فراست کا وافر حصہ قدرت نے آپ کو بچپن ہی سے بخش دیا تھا لہذا ایک قلیل عرصہ میں آپ نے زبان فارسی اور ادبیات میں مہارت تامہ حاصل کرلی تھی،

چناں چہ استاذ خود اپنے شاگرد رشید کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے تھے "از شہر بیجاپور تا ایں جا رسیدہ ام و ہمہ عمر من در تدریس صرف شدہ است اما شاگرد مثل شما صاحبِ فہم و فکرت و ذہن جودت در حسنِ ادب و شوق طلب ندیدہ ام" (۱۸)۔

یعنی "میں بیجاپور سے یہاں (آرکاٹ) پہنچا ہوں اور میری تمام عمر پڑھانے میں صرف ہوئی مگر آپ (قربی) جیسا ذہین و فہیم مؤدب طالبِ علم میں نے نہیں دیکھا۔"

شفیق استاذ کی دعاؤں کی برکت اور ہمت افزائی کا نتیجہ ہی تھا کہ آپ میں تعلیم و تعلم کا شوق اور تحصیل علوم و فنون کا ذوق آخر وقت تک تابندہ رہا۔ آپ کے حق میں اسرار و معارف کے مغلق ابواب من جانب اللہ وا ہوتے چلے گئے۔ چناں چہ آپ جب آرکاٹ سے ویلور پہنچے تو وہاں حضرت شیخ فخرالدین مہکری ناظمی بے خود ویلوری (۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء) جیسی عارف باللہ شخصیت آپ کی ظاہری رہنمائی اور باطنی تربیت کے لیے موجود تھی، جن سے آپ نے تصوف کے کتب متداولہ کی تعلیم پائی جیساکہ "مثنوی مطلع النور" میں مرقوم ہے:

اور تصوف میں چند کتاب لطیف — مولوی کی بھی مثنوئ منیف
فخرِ دیں عارفِ بلد سے پڑھا — جو خلیفہ تھا شیخ ساوی کا (۱۹)

حضرت شیخ بے خود آپ کی خاندانی عظمت اور غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے آپ پر فریفتہ ہوگئے۔ شفیق استاذ کو لائق شاگرد پر اس قدر اعتماد تھا کہ شیخ بے خود شاہ قربی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ حضرت قربی کے نانا سید ابو القاسم درایت خاں علم و ادب کے شیدائی تھے، شائد اسی لیے آپ کا میلان طبع بچپن ہی سے شعر و ادب کی طرف تھا، مولانا محمد حسین آرکاٹی کی علمی صحبت نے شاعری کے ذوق کو پروان چڑھایا اور پھر حضرت شیخ بے خود ویلوری کے فیضانِ خاص اور حسن تربیت نے اس میں چار چاند لگادیے، یہاں تک کہ آپ عنفوانِ شباب ہی میں فارسی کے باکمال شاعر بن گئے۔ چناں چہ ایک مرتبہ شیخ بے خود نے اپنی ایک مثنوی آپ کو سنائی، اختتام پر قربی نے بے ساختہ مثنوی کی توصیف میں درج ذیل فی البدیہ قطعہ کہا:

چوں شنیدایں سخنِ شوق فزا — عقل درگوش ضمیر من گفت

کز گل ولالہ، لفظ و معنیٰ پیش گی تازہ بہارے بہ شگفت

مہربان استاذ نے شاگردِ ارشد کے اس قطعے کو بہ نظر استحسان دیکھا اور فرمایا کہ "مجھے آج اپنی محنت کا صلہ مل گیا اور یہ دو شعر اپنی بیاض میں لکھوا لیے (۲۰)

حضرت قربی کو فارسی کے ساتھ عربی میں بھی کامل مہارت حاصل تھی، آپ کے استاذِ عربی مشہور و معروف عربی داں عالم و فاضل مولانا محمد ساقی آرکاٹی ہیں جنھیں ماہر علوم عربیہ علامہ عبدالکریم کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ حضرت قربی عربی سیکھنے کی غرض سے ویلور سے آرکاٹ بار بار سفر کیا کرتے تھے، حصول علم کی اس لگن اور سیرابی کی تڑپ نے آپ کو تھوڑی ہی مدت میں علوم عربیہ میں لائق و فائق تقریر و تحریر، انشاء وادب میں ممتاز بنا دیا تھا۔ آپ کے شاگردِ رشید حضرت باقر آگاہ نے "تحفۂ احسن میں آپ کی عربیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ باوجود یہ کہ آپ کی عربی تعلیم " ملا جامی تک ہی ہونے پائی مگر آپ نے اپنی ذاتی محنت اور شوق سے اس قدر استعداد حاصل کر لی تھی کہ شیخ اکبر کی فتوحات مکیہ و فصوص الحکم، علامہ عبدالکریم جیلی کی " الانسان الکامل " اور حضرت غوث اعظمؒ کی جیسی معرکہ آرا کتب تصوف کا بآسانی ازخود مطالعہ فرما لیتے تھے اور خطباتِ جمعہ خود ہی تحریر کرتے اور سناتے بھی تھے (۲۱)۔ آپ کا علمی فیضان بہت دور رس نتائج کا حامل رہا، سینکڑوں تشنگان علم آپ کی ذات سے سیراب ہوتے رہے۔ آپ کے خرمنِ علم کے خوشہ چینوں کی تعداد لا محدود و بے شمار ہے۔ چناں چہ آپ کے مسترشد و تلمیذ علامہ باقر آگاہ کا بیان ہے " اکثر مرد ماں تدریس نسخِ متداولہ ۔ فارسیہ از حضرت ایشاں حظ کامل و نفع شامل گرفتہ اند و دریں ملک ہر کہ ہست از شاگردان ایشاں یا شاگرد شاگرداں ایشاں " (۲۲)۔ یعنی اکثر افراد آپ ہی سے فارسی کے کتب متداولہ کی تعلیم کا لطف اور فیضان حاصل کر چکے ہیں، اس علاقے میں جو بھی فاضل ہے یا تو براہِ راست آپ کا شاگرد ہے یا بالواسطہ شاگرد ہے۔

حضرت قربی ایک ایسے خوش نصیب انسان تھے کہ انھیں علوم ظاہری کی طرح

علوم باطنی کا بھی ایک وافر حصہ وراثت میں ملا تھا چوں کہ آپ ایسے صوفی گھرانے کے فرد فرید تھے جن کے خاندان میں صدیوں سے علوم طریقت معرفت و معارف اور سلوک و احسان کا نہ صرف چرچا رہا بلکہ ان کے عملی زندگی میں بھی تصوف رچ بس گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ کی طبیعت صغرسنی میں ہی خدا ترسی، سلامت روی اور خیر خواہی کی طرف مائل تھی، چناں چہ آپ نے سب سے پہلے اپنے والد حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری (م ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء) کے دست حق پرست پر سلسلہ قادریہ میں بیعت کی اور خلافت سے نوازے گئے جیسا کہ شاہ عبدالحی بنگلوری نے اپنی مثنوی مطلع النور میں فرمایا:

نعمت باطنی آبائی اور پہنچی تھی اس کو خلفائی

قادریہ خلافت ذی شاں اس کے والد سے اس کو پہنچی جاں (۷)

حضرت قربی نے بھی اپنے اردو دیوان میں اپنی بیعت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

ہے حقیقت میں پدر تیرا ہی مرشد لقیں تو ہو پیرو تمام اس کا تو فرزند رشید

پھر آپ نے اپنے والد محترم کے حکم پر اپنے عم محترم حضرت سید محمد علی قدس سرہ سے اکتساب فیض کیا، حضرت سید محمد علی کا شمار آرکاٹ کے بلند پایہ صوفیاء کرام میں ہوتا تھا، آخر عمر میں آپ اکثر عالم جذب میں رہا کرتے تھے۔ حضرت قربی کے فرزند حضرت ذوقی اس تعلق سے رقم طراز ہیں " و نیز البا س فرقہ۔ خلافت ایں سلسلہ۔ مذکورہ از عم خود سید محمد علی (سید علی محمد) کردہ و او از شاہ ابوالحسن مذکورہ نمودہ (لطائف ذوقی ص ۱۵۸)

حضرت قربی نے اپنے خاندانی بزرگوں کے علاوہ اپنے استاذ حضرت شیخ فخرالدین مہکری نائطی بے خود ویلوری (م ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء) سے بھی خرقہ۔ خلافت حاصل کیا، بعد ازاں شیخ بے خود نے اپنے شاگرد و مرید کے جذبہ۔ شوق کے مد نظر اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالحق محمد مخدوم ساوی (م ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء) سے وابستہ دامن کر دیا، حضرت ساوی نے شاہ قربی میں طلب صادق پائی تو نہ صرف ان سے جملہ منازل سلوک طے کرائے بلکہ اپنے حین حیات دوسروں کو بیعت کرانے کی اجازت خود ہی

مرحمت فرمائی جبکہ آپ کے خلفاء میں سے بجز حضرت بے خود کے کسی اور کو اس کی اجازت نہیں تھی۔

حضرت قربی کو بھی اپنے شیخ حضرت ساوی سے غیر معمولی عقیدت تھی جس کا اعتراف آپ نے اپنے ایک ایک فارسی قصیدہ میں کیا ہے جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے:

از نفس چراترسم ، مخدوم از تو مستم — شد عشق خدا درسم ، مخدوم ز تو مستم

قربی بہ تو قرباں شد ، از کفر مسلماں شد — ہم جسم وشد وجاں شد، مخدوم ز تو مستم (۲۳)

آپ نے اپنے اردو دیوان میں بھی اپنی عقیدت و محبت کا اظہار جا بہ جا کیا ہے، ایک شعر ملاحظہ ہو

مخدوم کون سچ توں ، معنی منے ہے سب او — عین رسول ہے اور تحقیق عین رب او

آپ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ آپ نے اپنے استاذ شیخ بے خود ویلوری سے خلافت حاصل کی، پھر شیخ بے خود کے استاذ و مرشد حضرت مخدوم ساوی کے ہاتھوں سے قرقہ، خلافت پہنا اور پھر حضرت ساوی کے پیر روشن ضمیر اور مرشد کامل حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ رحمت آبادی قدس سرہ العزیز (۱۱۰۵ھ - ۱۱۹۵ھ) سے بھی چاروں سلسلوں میں اجازت و خلافت سے سرفراز کیے گئے جیسا کہ مثنوی مطلع النور میں مرقوم ہے۔

اور وہ خواجہ بلند مقام — رحمت اللہ لے گا جس کا نام

طرق اربعہ میں اے آگاہ — اس کو بخشا اجازت و خرقہ (۷)

بہر کیف آپ نے باطلاع حضرت شاہ عبدالحی احقر بنگوری مصنف مثنوی مطلع النور چھبیس ۲۶ خانوادوں سے اکتساب نور کیا اور ایک سو اکانوے (۱۹۱) سلسلوں میں اجازت و خلافت سے بہرہ مند ہوئے۔

حضرت قربی کے مریدوں کی تعداد بہت تھی، آپ کے مریدوں میں اکابر و افاضل شامل تھے حتیٰ کہ ۲۶ / رجب ۱۱۸۰ھ میں حضرت شیخ مخدوم ساوی کے ایک فرزند شیخ میران اور حضرت ساوی کی حرم محترم بھی آپ کے حلقہ بگوش ہوگئے (۲۵)۔

آپ کے تمام مریدوں اور خلفاء میں سے جو صاحبِ تصنیف و تالیف ہوئے اور جنھیں بے حد شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی وہ ہیں آپ کے فرزند ارجمند حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوقی ویلوری (۱۱۵۱۔۱۱۹۴ھ) اور آپ کے شاگردِ رشید حضرت محمد باقر آگاہ ویلوری (۱۱۵۸۔۱۲۲۰ھ)۔ مولانا محمد یوسف کوکن عمری نے اپنی کتاب "قربی" کے صفحہ ۴۶ تا ۴۸ پر اور پروفیسر سید محمد فضل اللہ مرحوم نے "دیوانِ قربی" کے مقدمے میں حضرت قربی کے مذکورۃ الصدور مریدوں کے علاوہ مزید جن چھ (۶) نامور مریدوں کا مختصر تعارف کروایا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) شیخ حبیب اللہ (حضرت باقر آگاہ کے چچا) (۲) عبدالحی خاں (نواب انورالدین والئ کرناٹک کے نواسے) (۳) مرزا شہہ نیاز خاں (یہ خواجہ بہاؤالدین کی اولاد سے تھے) (۴) اسد خاں (۵) جمال محمد (۶) شاہ ابوتراب۔

مذکورہ بالا بزرگوں میں سے شاہ ابوتراب کے متعلق مولانا یوسف کوکن صاحب اور پروفیسر موصوف نے جو مختصر تعارف زیبِ قرطاس کیا ہے وہ تقریباً ایک ہی طرح کا ہے وہ یہ ہے: "یہ ایک صوفی خاندان کے فرد تھے "گلزار اعظم" میں ان کی شاعری کا تذکرہ ہے، قربی سے تعلق پیدا ہونے کے بعد ان کی روحانیت پروان چڑھی" (۲۶)۔

مولانا کوکن اور پروفیسر موصوف کے علاوہ تذکرۂ اقطاب ویلور کے مؤلف مولانا حافظ بشیرالحق قریشی لطیفی نے بھی حضرت قربی کے نامور مریدوں کی فہرست میں شاہ ابوتراب کا نام شامل کیا ہے، شاید یہ اتفاق ہی ہے کہ مذکورہ دونوں فاضلین کے خیالات و الفاظ کا عکس آپ کی تحریر سے نمایاں ہے، چناں چہ مولانا رقم طراز ہیں "شاہ ابوتراب یہ ایک صوفی خاندان کے فرد تھے، حضرت قربی کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کے بعد آپ کے اندر روحانی کیفیات میں اضافہ ہوا، شاہ صاحب کو شعر و شاعری سے بھی بڑی دل چسپی تھی، بہت اچھے شعر کہتے تھے، آپ کی شاعری کا ذکر "گلزار اعظم" میں ہے (۲۷)۔

یہ بات باعث حیرت ہے کہ مذکورہ تینوں تذکرہ نگاروں میں سے مولانا کوکن نے اپنے ماخذ کی صراحت کرتے ہوئے "تحفۂ احسن" کا ذکر کیا ہے، باقی دونوں اہل قلم نے اپنے ماخذ کا کھل کر اظہار نہیں کیا ہے ۔۔۔

البتہ مریدوں کی فہرست کی ابتداء میں پروفیسر صاحب نے اختتام پر مولانا صاحب نے "تحفۂ احسن" کا ذکر ضمناً کیا ہے جس سے صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ اقتباسات "تحفۂ احسن" سے ماخوذ ہیں، علاوہ ازیں حضرت ابوتراب کے تعارف میں "گلزار اعظم" کا ذکر اس امر کی نفی کرتا ہے کہ یہ اقتباس "تحفۂ احسن" کا ہوسکتا ہے، یہ اس لیے کہ "تحفۂ الاحسن فی مناقب السید ابی الحسن" حضرت باقر آگاہ (متوفی ۱۲۲۰ھ) کی تصنیف ہے، جس میں آپ نے اپنے مرشد واستاذ ابوالحسن قربی کے حالات و کرامات درج کیے ہیں۔ اور "تذکرۂ گلزار اعظم" نواب محمد غوث خاں اعظم (۱۲۴۰۔۱۲۷۲ھ / ۱۸۲۴۔۱۸۵۵ء) کی تالیف ہے جو ۱۲۶۹ھ میں تحریر کی گئی تھی جیسا کہ اس کے قطعۂ تاریخ سے عیاں ہوتا ہے:

چوں تیارشد گلشنِ بے خزاں — کہ افزاید از سیرآں عقل و ہوش
شدم درپئے نام و تاریخ او — ندا کرد "گلزارِ اعظم" سروش (۲۸)

اور یہ کتاب ۱۲۷۲ھ میں مطبع سرکار مدراس زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ الغرض حضرت باقر آگاہ کی وفات کے بیس (۲۰) سال بعد پیدا ہونے والے نواب اعظم صاحب کی کتاب "گلزار اعظم" کا حوالہ حضرت آگاہ کی کتاب "تحفۂ احسن" میں پایا جانا محال و ممتنع ہے۔ لہذا اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مذکورہ دونوں تذکرہ نگاروں نے شاہ ابوتراب کے تعارف میں جو اقتباس پیش کیا ہے اس کا حوالہ حیطۂ تحریر میں آنے سے رہ گیا ہے۔

یہاں اس تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اگر واقعتاً شاہ ابوتراب حضرت قربی کے براہِ راست مرید و مجاز ہوتے، حالاں کہ واقعہ ایسا نہیں ہے، درحقیقت آپ کا مختصر احوال یہ ہے کہ شاہ ابوتراب جن کا اصلی نام تراب علی ہے شہر

"ترونامل" (ضلع شمالی آرکاٹ نزد ویلور) کے باشندے تھے۔ آپ ایک صوفی گھرانے کے چشم وچراغ تھے، آپ کئی زبانوں کے ماہر اور ایک پر گو شاعر تھے، تراب یا ترابی تخلص فرماتے تھے۔ آپ کی یادگار کئی مثنویاں اور ایک ضخیم اردو دیوان ہے، آپ نے اپنا دیوان ۱۱۷۰ھ میں مرتب کیا اور یہ دیوان انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان) سے ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر سلطان بخش صاحبہ کے طویل و معرکہ آرا مقدمے کے ساتھ شائع ہوا تھا، دیوان میں شامل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ تراب کے پیر و مرشد خانوادۂ حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے نامی گرامی بزرگ حضرت سید شاہ پیر پاشا حسینی قدس سرہ تھے، شاہ تراب نے اپنے مرشد کا ذکر خیر اپنے دیوان میں بیسوں مقامات پر کیا ہے، مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پیران پیر شاہ علی پیر رہنما   مرشد مرا حسینی جو ثانی امیں ہوا

تراب نقشِ نعلینِ حسینی ہو رہا تب سوں   ہوئی مشہور عالم جو میری صاحب کملی ہے

تراب عاشق صادق تصدق سوں حسینی کے   بحمداللہ کے روز وشب ہوا مشغول ہے رب کا

اے تراب عاشق حسینی کا   بولتا بال بال یا ھو ھو (۲۹)

شاہ تراب نے اپنے دیوان میں حضرت قربی کا بھی ذکر کیا ہے مگر مرشد ہونے کی صراحت کے ساتھ پہنچا بلکہ آپ کے ایک مصرعے پر گرہ لگانے کے ضمن میں:

سراپا ناخنِ دل ہے تراب یو مصرعہ قربی
جدھر دیکھے ادھر ہے حق ولے پندار حائل ہے   (دیوانِ تراب ص ۴۶)

علاوہ ازیں ابو تراب نے حضرت قربی کی ایک غزل کی مخمس کی ہئیت میں تضمین بھی کی ہے جس کا آخری بند اس طرح ہے:

گرچہ کیا ہے توں نے مئے معرفت کوں نوش
بزم بتاں میں عین توں ساقی ہے مے فروش
مت بھول بے خودی سوں مثالِ تراب ہوش
قربی شرابِ قرب کی مستی میں رہ خموش

افشائے رازو لذتِ مستی محال ہے (دیوانِ تراب ص ۵۲۵)

ان اشعار سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ حضرت قربی شاہ تراب کے مرشد ہیں۔ علاوہ ازیں "تذکرۂ گلزارِ اعظم" میں کسی تراب، ترابی، یا ابوتراب تخلص رکھنے والے شاعر کا ذکر نہیں ہے، البتہ اس تذکرے میں "شاہ احمد ابوتراب قادری" کا ذکر ملتا ہے جن کا تخلص عارف تھا اور جو "اودگیر" کے متوطن تھے اور ان کا سال ولادت ۱۲۴۱ھ بتایا گیا ہے (۳۰)۔ ایک اور مولوی تراب علی نامی خیرآبادی کا ذکر بھی "گلزارِ اعظم" میں موجود ہے، جن کی وفات سری رنگاپٹن (میسور) میں ۱۲۴۲ھ میں ہوئی (۳۱)۔ ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے ابوتراب کے ذکر سے یہ تذکرہ خالی ہے۔

"دیوانِ تراب" کی مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں تراب نام یا تخلص کے دوسرے پچیس (۲۵) شعرا کا ذکر بطورِ ضمیمہ کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی بہ ظاہر حضرت قربی کا فیض یافتہ نظر نہیں آتا، ہاں! یہ بات ممکن ہے کہ کوئی غیر معروف شاہ ابوتراب نامی شاعر حضرت قربی کے متبین میں سے رہا ہو اور پروفیسر سید فضل اللہ صاحب اور مولانا بشیرالحق صاحب نے اس کا ذکر کہیں دیکھا اور اس ماخذ کا حوالہ دینے میں ان دونوں فاضلین سے بھول چوک ہو گئی ہو، یا یہ بات بھی ممکنات میں سے ہے کہ چوں کہ حضرت قربی اور شاہ تراب دونوں "شمالی آرکاٹ" کے باشندے تھے لہذا شاہ تراب اپنے پیرومرشد حضرت پیرپاشاہ حسینی کے انتقال (سنہ معلوم ندارد) کے بعد یا مرشد ہی کے حسینِ حیات مرشد کی اجازت سے شاہ قربی سے طالب ہو کر آپ کے حلقہ۔ ارادت میں شامل ہو گئے ہوں، یہ بات اس لیے بھی معقول معلوم ہوتی ہے کہ حضرت قربی کی شخصیت اس وقت محتاجِ تعارف نہیں تھی۔ آپ کی عظمت و بزرگی کے چرچے دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے، لہذا شاہ تراب کا بالآخر آپ کے ارادت سے وابستہ ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ "دیوانِ تراب" کی داخلی شہادتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس ضمن میں چند شعر ملاحظہ ہوں۔ جن میں "ابوالحسن" کے الفاظ "ابوالحسن قربی" کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

تراب ِ عاشق ابرو کمانے
ہوا قربان یعنی بوالحسن کے (دیوان ِ ص ۴۰۱)
یا رسول اللہ بحق ِ بو تراب ِ بوالحسن
رکھ مجھے سرشاروِدیوانہ مئے وحدت سیتی (دیوان ص ۴۱۰)
بحمداللہ کے عالم جانتا ہے
ترابی نقش ِ پا ہوں بوالحسن کا (دیوان ص ۹۰)

حضرت قربی ایک جامع لصفات پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ آپ کی ذات بابرکت رزائل سے پاک اور فضائل سے آراستہ تھی، تاہم آپ کا وہ خاص وصف جس کی وجہ سے آپ اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور تمام اقران میں فائق سمجھے جاتے تھے۔ "غنائے نفس تھا۔ آپ کے مزاج میں حد درجہ کا استغناء پایا جاتا تھا۔ اس کے ثبوت میں آپ کا یہ شعر کس قدر کیف آگیں اور پر اثر ہے۔ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:۔

فقر کی رہ کا وہ ہے شہہ قربی جو خدا کا بی نا اچھے محتاج
(بھی) (رہے)

حضرت قربی کے مذکورہ بالا شعر کے مقابلے میں علامہ اقبال کا درج ِذیل شعر بھی قدرے پھیکا نظر آتا ہے۔ شاعر مشرق کا ارشاد ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایک مرتبہ والی ِکرناٹک نواب محمد علی والاجاہ (م ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء) نے بڑی عقیدت سے سالانہ بارہ ۱۲ ہزار روپیہ کا پروانہ حضرت قربی کی خدمت میں بطور ِنذرانہ پیش کیا۔ آپ نے بقول حضرت سید شاہ رکن الدینؒ "اس پروانے کو نوالہ ٔ چراغ بنایا (۳۲)۔

مؤلف ِانوار اقطاب ویلور نے اس واقعے کی تفصیل نقل کرتے ہوئے لکھا کہ "آپ (حضرت قربی) نے یہ کہتے ہوئے پروانہ رد کر دیا کہ:

شاہی و ملک شاہی قربی جوئے نسنجد
در ملک فقر دستے بالاست بوریارا (۳۳)

آپ کی دیگر چند خصوصیتوں کے تعلق سے آپ کے فرزند حضرت ذوقیؒ کا بیان نقل کیا جاتا ہے تاکہ آپ کی تہہ دار شخصیت کا بھرپور عکس نمایاں ہو ، حضرت ذوقی فرماتے ہیں " ہمارے شیخ حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری رضی اللہ عنہ چند نمایاں اوصاف رکھتے تھے ۔ اول یہ کہ آپ ظاہر و باطن کے جامع تھے ۔ اسی لیے اہلِ ظاہر نے آپ کے ظاہر سے اور اہلِ باطن نے آپ کے باطن سے فائدہ حاصل کیا ، دوم یہ کہ احکام شرعیہ کے نافذ کرنے میں وسعت سے زیادہ کوشش فرماتے ، سوم یہ کہ جو کچھ آپ کے سننے میں آتی اس کو شریعت پر پیش فرماتے اگر شریعت اس کو قبول کرتی یعنی موافق ہوتی تو اس کو قبول فرماتے ورنہ اس سے اعتراض فرمالیتے (۳۴) ۔

حضرت قربی کا نکاح اپنے رشتے کے چچا سید محمد علی قادری عرف دیوان صاحب کی صاحب زادی سیدہ امت الوکیل عرف ماں صاحبہ سے ہوا جو نہایت پرہیزگار اور اطاعت شعار خاتون تھیں ۔ آپ کا وصال حضرت قربی کے حین حیات ۴ / رمضان المبارک ۱۱۷۵ھ کو راہیِ ملک عدم ہوگئے ۔ دوسرے صاحب زادے حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوقی ہیں جن کا تفصیلی ذکر آیندہ صفحات پر انشاء اللہ آئے گا ۔ آپ کی تین صاحب زادیوں کے نام اس طرح ہیں ۔ (۱) سیدہ ساجدہ بیگم صاحبہ (۲) سیدہ جمیلہ خاتون صاحبہ (۳) سیدہ عائشہ خاتون صاحبہ (۳۵) ۔

حضرت قربی کے سنِ وفات میں بھی ولادت کی طرح اختلاف پایا جاتا ہے ، آپ کے فرزند حضرت ذوقی اپنی کتاب " انشائے عقائد " میں فرماتے ہیں " وفات اور در بلدۂ ایلور در سنِ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و سہ شب بیستم رمضان المبارک شب پنج شنبہ (۳۶) یعنی آپ (حضرت قربی) کی وفات بہ تاریخ ۲۰ / رمضان المبارک ۱۱۸۳ھ شبِ پنج شنبہ ہوئی ۔ اس تاریخ کے برعکس حضرت قربی کے شاگردِ رشید علامہ محمد باقر آگاہ نے جو تاریخی قطعہ کہا ہے اس سے ۱۱۸۲ھ برآمد ہوتا ہے ، قطعہ تاریخ درج ذیل ہے :

رکن دیں شاہ ابوالحسن قربی پیشوائے مقربانِ الہ
چوں کہ دریافت قربِ حق سالش غاب قطب البلاد گفت آگاہ
۱۱۸۲ھ

حضرت قربی کے تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت آگاہ ہی کی تاریخ پر اعتماد کرتے ہوئے سال وفات ۱۱۸۲ھ رقم کیا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ سخاوت مرزا نے اپنے مضمون "اولیائے ویلور کی دکھنی تصنیفات" میں مذکورہ مصرعے سے ۱۱۸۱ کے اعداد کا استخراج کیا ہے۔ مؤلف "ضمیمہ جواہر السلوک" نے حضرت ذوقی کی تاریخ کو نہ صرف ترجیح دی بلکہ حضرت آگاہ کے مادۂ تاریخ پر تنقید بھی کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ "وفات شب بیستم ۲۰ رمضان ۱۱۸۳ ہجری و تاریخ وفات دی از مولوی محمد باقر آگاہ غاب قطب البلاد است، دریں تاریخ یک عدد کم است" (۳۷)۔

علامہ باقر آگاہ کے شاگرد مولوی حکیم باقر حسین خاں بہادر عرف غلام علی رضا رائق مدراسی نے اپنے تذکرہ موسوم بہ گل دستہ کرناٹک میں حضرت قربی کی تاریخ وفات رقم کرتے ہوئے اپنے استاذ حضرت آگاہ کے قطعہ تاریخ کو پیش تو کیا مگر مادۂ تاریخ سے مستنبط اعداد کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے آپ سے زبردست فروگذاشت ہو گئی۔ آپ نے لکھا کہ "سنہ الف و مائۃ و اثنا سبعین واصل حق گردید" (۳۸) حالاں کہ "سبعین" کے مقام پر "ثمانین" لکھا جانا چاہیے تھا۔ یعنی آپ نے بجائے ۱۱۸۲ کے ۱۱۷۲ تحریر کر دیا۔

بہر کیف حضرت قربی کے وصال کی مذکورہ دونوں تاریخوں میں راقم الحروف علامہ باقر آگاہ کی تاریخ ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ممکن ہے کہ حضرت ذوقی سے "انشائے عقائد" کی ترقیم کے دوران کتابت کی غلطی سرزد ہو گئی ہو اور بعد میں اسی کو مؤلف ضمیمہ جواہر السلوک نے اپنی دانست میں حق سمجھ کر اعادہ کیا ہو، دوسری وجہ یہ کہ تاریخی مصرعے یا مادے اسی لیے کہے جاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اعداد سال ضبط ذہن ہو جاتے ہیں اور اس میں کسی طرح کا تردد یا کسی قسم کی کمی بیشی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بنابریں وجوہ جب علامہ آگاہ نے اپنے تاریخی قطعے سے مقررہ اعداد (۱۱۸۲) کا استخراج کیا تو نہ صرف دیگر تذکرہ نگاروں نے اس پر اعتماد کیا بلکہ

خود حضرت قربی کے گنبد پر بھی یہی تاریخی قطعہ کندہ کر دیا گیا تھا جو آج بھی پوری طرح محفوظ ہے۔

حضرت قربی نے فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھیں، آپ کے فارسی رسائل جو فقہ، عقائد اور تصوف پر مشتمل ہیں دکنی کے مقابلے میں زیادہ ہیں، ان میں سے اکثر "مجموعہء رسائل قربی" کے عنوان سے مولانا محمد طیب الدین اشرفی مونگیری سابق استاذ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور کے مقدمہ اور اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔یہاں ان رسائل کے نام اور تعداد صفحات پیش کیے جاتے ہیں تا کہ آپ کی علمی شخصیت اور آپ کی ترجیحات پر روشنی پڑسکے۔

(۱) رسالہء اثبات وجودِ حقیقی (ص ۱۴ تا ص ۳۴) (۲) رسالہء حق الحق (۳۵ تا ۴۷) (۳) رسالہء برہانِ قاطع در بیان توحید جامع (۴۸ تا ۵۳) (۴) دلیل محکم فی بیان التوحید الاقوم (۵۳ تا ۵۷) (۵) رسالہء عین العیان (۵۸ تا ۶۳) (۶) رسالہء حق المعرفت (۶۴ تا ۶۷) (۷) رسالہء تحفتہ الذاکرین (۶۸ تا ۷۲) (۸) رسالہء کیمیائے سعادت (۷۳ تا ۷۶) (۹) رسالہء وجدان (۷۶ تا ۸۲) (۱۰) خلاصتہ العرفان (۸۳ تا ۱۳۴) (۱۱) رسالہء جمع الجمع (۱۳۵ تا ۱۳۹) (۱۲) رسالہء تجد د امثال (۱۴۰ تا ۱۴۵) (۱۳) فائدہ از کتاب دلیل محکم (۱۴۵ تا ۱۵۴) (۱۴) رسالہء لب السکوک (۱۵۵ تا ۱۶۸) (۱۵) رسالہء اسم اللہ (۱۶۹ تا ۱۷۷) (۱۶) رسالہء توفیق (۱۷۸ تا ۱۸۸) (۱۷) رسالہء مظہر کل (۱۸۹ تا ۱۹۵) (۱۸) رسالہء حلال در حل مسئلہء عینیت (۱۹۶ تا ۱۹۷)

پروفیسر سید فضل اللہ (متوفی ۱۹۷۲ء) نے دیوان قربی کے مقدمے میں آپ کے مزید چار رسائل کا ذکر کیا ہے جن کے نام اس طرح ہیں (۱) ملفوظ قربی ہر قرب (۲) میزان العقائد (مطبوعہ ۱۲۷۴ء در مطبع قادری ویلور) (۳) رسالہء ظہورِ ذات (۴) رسالہء منہج التحقیق فی التفضیلت الصدیقؓ (مطبوعہ ۱۲۷۶ء در مطبع قادری ویلور)۔

یہ تمام مذکورہ بالا رسائل نثری ہیں۔ بقول حضرت ذوقی "حضرت مادرِ سخن شناسی یگانہء آفاق بودند، وآں حضرت را دو دیوان است یکے فارسی و یکے دکنی مشہور

راست " (انشائے لطف اللہیؒ) نظم میں آپ کا فارسی دیوان موجود ہے۔

حضرت قربی کا دکنی کلام چار مثنویوں اور ایک دیوان پر مشتمل ہے، جیسا کہ حضرت باقر آگاہ نے " تحفۂ احسن " میں لکھا ہے کہ " حضرت ما اشعار بزبانِ دکنی بنز فرمودہ اند و ایشاں راہم دریں زبانِ چہار مثنوی است و یک دیوانے است کہ بسیار از حقائق و معارف دراں درج کردہ " (۳۹) یعنی ہمارے استاذ (حضرت قربی) نے دکنی زبان میں بھی اشعار کہے ہیں اور دکنی میں آپ کی چار مثنویاں ہیں اور ایک دیوان ہے جس کا بیشتر حصہ حقائق و معارف کا خزینہ ہے۔ چار مثنویوں کے نام اور تفصیل یوں ہے۔

(۱) معراج نامہ : حضرت قربی کی یہ غیر مطبوعہ مثنوی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (متوفی ۱۰۰۰ھ) کی تصنیف " معارج النبوۃ " سے ماخوذ ہے، یہ طویل مثنوی ستائس ۲۷ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے جملہ اشعار تقریباً ڈیڑھ ہزار ہیں (۴۰)۔ ۱۴۲ صفحات پر پھیلے ہوئے اس مخطوطے کا آغاز درجِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

سراہنا خدا کو سزا وار ہے ۔۔۔ کہ ہر ذرہ اس کا نمو دار ہے
ہر اک ذرہ رکھتا ہے اس کا اثر ۔۔۔ ہے دال اس کی صفت ذات پر

اختتامی اشعار یہ ہیں:۔

کیا ختم میں ذکر معراج کا ۔۔۔ بنامِ محمد نبی مصطفیٰؐ
کیا ختم میں لے محمدؐ کا نام ۔۔۔ علیہ الصلوٰۃ علیہ السلام

ترقیمہ کے الفاظ اس طرح ہیں:۔ " اس کتاب معراج نامہ ہندی تالیف حضرت شاہ ابوالحسن صاحب قبلہ قربی قدس اللہ العزیز روز دوشنبہ بست و دہم ذی قعدہ ۱۲۹۲ھ حسن انصرام یافت " (۴۱)۔

حضرت قربی کا یہ " معراج نامہ " اردو کے قدیم معراج ناموں میں سے ایک ہے، قطب شاہی دور کے شاعر سید بلاقی کے معراج نامہ (تصنیف ۱۰۸۰ھ) اور عہدِ عادل شاہی کے صوفی شاعر محمد مختار کے معراج نامے (تصنیف ۱۰۹۴ھ) (۴۲) کے بعد

غالباً آپ ہی کا معراج نامہ قدیم ترین ہے۔آپ کے بعد حضرت شاہ کمال (متوفی ۱۲۲۴ھ) نے خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ (متوفی ۱۱۹۵ھ) کی فرمائش پر ۱۱۹۱ھ میں معراج نامہ تحریر فرمایا تھا، اور یہ کتاب ۱۳۰۷ھ میں مطبع احمد قلندر مدراس سے شائع ہو چکی ہے جس کا ایک نسخہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔ بہ چناں چہ مؤلف "فیضانِ رحمت" کا یہ دعویٰ کہ معراج نامہ، حضرت قربی در حقیقت حضرت شاہ کمال کی تصنیف ہے (۴۳) حقیقیت پر مبنی نہیں۔

(۲) نمک نامہ:۔ اکسٹھ ۱۶ اشعار پر مشتمل یہ نظم مطبوعہ "مجموعہ، رسائل قربی" کے آخر میں فارسی رسائل کے ساتھ شامل کر دی گئی ہے جو کتاب کے تین صفحات (۱۹۸ تا ۲۰۰) پر پھیلی ہوئی ہے۔ حضرت قربی نے نمک کو اسم مطلق کا استعارہ بنا کر عجیب و غریب طریقہ سے فنا فی اللہ و باقی باللہ کی تعلیم دی ہے۔اس مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ثنا کی نمک سوں کیا میں شروع — کہ ہو وہ نمک خواہ کا یھاں رجوع
(سے) — (یہاں)

اس کے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کیا ہے جو قربی نما کا یہاں — یہاں گوش رکھ راز یو سن عیاں
(یہ)

جو ہے سایرِ بحر و بروفلک — کہ درکار ہے اوس کے تیں یو نمک
(یہ)

اول ہی نمک اسم مطلق پچھان — کہ او راز طالب کو کرتا بیان
(پہچان) — (وہ)

زماں و زمین فعل اللہ کا — مکان و مکین فعل اللہ کا

فنا کر کو اس ذات میں سب ذوات — او سب سوں گزر جا ہوا عین ذات
(سے)

ہے رب عبدنا عبد رب ہے سدا — کرے اس نمک کے اوپر انتہا

اختتامی اشعار یہ ہیں:

ہوا فضلِ حق پر نمک یو تمام ۔ نمک خواہ کوں فضلِ حق سوں ہے کام
(ایہ) (کو) (سے)

کیا ختم میں یو نمک کا کلام بحقِ محمد علیہ السلام

(۳) ہدایت نامہ: یہ مثنوی ردِ منہیات میں بطور ہدایت و رہنمائی تحریر کی گئی ہے اس کے تمام عناوین فارسی میں ہیں، جیسے در وعید اسراف، دربیان وقاحت الادہ، دربیان، وقاحت زناں کہ برائے تماشا از خانہ بیروں می آیند وغیرہ۔ مثنوی کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

کروں آغاز حمدِ حق سوں اول کہ تا نامہ ہوے بیگی مکمل
(سے) (تا کہ) (جلد)

جنے دو جگ کو قدرت سوں بنایا نہ کوئی قدرت کا اس کے انت پایا
(جس نے) (کوئی) (انتہا)

اس مثنوی کے جملہ اشعار تین سو چوسٹھ ۳۶۴ ہیں جیسا کہ حضرت قربی نے خود فرمایا ہے

:

اگر کوئی اس کے بیاں کو گنے گا عدد کے باغ کے پھولاں چنے گا
(کوئی) (اشعار)

انے پاوے گا سب ابیات اے یار تمامی تین سو پر سات اوپر چار
(وہ) (ساٹھ)

مذکورہ ابیات کی روشنی میں مؤلف تذکرۂ اقطاب ویلور کا یہ بیان کہ "ہدایت نامہ" بیاسی ۸۲ شعروں پر مشتمل ہے انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے (۴۴)۔

ہدایت نامہ یا بدعت نامہ: ۔ اکاسی ۸۱ / اشعار پر مشتمل یہ مثنوی بدعات و خرفات کی تردید و توبیخ میں معرض وجود میں آئی تھی، حضرت قربی نے اس مردف مثنوی میں لفظ "نے" (علامت فاعل) کو ردیف بنایا ہے اور دکنی روایات کے مطابق صیغہء حال میں بھی "نے" کا استعمال روا رکھا ہے۔

مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے: ۔

آیا عجب زمانہ سب مل کو اجراں نے — بدعت کی راہ پکڑے کیا مادہ کیا نراں نے
(مل کے) (بدکار لوگ) — (نر کی جمع)

بدعت جو ہی براکام سنت کے ہی مخالف — دیں کے خلل کی خاطر کاڑے ہیں اخسران نے
(رذیل لوگ)

اختتامیہ اشعار اس طرح ہیں:

قربی تیرا ہی مسکیں کراسکوں توں مدد یو — سنت او پر اچھے اور بدعت سوں برکراں نے
(اسے) (تو) (یہ) — (پر) (رہے) (سے)

تیرے نبی کے رہ پر ہمنا دے استقامت — ئت ہم سوں ہوئی خوش دل او آل اطہراں سے
(ہمیں) — (ہمیشہ) (سے) (وہ)

ہدایت نامہ اور بدایت نامہ دونوں ایک ساتھ ۱۳۰۵ھ میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ حضرت قربی کی تصنیفات کی فہرست میں بعض تذکرہ نگاروں (مثلاً ڈاکٹر افضل الدین اقبال اور مولوی بشیر الحق قریشی) نے "چکی نامہ" کا بھی ذکر کیا ہے، تاہم کسی نے اس کا تعارف نہیں کرایا ہے، صرف نام گنوانے پر اکتفا کیا ہے، لہذا راقم کا یہ خیال ہے کہ شاید آپ کے ہم عصر حضرت شاہ کمال کے "چکی نامہ" کو غلطی سے آپ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ راقم کے اس خیال کی تائید "دکنی چکی ناموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں فاضل مقالہ نگار نے تمام ممکنہ چکی ناموں پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے حضرت قربی کے "چکی نامہ" کی موجودگی پر شبہ ظاہر کیا ہے (۴۵)۔

دیوان قربی :۔ حضرت قربیؒ کا دکنی دیوان جس کو آپ نے ۱۱۵۱ھ میں خود ہی مرتب فرمایا تھا، منظرِ عام پر آچکا ہے۔ پروفیسر سید فضل اللہ (متوفی ۱۹۷۲ء) نے دیوان قربی کو ایڈٹ کر کے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں حیدر آباد سے شائع کروایا ہے۔ دیوان قربی کی از سرِ نو ترتیب کے وقت بقول خود آپ کے پیشِ نظر دو قلمی نسخے تھے ایک کسی قلمی نسخے کی نقل تھی، دوسرا کتب خانہ مشرقی سالار جنگ حیدر آباد کا قلمی نسخہ تھا (نمبر داخلہ ۵۵۰۔ نمبر کتاب ۴۷ فن کلیات و دواوین) (۴۶)۔ لہذا جناب

کاوش بدری کا یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا ہے کہ "پروفیسر سید فضل اللہ مدراسی استاذ شعبہء اردو، فارسی، عربی (ایس وی یونیورسٹی تروپتی) نے لندن میں قربی سے متعلق مخطوطات حاصل کر کے دیوانِ قربی کو ایک مقدمہ کے ساتھ شائع فرمایا جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا" (۴۷)۔ جناب افسر صدیقی کے اطلاع کے مطابق دیوان ش قربیؒ کا ایک اور مخطوطہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب خانہء خاص میں موجود ہے (۴۸)۔ غالباً پاکستانی نسخے تک پروفیسر موصوف کی رسائی نہیں ہو سکی، اسی لیے آپ نے مذکورہ دو ہی نسخوں کی مدد سے دیوان کے متن کی تصویب کی تھی۔

حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر سید فضل اللہ صاحب نے اپنے مقدمے کے آخر میں یہ دعویٰ کیا کہ "ولی کے دیوان سے شمالی ہند میں اردو شاعری کی تحریک ہوئی اور یہاں علاقہء مدراس میں ان (حضرت قربی) کے دیوان سے اردو شاعری کا آغاز ہوا" (مقدمہء دیوان قربی ص ۲۳) آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے اپنی تالیف "مدراس میں اردو کی نشو ونما" (ص ۱۲۵) میں اور مولوی حافظ بشیر الحق قریشی نے اپنے طویل مقالے "تذکرۂ اقطاب ویلور قدس اللہ اسرار حلم (ص ۴۶ مشمولہء اللطیف ۱۴۰۴ھ) میں یہی ادعا کیا ہے کہ حضرت قربی کے دیوان سے مدراس اور اس کے اطراف و اکناف کے علاقوں میں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ ان تینوں فاضلوں نے اپنے دعویٰ کے لیے کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کی۔!

حضرت قربی کی عظمت و تقدس اپنی جگہ مسلم ہے مگر تحقیقی نقطہء نظر سے دیکھا جائے تو یہی حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آپ کے معاصرین بلکہ آپ کے متقدمین میں بھی شعر و ادب کا سلجھا ہوا ذوق پہلے ہی سے موجود تھا۔ چناں چہ ویلور ہی کے مشہور دکنی شاعر ولی ویلوری نے اپنی معرکہء آرا مثنوی "روضتہ الشہداء" ۱۱۳۷ھ میں تحریر کی تھی (۴۹) جب کہ حضرت قربی نے سرزمین ویلور پر قدم رنجا نہیں فرمایا تھا۔ اسی طرح سدھوٹ (علاقہء قدیم مدراس) کے نامور شاعر محمد ابن رضا نے قصیدۂ بردہ کا اولین دکنی منظوم ترجمہ ۱۱۲۰ھ کے آس پاس میں کیا تھا (۵۰)۔ علاوہ ازیں

حضرت قربی کے پیر و مرشد حضرت شیخ مخدوم ساوی مدراسی (متوفی ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء) نے اپنی دکنی تصنیف (مرقع نظم و نثر) "مفتح الکل" اور حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب (متوفی ۱۱۹۵ھ) نے اپنی گراں قدر مثنوی "تنبیہ النساء" حضرت قربی سے متاثر ہو کر ہرگز نہیں لکھی، الغرض اس طرح کے مبالغہ آرائیوں سے ہم اپنے ممدوح کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچا پاتے ہیں۔ البتہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ جس طرح دیوان عالی کے دہلی پہنچے کے بعد شمالی ہند کے شاعروں کو اردو دیوان مرتب کرنے کا شوق ہوا تھا بالکل اسی طرح حضرت قربی کے دیوان مرتبہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء کے بعد ہی جنوب کے شعراء کرام میں ترتیب دواوین کا جذبہ و شوق پیدا ہوا تھا۔ چناں چہ شاہ ابو تراب نے اپنا ضخیم دیوان ۱۱۷۰ھ (۵۱) / ۱۷۵۶ء میں مرتب کیا اور حضرت شاہ کمال (متوفی ۱۲۲۴ھ) نے بھی اپنا دیوان موسوم بہ "مخزن العرفان" اپنی وفات سے قبل ترتیب دیا تھا۔

حضرت قربی کی ایک نثری تصنیف کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس کی تفصیل یوں ہے :۔ (۳۶۶) رسالہ تصوف شاہ قربی ۔ نمبر (تصوف شاملات ۳۹۲) سائز (۵ × ۷) صفحہ (۷) خط شکستہ سطر غیر معین۔

آغاز:۔ بعد از ثنا ہور صفت خدائے تعالیٰ کے ہور درود و سلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، اے بھائی، بوج توں! کہ معرفت اللہ تعالیٰ کی تین روشن پر ہے، پہلے معرفت مطلق عام دوسرے معرفت مفید عام، تیسرے معرفت مطلق خاص۔"

اختتام:۔ ایسے ملحداں و راضیاں کے صحبت سے ہمن پور ہمارے دوستاں کو پناہ دیوے آمین یارب العالمین (۵۲)۔

آپ کے نثری نمونے کے لیے تاحال یہی ایک مختصر رسالہ دستیاب ہو سکا ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی نثر سادہ، سلیس اور رواں تھی، مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی سے احتراز کیا گیا۔

حضرت قربی کے معاصرین میں علمی و ادبی اعتبار سے ممتاز و متعارف شمالی ہند

میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ ۔ ۱۱۷۶ھ) اور خواجہ میر درد (۱۱۳۳ھ ۔ ۱۱۹۹ھ) اور جنوبی ہند میں حضرت شہمیر کڑپوی (۱۰۸۲ ۔ ۱۱۸۶ھ) اور شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی (۱۱۲۲ھ ۔ ۱۱۷۷ھ) کی شخصیتیں تھیں ۔ خانوادۂ ولی اللہی سے خانوادۂ قربی کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا یوسف کوکن عمری نے ایک دل چسپ نکتہ بیان کیا ہے ۔ مولانا رقم طراز ہیں : " ہندوستان میں ایک ہی زمانہ میں دو مشہور خاندان گزرے ہیں جنھوں نے کئی پشتوں تک علوم و فنون کی خدمت کی ۔ شمالی ہند میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا اور جنوبی ہند میں حضرت قربی ویلوری کا خاندان گزرا جن کو ہندوستان کی علمی اور ثقافتی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی اور اب بھی حاصل ہے ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت قربی دہلوی دونوں ایک دوسرے کے معاصر تھے ، جن کی وفات کی بعد کئی پشتوں تک علوم و فنون اور شعر و شاعری کا چراغ جلتا رہا ، فرق اتنا ہے کہ آج شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان کے افراد گمنام ہیں لیکن حضرت قربی کے خاندان کا سلسلہ ابھی تک " حضرت مکان ویلور " میں باقی اور قائم ہے " (۵۳) ۔

شمال کے خاندانِ ولی اللہیؒ کے برعکس جنوب میں خاندان حضرت شہمیریؒ خانوادۂ قربی کی طرح کڑپہ میں بفضلہٖ تعالیٰ نہ صرف باقی ہے بلکہ ابن سیادت و علمی خدمات کی بنا پر تاحال مرکز توجہ ہے (۵۴) ۔ تاہم ویلور کے " حضرت مکان " کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے علمی ، ادبی اور اصلاحی غیر معمولی خدمات کو " آستانہ ۔ شہمیریہ " سے کہیں زیادہ شہرت و اہمیت حاصل ہوئی ہے " ذلک فضل اللہ لو لیہ من یشاء " (یہ خدائے تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے وہ عطا فرمادے)

جہاں تک خواجہ درد اور سرا اورنگ آبادی کا تعلق ہے تو حضرت قربی کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت قربی سراج سے متاثر تھے ، اسی لیے انھوں نے سراج کی زمینوں میں غزلیں کہیں ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہوتا ہے :

سراج: قدترا سرو رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گلشن دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

قربی: خلق میں دوست عیاں تھا منجے معلوم نہ تھا
(مجھے)

پردہ پوش اوس کا گماں تھا منجے معلوم نہ تھا (دیوان قربی۔ص ۴۶)
(مجھے)

سراج: سب جگت ڈھنڈ پھرا یار نہ پایا لیکن
(ساری دنیا)
دل کے گوشہ میں نہاں تھا جھے معلوم نہ تھا

قربی: عمر اوراق پھرانے میں گنوایا ساری
علم نکتے میں نہاں تھا منجے معلوم نہ تھا

ایک اور غزل کا مطلع اور شعر ملاحظہ ہو:

سراج: شربت لطف یار گل روا آج
دل بیمار کوں ہوا ہے علاج
(کو)

قربی: اے مرسنگ دل خدا سوں لاج
(سے)
کچھ فقیراں اوپر کرم کر آج
(فقیروں پر)

سراج: سروقامت کو بھر نظر دیکھا
(نظر بھر کر)
قمرئ دل کا ہے یہی معراج

قربی: سیر تیری گلی کا اے مہ وش
(کی)

عشق کے بیدلاں کا ہے معراج
(بے دلوں کا)

اس میں ہم قافیہ شعر کا لطف اٹھائیے:۔

سراج: باغ سے گلچیں چلا، تب بلبلوں نے غل کیا
حضرت گل کوں لیاجاتا ہے یہ کافر شہید

قربی: خون بہا دیتا اسے دید جمالِ لایزال
غمزۂ محبوب کرتا ہے جسے نہ میں شہید

ایک دوسرے زمین کا یہ شعر دیکھئے:

سراج: مصحفِ حسن کو دکھا کے ہوا
تری زلفوں میں دین میں اشکال
(تیرے)

قربی: قال ہی عین حال ہے قربی
یو سخول کر قبول ہے اشکال
(یہ)

دونوں شعرا کے مندرجہ بالا کلام کے موازنے سے یہ نکتہ عیاں ہوتا ہے کہ سراج کے ہاں مضمون ہندی اور لفظی رعایت کی کارفرمائی ہے اور قربی کے کلام میں معنیٰ آفرینی اور اک گونہ کیفیت کی جلوہ نمائی ہے۔

خواجہ میر درد اور حضرت قربی نہ صرف ہم مسلک و ہم مشرب تھے بلکہ دونوں ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کے دو شاخیں ہیں، یعنی ان دو بزرگوں کا سلسلہ نسب حضرت امام عسکریؒ ابن امام علی زکی نقیؒ سے جاملتا ہے۔ وہ اس طرح کہ امام حسن عسکریؒ کے بڑے صاحب زادے حضرت سید علی اکبر کی اولاد میں خواجہ میر درد اور چھوٹے صاحب زادے حضرت سید حیدر کرار کی نسل سے حضرت سید شاہ قربی ویلوری ہیں (۵۵)۔

باوجود اس تعلق کے حضرت قربی نے خواجہ درد کی پیروی نہیں کی۔غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ جس وقت ضرت قربی اپنا دیوان ترتیب دے رہے تھے تب تک خواجہ درد کے کلام کو ہندوستان گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ حضرت قربی نے اپنا اردو دیوان ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء میں مرتب کیا تھا، اس وقت خواجہ درد اٹھارہ سال کے نوجوان تھے۔ آپ نے قریب قریب اسی عمر میں اردو میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "۱۱۵۳ھ / ۱۷۴۰-۴۱ء میں جب ان کی عمر بیس ۲۰ سال تھی، انھوں نے:

اپنے والد کی تصنیف نالہ، عندلیب" کا یہ قطعہ۔ تاریخ تصنیف لکھا ہے جسے ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب نے خطبہ، کتاب میں داخل کر لیا" (۵۶) یہ قطعہ گویا آپ کی فارسی شاعری کا اولین نمونہ تھا، اس کے کئی سال بعد آپ کا اردو دیوان بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۱۶۵ تا ۱۱۷۲ھ کے درمیان مرتب ہوا (۵۷)۔اس کے بعد ہی آپ کا کلام ملک کے دور دراز علاقوں تک پھیلا تھا۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ نے حضرت قربی اور خواجہ درد کا اجمالی تقابل کراتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ دونوں بزرگ عملاً:

"مزاجاً صوفی تھے ۔ خواجہ میر درد سلسلہ، نقش بندیہ کے شیخ وقت تھے، اور حضرت قربی سلسلہ۔قادریہ کے ولی کامل ۔۔۔۔۔ دونوں حضرات کی عملی زندگی اور کلام متصوفانہ میں سرِ مو فرق نہ تھا" (۵۸)۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی رائے سے کامل اتفاق اس لیے مشکل ہے کہ دونوں بزرگ اپنی اپنی عملی زندگی میں زاہد و متقی اور شیخ و صوفی ہونے کے باوجود شاعری کے آئینہ میں دونوں کا رنگ اور مزاج کافی مختلف نظر آتا ہے اس لیے کہ حضرت قربی کی شاعری کا بیشتر حصہ صوفیانہ کلام کا آئینہ دار ہے اور خواجہ درد کے اکثر کلام پر عشقیہ رنگ

غالب ہے۔ ہمارے اکثر نقادوں نے کلام درد کو ان کی عملی زندگی پر منطبق کرنے کے لیے خواہ مخواہ یہ مفروضہ گھڑ لیا کہ درد کا کلام صوفیانہ ہے حالاں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

چناں چہ مشہور و معروف محقق رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ "خواجہ میر درد صوفی تھے، صوفی شاعر نہیں تھے:

اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ صاحب کی زندگی صوفیانہ تھی مگر ان کی شاعری تصوف کی روایت کا حصہ نہیں تھی، وہ غزل کی اس طاقت ور روایت کا حصہ تھی جس کی بھرپور نمائندگی اس زمانے میں میر تقی میر کر رہے تھے، درد کی بعض غزلوں یں اور کچھ کچھ اشعار میں صوفیانہ خیالات کی جھلک موجود ہے (۵۹)۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی بھی اس خیال کے حامی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"خواجہ میر درد کے کلام کو مروجہ تنقیدی بیانات سے علیحدہ ہو کر اگر براہِ راست پڑھا جائے اور غور و خوض سے کام لیا جائے تو ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ ایسا ملے گا جس کا تصوف و معرفت یا توکل دقنا کے مسائل سے تعلق نہیں اور نہ ہی محبوبِ حقیقی یا مرشد کی محبت کا جلوہ ہے" (۶۰)۔

ڈاکٹر اعظمی کے علاوہ شمس الرحمن فاروقی بھی اس مفروضے کو غلط ثابت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تنقید کی دنیا میں بہت سی ایسی باتیں چل پڑتی ہیں اور زبان زد خاص و عام ہو جاتی ہیں جن کا فی الحقیقت کوئی وجود نہیں ہوتا۔۔۔۔ایسے ہی چند غلط فہمیاں درد کے بارے میں عام ہیں۔۔۔۔یعنی یہ کہ درد ایک صوفی شاعر تھے اگر اس کلیہ کو یوں بدل دیا جائے کہ درد ایک شاعر صوفی تھے تو شاید یہ بات حقیقت سے زیادہ قریب پہنچ جائے" (۶۱)

خواجہ درد کے بر خلاف حضرت قربی کا کاسہ۔ شاعری تصوف اور عشق حقیقی سے لبریز ہے اور یہ شاعری صوفیانہ کلام کے زمرے میں داخل ہوتی ہے۔ صوفیانہ کلام کیا چیز ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

"(۱) صوفیانہ شاعری میں قال سے زیادہ حال کی کیفیت ہوتی ہے (۲) صوفیانہ شاعری کا بنیادی پتھر اپنی ہستی کو کسی بلند تر ہستی میں ضم کرنے کی کوشش ہوتا ہے۔ اس کوشش کو ہم "وصول الی اللہ" کی کوشش کہہ سکتے ہیں اس میں عقل سے زیادہ جذبات یا دماغ سے زیادہ دل کی کار فرمائی ہوتی ہے (۳) صوفیانہ شاعری کا ایک اہم پہلو روح کو مادہ پر یا عدم کو وجود پر ترجیح دینا ہوتا ہے ۔۔۔۔ (۴) صوفیانہ شاعری میں حزن دیاس وخوف کا کوئی بنیادی عنصر نہیں ہوتا ۔۔۔۔ (۵) صوفی شاعر اپنے اور مقصود کے درمیان کسی مادی وسیلہ کو تسلیم نہیں کرتا" (۶۲)۔

حضرت قربی کے کلام میں صوفیانہ شاعری کی مذکورہ خصوصیتیں کافی حد تک پائی جاتی ہیں، مثال کے لیے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

فقر کی رہ کا اوہ ہے شہ قربی (وہ)   جو خدا کا بی (بھی) نا اچھے (اچھے) محتاج

خاشاک غیریت کا سب جل گیا ہے قربی   مجھ دل پہ جب اٹھایا ہے عشق کا لہب او (وہ)

شاہ جہاں وہی ہے نورِ عیاں وہی ہے   مقصودِ جاں وہ ہے عشاقِ بے نوا کا

جب وجودِ خدا کا سب ہے ظہور   غیر کا اعتبار نا کرنا

بے رنگ نورِ مولیٰ ، شیشے ہیں رنگ برنگی
اس رنگ سوں ہے بے رنگ پیلا ، ہریا و کالا
خدا ہے مصدرِ مطلق بندا بی اس سوں ہے مشتاق

جدھر دیکھو ادھر ہے حق ولے پندار مائل ہے
(لیکن)
خدا ہونا بی مشکل ہے ، بنداہو نا بی مشکل ہے
(بھی) (بندہ) (بھی)
سمجھتا ہے یو نکتے کوں جو عارف صاحبِ دل ہے
(یہ) (کو)

خدا نما جو ہوا میں تو کچھ نہیں ہے عجب
کہ ہر ذرا ہے جہاں میں خدانما اے دوست
(ذرہ)

جب موردِ عنایت مشتاق ہوئے گا
تب دل پو واردات کا ہو ویگانت درود

ہر اسم اسمِ یار ہے ، ہر ذات ذاتِ یار
ہر فعل فعلِ یار ہے یہ سر ہے بر صواب

حضرت قربی کی شاعری کا معتدبہ حصہ تصوف کے معرکہ آراء دقیق مسائل پر مشتمل ہے، چناں چہ وحدت الوجود، عینیت و غیریت، حال وقال وغیرہ مضامین آپ کے اشعار میں بڑی عمدگی سے بیان کیے گئے ہیں ۔ نبوت کے لیے درج ذیل متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

وحدۃ الوجود:

نہیں ہے غیر حق موجود جگ میں تجلی اس کی سارا انجمن ہے
ہے ظہور اس کا آسمان و زمین خاک ہور ، آب ہور ، آتش و باد
(اور) (اور)

اسم کوں عین مسمیٰ بول توں اور مسمیٰ عینِ کل اسما ہوا
(کو) (تو)

وہی زمین ہے وہی فلک ہے وہی پری ہے وہی ملک ہے
وہی (ہے) سورج وہی جھلک ہے وہی قمر ہو کو جھلملایا

ساقی شراب و جام و صراحی و مئ فروش
حق ، یقین سوں دیک بھی کیا مطرب درباب
(سے)(دیکھ)

بت کی عبادت کا خراں کرتے سو حق کو پوجتے
حق کا عبادت گاہ ہے کیا مسجد و کیا سومنات
کافر سمجھتا بت کی غیر اس واسطے معلوں ہوا
عاشق سمجھتا عینِ حق گرلات ہے گر ہے منات

عینیت و غیریت:۔

رہ وصل کی ہے دو قدم ایک عینیت یک غیریت
اس راہ میں سالک کوں نافرسنگ ہے نا میل ہے
جو غیریت عشاق میں ہے ، رمز او نابوج کر
(وہ)(نہیں سمجھ کر)

اخفش کی بکری کے نمن داڑی ہلانا ہے عبث
(کی طرح)

فطرت ہے عینِ دریا ، دریا ہے عینِ قطرہ
بھی دونوں غیر ہی ہیں ، نادر بوجہات پایا
(پھر بھی)

سارے مرابت داخلی پکڑے ہیں صورت خلق میں
کیا آسمان و کیا ز ، میں کیا جامد و حیواں ، نبات

حال و قال:۔

قال ہی عین حال ہے قربی یو سخن کر قبول ہے اشکال
قالِ صحیحِ عارفاں ، مضاح ہے اسرار کا
اس مرد کی صحبت میں رہ ، جس میں یو قال و قیل ہے
(یہ)

حضرت قربی نے تفنن طبع کی خاطر خالص عشقیہ اشعار بھی کہے ہیں ، جن میں تغزل کی عطر بیزی مشام جاں کو معطر کرتی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند

شعر پیش کیے جارہے ہیں:

تیری گلی ہے بہتر کعبہ سوں اسے مہد من
(اسے)

تیری گلی میں یو دل ہونے مجاور آیا
(یہ)

اس زلفِ مشک سا کا ہر تار مار دسنا
(نظر آتا ہے)

دل باندھنے کو اس میں نا نار سار کرنا

دل کی زمین میں برہ سوں کو داغ داغ قربی
عشاق کے چمن میں یوں لالہ کرنا

سیم کے چاند سے رخسار کے گوشہ میں مہوش کے
ستارے بتوں او موتی گوشوارے کے دہلک دستا
(وہ)

رقیب درسوں ترے مار کر چلاتا ہے
کبھی تو پیار سوں عاشق کیتیں بلا اے دوست
(سے) (کے لیے)

لب شیریں سوں کر صنم مرہم
تیر مژگاں کا دل ہوا مجروح

زر اگر تجہ کو نیں تو کیا قربی
(تجھ) (نہیں)
زرِ عشاق بس ہے یو رخِ زرد
(یہ)

ہے علامات عاشقاں قربی
اشک واآد ہور نوحہء نوح

ہے او نازک بدن کا دل الماس
(وہ)
کیا کروں نیں شکیب میرے پاس
(نہیں)

گلرخاں کا دیک رخ ہر دل ہوا ہے باغ باغ
(دیکھ)

کیا سبب لالے نمن دیتے ہیں میرے دل کو داغ

(لالہ، داغ مند)

حضرت قربی چوں کہ بنیادی طور پر ایک مصلح قوم اور معلمِ وقت تھے۔ اسی لیے آپ کے پیشِ نظر ہمیشہ ملت کی تعلیم و تربیت کا جذبہ اور اصلاحِ معاشرت کی ذمہ داریوں کا احساس رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے ہاں پند و نصیحت اور دانش و حکمت سے مزین اشعار دیدہ و دل کو مسحور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

نفسانیت کا دریا دریائے بیکراں ہے　　اللہ کی مددشوں کشتی کوں پار کرنا

آرسی بتوں یو دل کو کرنا صاف　　تن کے اوپر سنگارنا کرنا

(جیسے)　(یہ)

عرفاں بلا انساب ہے چاہے جسے دیوے خدا

قربی برہ کی راہ میں نیں کام آتا ہے نسب

(لینی)

اس شعر کو پڑھ کر حضرت ملا جامی کا یہ فارسی شعر فوری ذہن میں آتا ہے:

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی

کزدریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیز سے نسبت

دولت کو دولت بوج توں یک لت یہاں یک لت وہاں

(لات)

اہلِ دول کی زندگی جاتی ہے لت میں دین رات

(دولت مند)

تکریمِ صبح کر، برکات اس من ہیں بہوت

(بہت)

عشاق سب ہوئے ہیں مکرم علی الصباح

صلحِ کل ہے جنگ کرنا سرکش سوں مدام
(سے) ہمیشہ
تو خلائق سوں عبث رکھتا ہے اسمِ صلحِ و جنگ
(سے)

آپ کو فن پر بھرپور دسترس حاصل تھا، آپ کے یہاں صناع و بدائع کی کمی نہیں ہے۔ اشعار میں سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ فارسی تراکیب کی وجہ سے بعض جگہ اور نکھار آگیا ہے۔ تاثیر میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کے دیوان سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں، ملاحظہ ہوں:

تشبیہات و استعارات:

زلفِ ٹہنی میں دسیامہہ کا نول رخسارہ
(شاخ) (نظر آیا) (کی مانند)
شب میں خورشید نہاں تھا مجنے معلوم نہ تھا
(مجھے)

انچل نکال رخ پو تے اے ماہِ مہر تاب
(پر) (سے)
خورشید سے یو رخ پہ ترے خوش نہیں نقاب
(یہ) (جیسے)

بولنے کو ترانہء توحید تن ہی طنبور ہے، زبان مضراب
علم ظاہر ہے پوست کے مانند (کی) علم باشہ جانِ لبِ لباب
سلگا ہوائی آہ کی، کر اشک ریزی پھلجھڑی
مہتاب کر انوارِ دل، عشاق کی ہے شبِ برات
عشق کی رہ میں عقل یوں ہے ضعیف
جیوں کو پنجے میں باز کے دراج
(تیتر)

جب اقارب ہیں عقارب اجنبی ہے اژدہا

توں یو سب کوں چھوڑ، ہو دریائے وحدت کا ہنگ
(تو) (یہ) (کو) (مگرمچھ)

یاقوت ترے لب کا ہے لعلِ بدخشانی
دنداں کے جِلا آو پر الماس ہے قربانی
تجھ مکھ کی ملاحت سوں ۔ تجھ لب کی فصاحت سوں
(تیرے چہرے) (سے) (سے)
حیرت میں سدا گم ہیں صد دلبرِ کنعانی

سمج اصطلاحِ عارفاں ، سب چیز ہے سب چیز میں
(سمجھ)
ذرے منے خورشید ہے قطرے میں رودِ نیل ہے
(میں)

تلمیحات:۔

مئے کے پینے سے مت کرو پرہیز
اتقوااللہ یا اولی الالباب

کلام بیچہ علی العرشِ استویٰ آیا
ہر ذرے کوں یہی عرش و استوائی اے دوست
(کو)

جب کہے " العلم ستر اعظم
علم جو پردا ہے او سکنا عبث
(وہ) (سیکھنا)

تعلی:۔

اے محرم خدائی یک ذرہ غور کر دیک
(ذرا) (دیکھ)
نکتے بھرے ہیں نیہہ کے ، قربی کے ہر سخن میں
(عشق)

فارسی تراکیب:۔

وہی ہے گلشنِ ہستی میں مالی اس کی قدر کا
گلِ تر وجہ گلِ رخ کا ، صنوبر قد دلادرا کا
اسی کی حمد میں دائم زباں بھرتی ہے عالم کی
اگرچہ کوئی ثنا کہتا ہے ماہِ مہر سیما کا
عبادت میں اسی کے ہیں سبھی ذرات عالم کے
(کی) (سبھی)
اگرچہ کوئی کیا پوجا بتِ بی دست و بی پاکا
(بے) (بے)
قربی تو ہے نوا ہے ، دل میں تری ہوا سے
(تیرے)
قرباں ترا ہوا ہے دے قرب اس خدا کا
نگہ بجۂ لطف کے دل دار عینِ جان نوازی ہے
(کی)
اگرچہ قتل میں عاشق کے خنجر پر پلک دستا
تدبیر تو کرتے ہیں تقدیر خدا دینا
دارو بھی کھلاتے ہیں تاثیر خدا دینا

آپ چوں کہ ایک حساس شاعر اور صاحب بصیرت فن کار تھے۔ اس لیے آپ کے کلام میں عصری حسیت کا پایا جانا غیر فطری محسوس نہیں ہوتا ہے۔ بطور ثبوت درج ذیل اشعار دیکھیے:

ہر میر جو آتا ہے عالم پہ ستم کرنے
عالم پہ کرم کرنے کوں میر خدا دینا

حضرت قربی کے عہد میں آرکاٹ کے نواب سعادت اللہ خاں (متوفی ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء) کے برادر زادے نواب باقر علی خاں (متوفی ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) کا لڑکا نواب رضا خاں قلعہ دار ویلور تھا۔ وہ بڑا ظالم و جابر تھا، اس نے بہت سے غریبوں کے گھر ڈھا

دیے تھے، اس وقت آپ نے بطور پیشن گوئی یہ شعر کہا تھا:

غریباں فقیراں کا توڑیا ہے سایہ
(ڈھایا)

رضا خاں کی دولت کا تٹتا ہے پایہ
(ٹوٹتا)

چناں چہ اس کے بعد چند ہی دنوں میں اس کے بھائی نواب مرتضیٰ علی خاں نے اس کو بے دخل کر کے ویلور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا (۶۴)۔

مرہٹہ سردار مراری راؤ نے ویلور پر حملہ کرنے کی غرض سے ویلور کے قریب اپنا پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ شہر کے لوگ مرہٹہ فوج کا ظلم و ستم سن چکے تھے اس لیے بے حد خوف زدہ ہو گئے مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بعض ناگزیر حالات کے تحت مراری راؤ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس واقعہ پر اظہارِ اطمینان فرماتے ہوئے حضرت قربی نے درج ذیل شعر کہا تھا (۶۵):

خدا کا کرم سب پہ حاوی ہوا مراری تو آخر فراری ہوا

کلامِ قربی کی گوناگوں خصوصیات کے پیشِ نظر علامہ باقر آگاہ نے دیوان قربی پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے تحریر کیا کہ "اک دیوان است کہ بسیارے او حقائق و معارف دراں درج کردہ و مع ذلک محتوی علیٰ انواعِ البلاغتہ ولصنائع و مشتمل" علیٰ اصناف العصاحتہ والبدائع" (۶۶)

یعنی (حضرت قربی کا) ایک دیوان ہے جس میں بہت سے حقائق و معارف درج کیے گئے ہیں اور وہ انواعِ صنائع و بدائع اور اقسام فصاحت و بلاغت پر مشتمل ہے۔

پروفیسر سید فضل اللہ نے مقدمہ۔ دیوان قربی میں لکھا ہے کہ آپ نے ولی اورنگ آبادی (وفات غالباً ۱۱۳۸ھ) کی پیروی کی اور ولی کی زمینوں میں غزلیں کہیں۔ اس ضمن میں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ولی دکنی کے تین ادوار ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر

جمیل جالبی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارقام کیا ہے کہ " صغیر بلگرامی نے ولی کے اشعار کو زبان کے لحاظ سے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے، پہلی قسم میں وہ اشعار دیے گئے ہیں جو خالص اس وقت کی زبان میں ہیں اور جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، دوسری قسم میں وہ اشعار دیے گئے ہیں جن کے لفظوں کی تبدیلی سے اس وقت کی زبان بن سکتی ہے اور تیسری قسم میں وہ اشعار دیے گئے ہیں جو بالکل اس وقت کی زبان اور تراکیب کے معلوم ہوتے ہیں " (۶۷)۔

حضرت قربی نے ولی دکنی کے کلام اول کا تتبع کیا ہے نہ کہ ثانی یا ثالث کا، جیسا کہ درج ذیل مثالوں سے واضح ہوتا ہے:

ولی: وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتشِ عشق پڑا عقل کے سامان میں آ

قربی: ماہِ من شمع نمن دل کے شبستان میں آ
نور دیدہ ہو مری چشم کے ایوان میں آ

ولی: بو تل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے چاہِ زم زم کا اثر دستا

قربی: تجے دل میں اپس کے دیکھ دل بر کا جھلک دستا
یقین سوں کفر و ایمان میں تو مل کر ہور الگ دستا

الغرض بقول ڈاکٹر احتشام ندوی "اردو شاعری میں تصوف کی پاکیزگی اور اس کے اعلیٰ مسائل کو آشنا کرنے میں حضرت قربی قدس سرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ آپ کے دیوان کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں انھوں نے کس طرح پوری غزلوں کو عشق خدا اور تصوف کی مختلف واردات و کیفیات میں رنگ کر پیش کیا ہے " (۶۸)۔

ڈاکٹر سلطانہ بخش کی اطلاع کے مطابق حضرت قربی نے دکنی صنف سخن " درسنی " میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ " درسنی " کی تعریف کرتے ہوئے موصوفہ نے لکھا

کہ " درسنی " کی بحر دراصل مثنوی کی ایک مرعوب بحر ہے جس کو شعرائے دکن نے اختیار کیا اور اس کا نام " برہنی یا درسنی " رکھا۔ درسنی میں پانچ مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور مزید دو مصرعوں میں دوسرے قافیہ کا التزام رکھا جاتا ہے اور ان دونوں مصرعوں کی تکرار ہوتی ہے۔ درسنی کے رنگ و آہنگ پر تصوف و معرفت اور عشق و محبت کا ایسا اثر غالب ہوتا ہے جس کی لطافت اور رنگینی پر اثر ہوتی ہے " (۶۹)۔

ڈاکٹر صاحبہ نے اس کے بعد حضرت قربی کی " درسنی " کا ایک شعر بھی نموناً پیش کیا ہے۔ وہ شعر درج ذیل ہے:

میں پیوں میں اپس کو فنا کری میں مرنے کے اگچ مری

بہرحال حضرت قربی کے کلام کی سادگی، بیان کی وارفتگی اور اظہار خیال کی شگفتگی نے اپنے تمام معاصرین میں انھیں ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ مسائل تصوف اور اسرار و رموز کو آپ نے اپنے اشعار میں جس والہانہ انداز اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اردو کی صوفیانہ شاعری میں خاصے کی چیز ہے، جس کی وجہ سے تاریخ ادب اردو میں آپ کا نام زندہ رہے گا۔

حواشی

۱- The early history of the Deccan by Dr Ghulamyazdani P.5 Printed on 1960 A.D. Oxford University Press London

۲- پنجاب میں اردو ص ۷۴ از محمود شیرانی مطبوعہ ۱۹۸۲ء اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

۳- ادبیات میسور ص ۵ مرتب پروفیسر میر محمود حسین مطبوعہ ۱۹۷۱ء اردو لائبریری سنٹر، بنگلور

۴- دکنی ادب کی تاریخ ص ۱۰ از ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ ۱۹۵۸ء ناشر یک ایم یو ایم اردو بازار دہلی

۵- " اردو غزل منزل بہ منزل " ص ۹۲ از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ماخوذ۔ از " سابر نامہ " مطبوعہ ۱۹۸۵ء گجرات ساہتیہ اکاڈمی گاندھی نگر۔ گجرات۔

۶- سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے ص ۱۰ از ڈاکٹر حسینی شاہد مرحوم مطبوعہ ۱۹۷۳ء انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش

۷- "اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" ص ۴ از بابائے اردو مولوی عبدالحق مطبوعہ ۱۹۸۸ء انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر نئی دہلی۔

۸- "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) ص ۴۱-۴۲ از ڈاکٹر جمیل جالبی (مطبوعہ ۱۹۸۹ء) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

۹- رویداد مدرسہ لطیفیہ حضرت مکان ویلور مطبوعہ ۱۳۱۱ھ ص ۳۱

۱۰- "ضمیمہ جواہر السلوک" ص ۲۶۰ ص ۲۶۳ از حضرت مولانا سید شاہ محمد صاحب ہمشیرزادہ حضرت قطب ویلورؒ مطبوعہ ۱۲۸۳ھ در مطبع مظہر العجائب مدراس۔

۱۱- مثنوی مطلع النور ص ۶ از حضرت مولانا شاہ عبدالحی احقر بنگلوری۔ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ در مطبع محمدیہ بنگلور۔

۱۲- تاریخ دکن ص ۵۹۸ از مولانا عبدالغفور خاں رام پوری مطبوع در مطبع مفید عام آگرہ۔

۱۳- انوار اقطاب ویلور ص ۱۲ از مولانا محمد طیب الدین اشرفی مونگیری، سابق مدرس مدرسہ لطیفیہ حضرت مکان ویلور مطبوعہ ۱۹۶۳ء در مطبع قومی پریس بنگلور۔

۱۴- عربک اینڈ پرشیئن ان کارناٹک ص ۱۱۵ از مولانا محمد یوسف کوکن عمری سابق صدر شعبہ عربی فارسی اور اردو مدراس یونیورسٹی مدراس مطبوعہ ۱۹۷۴ء در مدراس

۱۵- ایضاً ص ۱۱۵

۱۶- ایضاً ص ۱۱۵

۱۷- مثنوی مطلع النور ص ۶

۱۸- انوار اقطاب ویلور ص ۱۷

۱۹- مثنوی مطلع النور ص ۶

۲۰- مقدمہ دیوان حضرت قربی ص ۱۰ پروفیسر سید فضل اللہ مطبوعہ ۱۹۶۴ء از اعجاز پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد

۲۱- سالنامہ اللطیف ویلور شمارہ میں ۲۵ اقطاب ویلور نمبر ص ۳۲ مؤلف مولانا بشیرالحق لطیفی ادھونی مطبوعہ ۱۹۸۴ء در بنگلور

۲۲- انوار اقطاب ویلور ص ۲۱

۲۳- عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۱۲۲

۲۴- قطب مدراس ص ۱۵ از جناب کاوش بدری مطبوعہ ۱۹۸۳ء مجلس اہل راز مدراس

۲۵- خلاصہ العرفان ص ۲۸ ماخوذ از مجموعہ رسائل قربی ۲۴/ نومبر ۱۹۶۶ء قومی الکٹرک پریس بنگلور

۲۶- مقدمہ دیوان قربی ص ۲۰ از پروفیسر سید فضل اللہ صاحب [illegible] قربی ص ۸ از مولانا یوسف کوکن عمری (مطبوعہ غالباً ۱۹۶۰ء) در مدراس

۲۷- اللطیف ۱۴۰۴ھ اقطاب ویلور نمبر، ناشر دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور ص ۳۵

۲۸- تذکرۂ گلزارِ اعظم ص ۸ از نواب محمد غوث خاں بہادر متخلص بہ اعظم مطبوعہ ۱۲۷۲ھ در مطبع سرکاری مدراس

۲۹- مقدمہ۔ دیوان تراب ص ۴۷ از ڈاکٹر سلطانہ بخش مطبوعہ ۱۹۸۳ء انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان

۳۰- تذکرۂ گلزارِ اعظم ص ۲۶۵

۳۱- ایضاً ص ۳۵۶

۳۲- روئیدادِ مدرسہ۔ لطیفیہ بابت ۱۳۱۱ھ ص ۳۲

۳۳- انوارِ اقطابِ ویلور ص ۲۶

۳۴- ایضاً ص ۴۸

۳۵- ایضاً ص ۳۵

۳۶- ایضاً ص ۳۹

۳۷- ضمیمہ۔ جواہر السلوک ص ۲۶۲

۳۸- "گلدستہ۔ کرناٹک" از رائق مدراسی مرقومہ ۱۲۵۵ھ بہ تاریخ نہم ماہ صفر۔ مخطوطہ کتب خانہ۔ رحمانیہ، دیوان صاحب باغ مدراس، مخطوطہ نمبر ص ۹۷

۳۹- تحفہ۔ احسن از حضرت باقر آگاہ۔ بحوالہ۔ "سخن وران ویلور" مرتب ڈاکٹر مظفر شہ میری مطبوعہ ۱۹۸۹ء اسلامیہ کالج وانیم باڈی (شمالی آرکاٹ)

۴۰- مدراس میں اردو کی نشو و نما از ڈاکٹر افضل الدین اقبال ص ۱۲۵

۴۱- فہرست اردو مخطوطات جلد اول از نصیرالدین ہاشمی ص ۱۸۵ نمبر سیر (۱۸۰) مخزونہ۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ۔ آصفیہ) حیدر آباد مطبوعہ بار اول ۱۹۶۱ء

۴۲- (فہرست اردو مخطوطات جلد اول از نصیرالدین ہاشمی ص ۱۸۳-۱۱۶ نمبر سیر (۱۸۰) مخزونہ۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ۔ آصفیہ) حیدر آباد مطبوعہ بار اول ۱۹۶۱ء)

۴۳- فیضانِ رحمت (سوانح حیات حضرت الحاج سید رحمت اللہ نائب رسول اللہؐ رحمت آباد۔ نیلور ص ۸ مرتبہ، سید یوسف حسینی نور القادری مطبوعہ ۱۴۱۱ھ انجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد

۴۴- اللطیف ۱۴۰۴ھ اقطاب ویلور نمبر ص ۴۸ مضمون تذکرۂ اقطاب ویلورؒ مؤلفہ مولوی حافظ بشیرالحق قریشی

۴۵- "دکنی چکی ناموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" (غیر مطبوعہ) ص ۱۶ از محمد نسیم الدین فریس ریسرچ اسکالر

۴۶- مقدمہ۔ دیوانِ قربیؔ ص ۳۰

۴۷- تامل ناڈو میں اردو کی ادبی تاریخ از جناب کاوش بدری ماخوذ از "آج کل" نئی دہلی جون، جولائی ۱۹۷۷ء تامل ناڈو نمبر ص ۵۱

۴۸- تعلیقات حدیقۃ المرام از جناب افسر صدیقی ص ۹۱، طبع اول ۸۲-۱۹۷۹ء، ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان

۴۹- "اکتساب نظر" ص ۷۱ از راہی فدائی مطبوعہ ۱۹۹۱ء، کتب خانہ عزیزیہ، اردو بازار، دہلی

۵۰- "کڑپہ میں اردو" ص ۱۹ از ظہیر احمد باقوی راہی فدائی۔ مطبوعہ ۱۹۹۲ء - تامل ناڈو اردو پبلی کیشن، مدراس،

۵۱- مقدمہ دیوان تراب ص ۴۱

۵۲- فہرست اردو مخطوطات جلد دوم اسٹیٹ سنٹرل لائبریری- حیدرآباد ص ۲۳۴

۵۳- رسالہ "قربی" ۱۱-۲ از محمد یوسف کوکن عمری ایم - اے ریڈر شعبہ عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی مطبوعہ غالباً ۱۹۶۱ء در مدراس -

۵۴- کڑپہ میں اردو- ص ۴۵ اور ۱۰۲

۵۵- مقدمہ دیوان قربی ص ۲

۵۶- مقالہ- خواجہ میر درد از ڈاکٹر جمیل جالبی ماخوذ از "خواجہ میر درد "تنقیدی و تحقیقی مطالعہ" ص ۲۸۲- مرتبین جناب ثاقب صدیقی و جناب انیس احمد مطبوعہ ۱۹۸۹ء دہلی -

۵۷- ایضاً ص ۲۶۴

۵۸- "تصوف اور کلام قربی" ص ۱۴۱ اور ص ۶۸ از پروفیسر نجم الہدیٰ مطبوعہ ۱۹۸۴ء پٹنہ (بہار)

۵۹- "خواجہ میر درد تنقیدی و تحقیقی مطالعہ" ص ۱۶۹

۶۰- ایضاً ص ۲۱۹

۶۱- ایضاً ص ۱۷۹

۶۲- ایضاً ص ۱۸۰

۶۴- سال نامہ اللطیف ۱۴۰۴ھ ص ۳۷

۶۵- ایضاً ص ۳۷

۶۶- ایضاً ص ۴۶

۶۷- تاریخ ادب اردو جلد اول (قدیم دور) از ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ ۱۹۸۹ء دہلی ص ۵۵۱

۶۸- اللطیف (سال نامہ) ویلور ص ۱۴۸ مطبوعہ ۱۳۸۸ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

۶۹- مقدمہ- "دیوان تراب" ص ۶۱

حضرت ذوقی ویلوری

حضرت ذوقی کا اسم گرامی غلام محی الدین سید شاہ عبد اللطیف قادری (ثانی)اور تخلص ذوقی ہے۔آپ حضرت شاہ ابوالحسن قربی ویلوری (۱۱۱۸ھ ۱۱۸۲ھ) کے اکلوتے صاحب زادے ہیں، آپ کی ولادت ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں شہر ویلور کے اپنے آبائی مکان میں ہوئی۔" رخشاں " سے آپ کا سن ولادت برآمد ہوتا ہے، بچپن میں آپ کی طبیعت تعلیم کی طرف راغب نہیں تھی۔آپ نے اپنی مختصر سوانح انشائے لطف الٰہی اور مثنوی " عشق نامہ " کے آخر میں لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے سات ۷ سال کی عمر میں قرآن مجید پڑھنا شروع کیا، تین سال بعد یعنی آپ جب دس سال کے تھے تو اپنے والد ماجد کے زیر نگرانی گلستان اور بوستان پڑھی ۔ بعد ازاں عربی صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی مگر تھوڑی ہی مدت میں اس سے جی بھر گیا تو تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔آپ جب گیارہ سال کے ہوئے تو اپنے والد ماجد کے ہمراہ اس وقت کے ایک مستجاب الدعوات بزرگ شیخ ناصر الدین رانی پیٹی قدس سرہ، کی بارگاہ میں حاضر ہوئے حضرت شیخ نے آپ کو بڑی شفقت و محبت سے اپنے قریب بٹھایا، علم وفضل کی ترقی کے لیے دعا کی یہ اور یہ پیشن گوئی کی کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ اپنے معاصرین میں فائق و ممتاز ہوجائیں گے۔ حضرت ذوقی پندرہ ۱۵ سال کے ہوئے تو فنون حرب کی طرف متوجہ ہوئے۔پہلوانی اور تیراندازی میں کامل مہارت حاصل کی، اسی دوران آپ نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ کوئی اجنبی شخص آپ سے کہہ رہا ہے کہ حضرت شیخ نظامی گنجوی سے آپ نے ملاقات کی ؟آپ نے عرض کیا کہ حضرت شیخ کہاں ہیں ؟ اس نے جواب دیا کہ فلاں مقام پر خیمہ میں جلوہ افروز ہیں ۔ حضرت ذوقی اس طرف دوڑ پڑے اور شیخ نظامی کی خدمت میں پہنچ کر قدم بوس ہوئے ۔ حضرت شیخ نے آپ کی طرف نظر شفقت فرمائی اور متبسم ہوئے ، دفعتاً حضرت ذوقی کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ حضرت شیخ ہی سے " سکندر نامہ " کی تعلیم حاصل کی جائے۔اس خیال

کے تحت فوراً آپ نے کتاب لاکر حضرت شیخ نظامی سے انہیں کی معرکہ آرا مثنوی "سکندر نامہ" کا درس لیا۔ صبح خواب سے بیدار ہوئے تو اپنے والد بزرگوار حضرت قربی سے خواب کا تذکرہ کیا تو حضرت قربی نے فرمایا کہ جاؤ، اسی وقت مذکور کتاب لے آؤ۔ چناں چہ آپ کتاب کے ساتھ حاضر ہوئے۔ حضرت قربی نے درس دینا شروع کیا، تو ذوقیؒ پر اشعار کے معانی و مطالب اور اس کے رموز و حقائق خود ہی ذہن و دل پر نقش ہوتے جارہے ہیں۔ آپ نے حضرت قربی سے اس سال فارسی کی کتب متداولہ مثلاً سکندر نامہ، خسرو شیریں، مخزن الاسرار، قران السعدین، تحفتہ العرقین اور قصائد خاقانی وغیرہ کی تکمیل کرلی۔ حضرت ذوقی اپنے والد سے روزانہ ایک سو ۱۰۰ شعر پڑھتے تھے جو اسی وقت حافظہ میں محفوظ ہوجاتے۔ اس کے بعد آپ میں علم وہبی کی وہ کرشمہ سازیاں دکھائی دینے لگیں کہ عقل و فہم انگشت بہ دنداں رہ جاتیں کہ ایں چہ بوالعجبی است!! چناں چہ آپ کے ہم سبق ہم بدلی اور آپ کے اولین تذکرہ نگار حضرت علامہ باقر آگاہ (۱۱۵۸ھ - ۱۲۲۰ھ) "تحفتہ الاحسن میں رقم طراز ہیں:

"استیفائے کتب متداولہ فارسیہ و بعضے نسخ عربیہ از والد بزرگوار خود کردہ اند، ذہن وقا و طبع نقاد دارند بعد ازاں تدرس علم صرف ونحو و بعضے علوم معقول از " عظیم الدین داماد جعفر صاحب طالب العلم " کردہ اند و بسبب جودت طبع ایشاں را بر مطالعہ۔ کتب قوت و ملکہ تمام پیدا شد، حتیٰ کہ بر بعض علوم مثل قواعد عروض و قوانی و علم حساب و فن شعر از قوت مطالعہ مہارت نام پیدا کرد خصوصاً شعر یگانہ۔ روزگار بودند" (۱)۔

حضرت ذوقی کے ایک اور شہرت یافتہ تذکرہ نگار مولانا شاہ عبدالحی احقر بنگلوری اپنی مثنوی "مطلع النور میں تحریر کرتے ہیں:

جودت طبع جب تھی اس کی رسا — اور تھا تیز اس کا فہم و ذکا
ہوا مائل مطالعے کی طرف — تھوڑے مدت میں ہی وہ کان شرف
عربی معتبر کتب یہ تمام — ہوا حاوی بفضل رب انام

علمِ منقول اور فنِ معقول　　اور علم فروغ اور اصول
سب پہ قادر کیا اسے قادر　　ہوا ہر فن میں وہ بڑا ماہر
اور تصوف کے سب رموز و دقیق　　اپنے والد سے کرچکا تحقیق
ہوا یکتا دلیل و برہاں میں　　اور کشف و شہود و عرفاں میں
اور فکر سخن میں اے دم ساز　　وقت میں اپنے سب سے تھا ممتاز
اس کا کوئی کچھ عدیل نہ تھا　　کوئی اس ملک میں مثیل نہ تھا
بسکہ اس فن میں وہ گرامی تھا　　ثانی و جامی و نظامی تھا
یہ نہیں ہے مبالغہ اے یار　　واقعی ہے یہ بات تکرار (۳)

حضرت ذوقی نے علومِ ظاہری کی تحصیل اپنے والد بزرگوار کے علاوہ اس وقت کے مشہور معلم اور باکمال استاذ حضرت شیخ مولانا عظیم الدین سے کی جیسا کہ پیش ازیں ذکر کیا گیا تھا۔ بعد تکمیل علوم منقول و معقول آپ نے اپنے والد ماجد حضرت قربی قدس سرہ، کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور جملہ منازل سلوک طے کرنے کے بعد ننانوے سلاسل طیبہ میں اجازت و خلافت سے سرفراز کیے گئے۔ آپ کو اپنے والد و پیر و مرشد سے بے انتہا محبت و عقیدت تھی جس کا اظہار آپ نے اپنی تصانیف میں بارہا کیا ہے۔

حضرت ذوقی نے اپنے وقت کے قطب اور نامور صوفی تھے۔ آپ کے متبعین و معتقدین میں امراء و فقراء، اغنیاء و غرباء، علماء و جہلا سبھی شامل تھے۔ آپ نے نہ کسی رئیس کے روبرو دستِ سوال دراز کیا اور نہ کسی مسائل کو خالی ہاتھ لوٹایا، ایک طرف آپ نے اپنے معتقد نواب والاجاہ (متوفی ۱۲۱۰ھ) کے پروانہ۔ جاگیر کو نذرِ آتش کردیا تو دوسری طرف آپ نے اپنے دستِ کرم سے دو لاکھ سے بھی زاید رقم محتاجوں اور ناداروں میں تقسیم کی۔ جیسا کہ حضرت عبدالحیؒ واعظ بنگلوری فرماتے ہیں:۔

اور امراء واغنیاء سے سدا　　تھا بچہ کمال بے پروا
اور جاگیر یومیہ اے یار　　نہ قبولا ملوک سے زنہار
اور نواب چوتھا والا جاہ　　صاحبِ تخت و ملک و فوج و سپاہ
لا کیا نذر اس کے ای دانا　　ایک جاگیر کا ہے پروانا

اس کو وہ شمع پر جلایا ہے　　　اور یہ سخن زباں پر لایا ہے
ہووے پروانہ شمع پر سوزاں　　　ہو نواب دیکھ کر حیراں
گرچہ تھا بے معاش ایسا ہاں　　　پر تو کل میں تھا جلیل الشاں
اور تھا بحرجو دوکانِ کرم　　　اور ابرِ نوال تھا ہردم
سائلیں سے سمجھ کسی کو بھی　　　نہیں محروم وہ کیا ہے کبھی
نقد دو لکھ روپے سے بھی زیاد　　　سائلوں کو دیا وہ پاک نہاد
مستحقوں سے دور کرنے رنج　　　یک صد و بیست و پنج سیر برنج
اس کی لنگر میں جانیے ہر روز　　　ہوتے تقسیم ای شرف اندوز
بس گذارا ہے یوں ہی عمر تمام　　　اس کا کافِل سدا تھا رب انام (۳)

حضرت ذوقی چوں کہ علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ پیراستہ تھے۔ اس لیے آپ اپنے والد بزرگوار کے طریقہ، کار کے مطابق تشنہ گان علم و عرفان کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ فیض یاب و سیراب کرتے رہے۔ آپ نے اپنی تصنیف "انشائے لطف اللہی میں بعض تلامذہ کے نام گنوائے ہیں جو آپ سے فیض یاب ہونے کے بعد مشاہیر علم و فضل کی حیثیت سے نامور ہوئے۔ حضرت قربی کے مذکورہ تلامذہ ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) محمد تقی دلوی (۲) غضنفر علی جہروی (۳) زین العابدین حروی (۴) علی اصغر دوانی (۵) میر باقر (۶) محمد حیدر خطیب (۷) محمد ضیاء الدین (۸) محمد مظہر علی (۹) حسن علی (۱۰) محمد سعید جودھری (۱۱) محمد مخدوم مہکری (۱۲) غلام احمد میلاپوری (۱۳) عظیم الدین توندوری (۱۴) بڑے صاحب چیدہ (۱۵) محمد غوث (۱۶) عبد القادر (۱۷) حسن علی چیدہ (۱۸) نور الدین (۱۹) ابن محمد اویس (۲۰) میر حسن (۲۱) محمد سلیم (۴)۔

حضرت ذوقی کا نکاح شیخ عبد العلی بیجاپوری رحمتہ اللہ علیہ کی دختر فرخندہ سیر سے ہوا جن سے ایک ہی لڑکا ہوا جو آگے چل کر سید شاہ ابو الحسن قادری محوی کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ آپ کے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، آپ نے براہ راست حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ، حضرت

نظامی گنویؒ اور حضرت مولانا رومیؒ کی ارواحِ مبارک سے فیضِ باطنی حاصل کیا جس کا اقرار خود آپ نے "انشائے لطف الٰہی" میں جا بجا کیا ہے۔

حضرت ذوقی کی ایک تاریخی کرامت کا ذکر مثنوی مطلع النور میں کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اور نواب بندر مدراس — بھیجا ہے اک عریضہ شیخ کے پاس
(نواب والاجاہ)
کہ میں رکھتا ہوں اے نکو محضر — قصدِ تسخیر ملک تنجاور
اگر امید فتح و نصرت ہو — آپ کی گر مجھے اجازت ہو
تو سفر کر یہاں سے جاؤں گا — ورنہ میں اس سے باز آؤں گا
شیخ تب اس کو یہ جواب لکھا — کہ تو جا، فتح دیوے گا مولا
متفکر ہو تب کئی احباب — شیخ سے یوں کہے ہیں عرض جناب!
حاکم فوجِ ملک تنجاور — جنگ میں سخت تر ہے اے رہبر!
نہیں معلوم ہووے گا کیا حال — کیا ارشاد تب وہ با اجلال
جانیو تم! بشہر تنجاور — قبر ہے اک بزرگ کی اشہر
خواب میں میرے وہ بزرگ نے آ — مجھ کو اس طرح سے ہے فرمایا
کہ یہ قلعے کی کیلیاں تا حال — تھے بلا شبہ میرے پاس بحال
حکم مجھ کو ہوا اب بے قیل — کہ کروں ان کو آپ کی تحویل
کیلیاں پس وہ دے کے میرے ہاتھ — وہ روانہ ہوا خوشی کے ساتھ
میں نے نواب کو اسی خاطر — فتح کی دی بشارتِ فاخر (۵)

حضرت ذوقی کی بشارت کے مطابق نواب کرناٹک والاجاہ کو تنجاور کی جنگ میں راجا کے مقابلہ میں باآسانی فتح نصیب ہوئی۔

حضرت ذوقیؒ کی بعض تحریروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نواب حیدر علی خاں (بہادر ۱۱۹۶ھ) کے فتوحاتِ رزم گاہی اور خوش بختی و سعادت مندی میں آپ کے

روحانی تصرف اور تائیدِ غیبی و دعائے سحر گاہی کا عمل دخل ہے۔ چناں چہ آپ نے "انشائے لطف الٰہی" میں ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

"میں نے خواب میں دیکھا یہ ضعیف ایک گز چوڑی دیوار پر بیٹھے ہوئے نماز ادا کر رہا ہے اور کم زوری کی وجہ سے ٹھیک بیٹھا بھی نہیں جارہا ہے بلکہ گر پڑنے کا اندیشہ لاحق ہے۔ ایسے میں اس فقیر کے پہلو میں جلوہ افروز ہو کر ارشاد فرما رہے ہیں، اسی مقام پر نماز مکمل کر لو۔ فقیر نے حسب ہدایت نماز تمام کی۔ اس کے بعد دیکھا کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم خون سے لبریز پیالہ فقیر کے روبرو کر رہے ہیں اور ارشاد فرما رہے ہیں کہ یہ کافروں کا خون ہے۔ صحابہؓ نے انھیں بڑی جان فشانی سے قتل کیا ہے۔ بعد ازاں خواب سے بیدار ہوا۔ ان دنوں دشمن کی قوت سے لوگ حیران تھے کہ اچانک یہ خوش خبری ملی کی دشمن دفع ہو چکا اور پھر سے حیدر علی کو غلبہ حاصل ہوا" (۶)

حضرت ذوقیؒ نے اپنی وفات سے تیرہ دن پیش تر یہ پیشن گوئی کی آج سے ٹھیک تیرہ دن بعد اس ملک کا قطب دنیا سے اٹھالیا جائے گا اور اس کے تین دن بعد قلعہ ویلور پر گولہ باری ہوگی۔ جب ٹھیک تیرہ دن بعد ۱۳ / رجب ۱۱۹۴ھ کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور آپ کی وفات کے ٹھیک تین بعد قلعہ ویلور پر نواب حیدر علی خاں نے چڑھائی کی اور قلعہ پر گولہ باری ہوئی تو لوگوں نے یقین کر لیا کہ قطبِ زماں سے مراد آپ کی ذات بابرکت تھی۔ چناں چہ حضرت مولانا عبد الحئیؒ نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

ہے روایت کہ اپنے پیش وصال	دفعتاً ایک دن وہ صاحبِ حال
حاضروں سے کہا ہے اے لوگو	بات ایک بولتا ہوں یاد رکھو
قطب اس ملک کا بہ حکم خدا	تیرھویں دن اٹھے گا از دنیا
تین دن اس کے بعد غیر قصور	چلی گولی بہ قلعہ ویلور

جانو ، ماہِ رجب کے روز ہلال　　یہ دیا تھا خبر وہ ذوالاجلال
تیرھویں کو رجب کے وہ اکرم　　کیا رحلت یقیں ازیں عالم
بعد سہ دن بہادر آیا ہے　　گولی قلعے اوپر چلایا ہے
سمجھے لوگوں نے تب بغیر گماں　　کہ بلا شک وہی تھا قطب زماں (۷)

حضرت ذوقی مسلسل تین سال بیمار رہ کر چوالیس سال کی عمر میں جاں بحق ہوگئے۔ مزارِ شریف حضرت قربی کے پہلو میں واقع ہے۔ آپ کے یارِ غار علامہ آگاہ نے قطعہ تاریخ کہا ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے۔

تاریخ رحلتش چو طلب کردم از سروش　　گو ہم دم حکیم نظامی ندا رسید

۱۱۹۴ھ

فراغت تعلیم کے بعد سے مرضِ الموت تک کی تقریباً بیس سالہ مدت میں آپ نے بہت سارے ایسے تاریخی کارنامے انجام دیے جس کی نظرو مثل ملنی واقعتاً ممکن نہیں ہے، بہ قول افضل العلماء مولانا حافظ محمد یوسف کوکن:

> "حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوقی رحمتہ اللہ علیہ ان اربابِ علم وفضل و کمال میں سے ہیں جن پر جنوبی ہند بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ وہ بیک وقت زبردست عالم و فاضل، عارف کامل اور بے مثال شاعر اور نثر نگار تھے۔ زود نویس اور بدیہہ گوئی میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا نظم بھی اس تیزی سے لکھتے تھے جتنی نثر کی تھی، دونوں میں آمد تھی، آورد نہ تھی، ان کی تحریروں میں ردو بدل اور کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی تھی وہ پہلی ہی دفعہ اس طرح لکھتے تھے جیسے کوئی اپنی آخری تحریر لکھ رہا ہو، ایک نشست میں سات سو سے زیادہ اشعار نظم کر دیتے تھے، مہینہ اور ڈیڑھ مہینے کے اندر ایک ضخیم مثنوی تیار ہو جاتی تھی۔ ان گوناگوں خصوصیات میں ان کا کوئی بڑے سے بڑا ہم عصر بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا ص (۸)۔

حضرت ذوقی نے اس مختصر سے عرصے میں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مجلس دعوت و ارشاد کو نہ صرف زینت بخشی بلکہ مسند تعلیم اور تدریس کو خوب آراستہ کیا۔ اک طرف تصنیف و تالیف اور شعر و ادب کے میدان میں بے انتہا جولانی دکھلائی تو دوسری طرف کتابت و خطاطی اور نقل نویسی جیسے خشک اور اکتا دینے والے مشغلے کو بھی پورے ذوق و شوق کے ساتھ جاری رکھا۔ آپ نے اپنی معرکہ آرا ضخیم مثنوی "معجزۂ مصطفیٰ" کے آخر میں ان کتابوں کی طویل فہرست بھی دے دی جنھیں آپ نے بہ نفس نفیس نقل کیا تھا اور جن کی تعداد ۴۶ تک پہنچی ہے۔ آپ کی زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی رات میں "گلستان" من اولہ الیٰ آخرہ نقل کر دیا تھا۔

حضرت ذوقی نے عربی، فارسی اور اردوئے قدیم میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کی تصانیف کی تعداد ساٹھ سے زاید بتائی ہے۔

مصنف "مطلع النور" فرماتے ہیں۔

اور تصانیف اس کے در تعدا ساٹھ سے بھی زیادہ ہیں رکھ یاد!

مولانا حافظ بشیر الحق قریشی لطیفی نے اپنے مقالے میں ۴۷ کتابوں کا مختصر تعارف کے ساتھ ذکر کیا ہے (۹)۔ مولانا یوسف کوکن صاحب نے جملہ پچاس کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں بعض کا مفصل تعارف کرایا ہے (۱۰)۔ مولانا محمد طیب الدین اشرفی مونگیری نے پورے پچپن کتابوں کے نام گنوائے ہیں مگر تعارف و تبصرہ نہیں کیا ہے۔ بہر کیف حضرت ذوقی کی نثری تصنیفات علم تفسیر، علم حدیث، علم عقائد فقہہ، علم فقہہ، علم منطق، علم معانی، بیان بدیع، لغات، قواعد نحو و صرف، علم عروض پر محیط ہیں، آپ کی منظوم تصانیف میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، ترجیع بند، نظم بے نقط وغیرہ اصناف سخن میں اشعار کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ مثنوی مطلع النور میں ہے:

ان کے ابیاتِ نظم و نثر تمام　　تین لک سے زیادہ ہیں اے ہمام (۱۱)
(تین لاکھ)

آپ ایک فطری شاعر تھے، من جانب اللہ آپ کو علم وہبی عطا ہوا تھا، شاعری وراثت میں حاصل ہوئی تھی، اسی لیے آپ کی قادر الکلامی اور ہر گوئی کا عالم دیکھ کر آپ کے معاصر حیران و ششدر رہ جاتے تھے۔ حضرت باقر آگاہ اس کی شہادت اس طرح دیتے ہیں۔ "روزے حضرت ایشاں روبروئے من فکر ہفت صد بیت نمود و فرمود کہ کمیت خامہ را در عرصہ، سخن تا ہزار بیت بارہا دیدہ ام" (۱۲)۔

یعنی ایک روز آپ میرے سامنے ایک نشست میں سات سو شعر موزوں کیے۔ میرے تعجب کرنے پر فرمایا کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے ایک ہی نشست میں ہزار شعر موزوں کیے تھے۔

یہ عطیہ، خداوندی تھا ورنہ عام حالات میں اس طرح کا کارنامہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ سچ کہا کہنے والے نے:

" ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ "

اس حیرت انگیز پر گوئی اور تعجب خیز بدیہہ گوئی کے باوجود آپ کے اشعار "کاتا اور لے دوڑا" کے مصداق نہیں ہیں۔ اشعار میں سلامت و روانی اور کیفیت و معنیٰ آفرینی موجود ہے۔ کلام میں جا بجا استعارات و تشبیہات کا استعمال اور صنائع و بدائع کے ست رنگ جلوے دیدۂ دل کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید وحید اشرف (سابق پروفیسر شعبہ، فارسی مدراس یونیورسٹی):

> " حضرت ذوقی کی وفور گوئی، قادر الکلامی اور مختلف علوم و فنون میں درک جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوتا ہے، قدماء کی یاد دلاتے ہیں ـــــ ان کے اکثر قصیدوں سے ان کی تخلیقی صلاحیت، مضمون آفرینی، جدت طبع اور تخیل کی بلندی آشکارا ہے ـــــ اپنی قادر الکلامی اور جدت طبع سے نئے نئے معانی پیدا کیے ہیں ـــــ ذوقی کا کلام فارسی کے اساتذہ کے کلام کے ہم پایہ ہے۔ باقر آگاہؔ نے ذوقی کو

مثنوی میں نظامی کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور بجا کہا ہے۔(۱۳) ۔۔۔۔ ان کے قصاید کے محاسن اور کمالات ان کو فارسی کے صف اول کے قصیدہ گو شعراء میں لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔"

مولانا عبدالحئ واعظ بنگوری، حضرت ذوقی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

بس کہ اس فن میں وہ گرامی تھا ثانیِ جامی و نظامی تھا
یہ نہیں ہے مبالغہ اے یار واقعی ہے مایہ بات بے تکرار
دیکھ کیسے ہیں اس کے تصنیفات مثنوی ، غزل اور رباعیات
کر تتبع کبھی نظامی کی اور کیا ہے کبھی وہ جامی کی(۱۴)

حضرت ذوقی کو بچپن ہی سے شاعرانہ ذوق تھا۔آپ "انشائے لطف اللہی" میں خود ہی رقم کیا ہے کہ نو سال کی عمر میں آپ نے شعر کہنا شروع کیا، سب سے پہلے جو مصرعہ آپ نے کہا وہ تھا "در کعبہء دل صاحب مقبول درآمد" اس مصرعے کی تکمیل آپ کے والد بزرگوار حضرت قربی نے اس ثانی مصرعے سے کی "صد شکر کہ آں دولت ماموِل درآمد" اس طرح شفیق باب نے اپنے لائق فرزند کی ہمت افزائی کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کا شعری ذوق پروان چڑھتا گیا یہاں تک کہ تین لاکھ شعر آپ کے نوکِ قلم سے تخلیق پائے۔ بہ ہر حال آپ کی جملہ مثنویوں میں تین مثنویاں بالخصوص تاریخی حیثیت کی حامل ہیں، ایک "معجز مصطفیٰ"، دوسری "نجیب نامہ" تیسری "درِ بے بہا"، "معجز مصطفیٰ" کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر افضل الدین اقبال رقم طراز ہیں:

" حضرت ذوقی کی ایک نادر کارنامہ ان کا شاہ نامہ اسلام ہے جو "معجز مصطفیٰ" کے نام سے موسوم ہے۔اس مثنوی میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائے خلقتِ نور محمدی سے لیکر زمانہء وفات تک کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔ یہ فارسی مثنوی جو تقریباً ساڑھے سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔۱۱۸۱ھ م ۱۷۶۷ء میں جب کہ آپ تیس سال

کے تھے، ڈیڑھ ماہ میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ مثنوی بڑی مقبول ہوئی۔
اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ برسوں بعد
۱۲۴۷ھ م ۱۸۳۱ء میں حاجی غلام محمود مہاجر حسرت نے "ریاضِ سیر"
کے نام سے اس کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا۔ اس مثنوی کے مخطوطے
کتب خانہ، مدرسہ، محمدی مدراس اور کتب خانہ، نواب سالار جنگ
حیدرآباد میں موجود ہیں۔ یہ ضخیم اردو مثنوی ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۳ء میں
مطبع شرفیہ مدراس سے بھی شائع ہوچکی ہے لیکن اب نایاب ہے۔
صرف ایک نسخہ کتب خانہ، "لطیفیہ عربیہ ویلور" میں نظر آیا ص (۱۵)۔

حضرت ذوقی نے اپنی اس شہہ کار تصنیف کو اپنے مخلص دوست علامہ محمد باقر آگاہ ویلوری کے نام معنون کیا ہے۔ آپ کی دوسری تاریخی مثنوی "نجیت نامہ" ہے جو نواب کرناٹک انورالدین خاں کے مصاحب و رفیق کار "محمد نجیب خاں بہادر" کے حالات و واقعہ، شہادت پر مشتمل ہے، "نجیب خاں" آمبور گڑھ (شمالی آرکاٹ) کی جنگ میں نواب انورالدین کے ساتھ ۱۱۶۲ھ م ۱۷۴۸ء میں شہید ہوئے تھے۔ یہ مثنوی آپ نے نجیب خاں شہید کے فرزند آپ کے معتقد جناب "محمد سعید" کی فرمائش پر ۱۱۸۵ھ ۱۷۷۱ء میں لکھی تھی جب کہ آپ کی عمر صرف ۳۴ سال تھی، ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی صرف ایک دن میں نظم کی گئی تھی۔

آپ کی تیسری مثنوی "درِ بے بہا" جو کرناٹک کی تاریخ کا ایک مستند حوالہ بھی ہے۔ نوابِ کرناٹک، نواب محمد علی والاجاہ اور ان کے دونوں صاحب زادوں نواب عمدۃ الامراء اور نواب امیرالامراء کی جنگ "تنجاور" میں بہادری و فتح مندی اور اس وقت کے سیاسی و ثقافتی حالات کی منہ بولتی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس مثنوی کے جملہ اشعار چار سو ہیں اور یہ ۱۱۸۵ھ میں تحریر کی گئی ہے جیسا کہ مثنوی کے اختتامی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

چوں کشیدم بسلک اتمامش ساختم درِ بے بہا نامش

بے تہائش قریب چار صداست لطفہائش زیادہ از عدداست
سال تنظیم اوخرد بصواب زدرر قم بادسرخوش وباآب (۱۶)

۱۱۸۵ھ

حیرت کی بات ہے کہ "در بے بہا" کے سال تصنیف کے تعلق سے ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے لکھا کہ "یہ مثنوی (در بے بہا)) غالباً ۱۱۸۲ھ ۱۷۶۸ء میں قلم بند ہوئی تھی" (۱۷) اور مولانا یوسف کوکن عمری سے اظہار خیال کیا کہ "یہ مثنوی غالباً ۱۱۸۱ھ میں قلم بند ہوئی ہے" (۱۸) حالاں کہ کوکن صاحب نے اپنی انگریزی تصنیف عربک پرشین اِن کرناٹک (Arabic Parsian in Carnatic) میں "در بے بہار" کی تاریخ تصنیف ۱۱۵۸ھ لکھی ہے جو صحیح ہے۔ حضرت ذوقی کو خود اپنی صلاحیتوں کا علم تھا۔ اس خداداد عطیہ پر آپ نے بارگاہِ رب العزت میں ہدیہ، شکر وامتنان پیش کیا ہے اور تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنی تصنیفات میں اپنے کارناموں کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ چناں چہ آپ نے انشائے لفظ اللہی" میں رقم کیا ہے کہ " فی الجملہ فقیر را قوتِ استنباط من عنداللہ است:

از مواد ظاہر، الحمدللہ علی ماانعم و علم من البیان مالم یعلم والصلواۃ علی نبیہ خیرالانام و علیٰ آلہ الکرام ور صحابہ العظام " ص (۱۹)

مثنوی "معجز مصطفیٰ" ابتداء میں یوں فرماتے ہیں:

منم آنکہ شکرِ زبانی کنم بنوکِ قلم درفشانی کنم
منم سہر یارِ جہانِ سخن بلند اختر آسمانِ سخن
درافشاں چوداما براماں پند بگیتی ملقب بحسانِ پند
ہمہ بہر مند از نوالِ منہ اند ہمہ ریزہ چینِ مقالِ من الذ

ص (۲۰)

آپ کے جملہ تصنیفات جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ ساٹھ سے زاید ہیں، بعض تذکروں میں ڈیڑھ سو کی تعداد میں بیان کی گئی ہے جس میں سے بیشتر فارسی میں ہیں۔ آپ کی دکنی تصنیفات کا قطعی علم تاحال نہ ہوسکا ہے، بہ قول ڈاکٹر افضل الدین

اقبال:

"آپ کا جو بھی اردو کلام دستیاب ہوا ہے اس سے آپ کی قادر الکلامی، مضمون آفرینی، جدت طبع اور تخیل کی بلندی آشکار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کلام میں سلاست اور روانی بہت نمایاں ہے۔ اب تک کی تحقیق کے بہ موجب آپ کا اردو کلام دو مثنویوں اور ایک قصیدے پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ بھی یقیناً اور اردو کلام ہوگا لیکن افسوس اب تک وہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔ حضرت ذوقی کی اردو مثنویوں میں "عقاید ذوقی" اور "غوث نامہ" قابلِ ذکر ہیں" (۲۱)۔

حضرت ذوقی کو عربی اور فارسی زبان پر کامل دسترس حاصل تھی۔ تاہم آپ نے عوام الناس کی دینی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اہلِ سنت والجماعت کے عقایدِ مشہورہ کو جو امام ابو منصور ماتریدی کے مذہب کے مطابق ہیں، دکنی زبان میں منظوم کیا ہے۔ یہ مثنوی "عقایدِ ذوقی" ایک سو نو اشعار پر مشتمل ہے اور یہ ۱۰/ صفر ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء بروز یک شنبہ شب میں مکمل کی گئی۔ اس مثنوی کا ذکر "تذکرۂ انوار اقطاب ویلور" کی پچیس کتابوں کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ مولانا مولوی افضل العلماء ابو المکارم سید مصطفیٰ حسین بخاری قادری کڑپوی فاضل لطیفیہ نے دار لعلوم لطیفیہ، حضرتِ مکان ویلور کے نادر و نایاب مخطوطات کے خزانے سے اس مثنوی کو دریافت کیا اور حل لغت اور ترجمہ۔ متن عربی کے ساتھ سال نامہ اللطیف ویلور بابت ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء میں شائع فرمایا۔ اس مثنوی کی ابتداء کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں۔

حقائق الاشیاءا ثابتۃ — اشیا کی حقیقتیں ثابت ہیں

ہے ثابت حقیقت ہر اک چیز کی — یہی بات ہے اہلِ تمیز کی
(فقہاءِ کرام)

او نزدیک اربابِ عقل و سداد — نہیں وھم ھور مالج اعتقاد
(وہ) (راستی) (اور)

ہے ماٹی سوماٹی اگن سو آگن   بھی انسان سو انسان ہور جن سو جن

(مٹی) (مٹی) (آگ) (آگ)   (اور)

نہ جیوں تس کو سجے اووں ووں دسے   سخن فلسفی کا سند نیں کسے

(جیسا) (اس کو) (وہ) (اسی طرح) (نظر آئے)   (نہیں) (کسی کے لیے)

والعالم حادث قابل للفناء   عالم نو پیدا فنا ہونے والا ہے

بھی عالم ہے حادث نتھا سو ہوا   قدیم اس کو کہنا نہیں ہے روا

(نتھا)   (ازلی)   (جائز)

ہے قابل فنا کا اپس جات میں   تردد نہیں کس کو اس بات میں

یہ مثنوی درج ذیل اشعار پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

سمجھنا گنہ کو سبک ہور حلال   سمجھ اصل ہر کفر ہور ضلال

(معمولی) (اور)   (جڑ)   (اور) (گمراہی)

اہانت کرے جن شریعت کی آ   دیا مسخری ہے، او کافر سدا

(جو)   (دل لگی)

بھی ہے مسخری کفر سوں کفر جان   بھی تصدیق کا لہن کفر ہے پچھان

(مذاق)   (پہچان)

جو ہے مست و دیوانہ و بے خبر   نہیں کفر کا حکم اس کے اوپر

بھی نو امیہ ہونا خدا سوں ہے کفر   ...... سمجھ توں ہے کفر

نہیں یاس وامن استی ہرگز روا   ہے ایمان مابین خوف و رجا

(اس سے) (جائز)   (درمیان)   (امید)

یقین کر کو سجو کہ رب انام   عذاب اس کا ہے سخت، رحمت ہے عام

(اچھا کو)

ان ہی توں ذوقی کوں ایمان دے   اپس ذات کا اس کو عرفان دے

(اُن) (کو)   (اپنی)

بھکاری ہے تیرا، کر اس پر عطا   بحق محمدؐ نبی مصطفیؐ

تو دے بخش اس کے گنایاں تمام   تصدق ستے غوثؓ کے والسلام (۲۲)

(گناہ)   (سے)

حضرت ذوقی کی دوسری تصنیف "غوث نامہ" کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر

افضل الدین اقبال لکھتے ہیں:

"اس (غوث نامہ) میں حضرت غوث اعظم دستگیر کی کرامات کا تذکرہ ہے۔ یہ مثنوی چار سو آٹھ ابیات پر مشتمل ہے اور صرف دو دن میں لکھی گئی ہے۔ حضرت ذوقی کو حضرت غوث اعظمؒ سے والہانہ عقیدت تھی۔ یہ مثنوی آپ کے جذبات و احساسات کا ایک شاہ کار ہے۔ اس مثنوی کے کئی ایک نسخے کتب خانہ لطیفیہ ویلور میں محفوظ ہیں" (۲۳)۔

ڈاکٹر افضل اقبال کے علاوہ دیگر حضرت ذوقیؒ کے تذکرہ نگار بہ شمول مولانا یوسف کوکن اور مولانا بیشرالحق (۲۴) کے سب ہی نے "مثنوی غوث نامہ" کو بغیر تعارف و تبصرہ کے حضرت ذوقی کی تصنیفات میں شامل کیا ہے۔ ایک اور "غوث نامہ" جس کا تفصیلی تعارف جناب نصیرالدین ہاشمی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں کیا ہے۔ حسن اتفاق سے اس مثنوی کا خالق بھی ذوقی نامی شاعر ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس "غوث نامہ" کے اشعار کی تعداد بھی چار سو آٹھ ہیں۔ طرفہ تماشا یہ کہ وہ بھی صرف دو دن میں نظم کی گئی تھی جیسا کہ درج ذیل اشعار سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

بحمد اللہ ایں نامہ بے مثال	دو دن بیچ پایا ہی وصف کمال
عبارات اس کی سکل دل کشا	اشارات اس کی مسرت فزا
اگر اس کی بیتاں گنی توں تمام (اشعار) (گنے) (تو)	ھوی چار سو آٹھ اے نیک نام
یہ ہی غولے کی فضل سوں جب تمام (یہی) (کے) (سے)	کیا "غوث نامہ" یو نامہ کا نام (یہ)
یہ عاصی کی اوپر تو احسان کر	جتی مشکلاں اس کی آسان کر (جتنے)
ھی ذوقی غلام اوس کی درگاہ کا (اس کی)	بھکاری ہے دائم اوسی شاہ کا

جناب نصیر الدین ہاشمی ذوقی کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں کہ " ذوقی کا نام سید شاہ حسین تھا:

"ان کے مرشد شاہ خان محمد نے ان کو بحر العرفان کا خطاب دیا تھا۔ ایک مذہبی آدمی تھے مگر شعر و سخن میں کافی درست گاہ رکھتے تھے۔ وہ اس امر کا ذکر کرتے ہیں کہ اورنگ زیب جیسے ولی صفت اور مذہبی پادشاہ کے عہد سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو اپنی شاعری پر دوسرے شعراء کی طرح فخر و ناز بھی ہے۔ خود کو نصرتی سے بلند مرتبہ اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے سحبان اور احسان ہند تصور کرتے ہیں، ان کی مختلف مثنویاں مشہور ہیں جن میں " وصال العاشقین " زیادہ شہرت رکھتی ہے، ذوقی کی غزلیں اور مرثیے بھی مشہور ہیں " (۲۵)۔

مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ سید شاہ حسین ذوقی عہدِ عالم گیری ۱۶۳۸ء۔۱۷۰۷ء کے شاعر تھے اور انھوں نے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ ہمارے متذکرہ ذوقی جن کا نام جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ سید شاہ عبد اللطیف قادری ویلوری ہیں اور یہ عہدِ عالم گیری کے بہت بعد عہدِ والاجاہی (۱۷۴۹۔۱۷۹۵) کے معروف شاعر تھے اور آپ نے ردِ شیعیت میں کئی کتابیں تصنیف کیں، آپ نے اپنے رقعات مسمیٰ " انشائے عقاید ذوقی " کے " رقعہء ثالث عشر در بیانِ اقسامِ رفض " میں رفض اور اس کے جملہ مراسم سے شدید نفرت کا برملا اظہار کیا ہے (۲۶)۔ اس کے برعکس سید شاہ حسین ذوقی نے مراسمِ شیعیت کا اپنے مراثی میں پرچار کیا ہے مثلاً:

چھوڑو نکل دنیا کے کام دس دن تلک اے خاص و عام
ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلاتے کیوں نہیں

محرم کا پھر آیا ہے مہینا
کرے گا تیغ غم سو چاک سینا

شہہ کے الم میں مدام رکھ توں زاری سوں کام
بول توں ذوقی مدام آہ دریغا دریغ (۲۷)

بہ ہر حال مذکورہ شہادتوں کی روشنی میں "غوث نامہ، ذوقی" ویلور کے ذوقی کی مثنوی نہیں ہے جس کا تعارف ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے کرایا تھا بلکہ یہ مثنوی حضرت ذوقی ویلوری سے بہت پہلے ۱۱۰۹ھ میں معرض وجود میں آئی جیسا کہ اس مثنوی میں خود شاعر نے رقم کیا ہے:

اتھی سو اگیارہ بھی اس پہ نو ہوا ختم یو نسخہ نغز یو

جناب نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ "غوث نامہ" کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ یورپ کے کسی کیٹلاگ میں اس کا ذکر نہیں ہے اور ہندوستان میں بھی انھیں کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں چلا ہے۔ البتہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے میں ایک کتاب "غوث نامہ" کے نام سے موجود ہے مگر اس کا مصنف ذوقی نہیں بلکہ کوئی اور ہے اور یہ بہت بعد کی تصنیف ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں اس بات کا امکان ہے کہ حضرت ذوقی کی بھی کوئی مثنوی "غوث نامہ" کے نام سے رہی ہو گی مگر جواب ناپید ہے۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال صاحب نے جو "غوث نامہ" دیکھا ہے وہ سید شاہ حسین ذوقی کی تصنیف ہو گی، ذوقی ویلوری کی قطعاً نہیں۔

جناب علیم صبا نویدی نے اپنی ضخیم تالیف "تذکرۂ شعراء تامل ناڈو" میں حضرت ذوقی کی اردو مثنویوں میں "چہار فصل" کا نام شامل کیا ہے اور اس کا سال تصنیف ۱۱۹۳ھ لکھا جو صحیح نہیں ہے۔ در حقیقت "چہار فصل" حضرت ذوقی کی فارسی مثنوی ہے جو ۱۱۷۲ میں تصنیف کی گئی جیسا کہ اس کے اس شعر سے ظاہر ہے:

سال تاریخ او زروئے شمار صد و ہفتاد و دو بود بہ ہزار (۲۸)

حضرت ذوقی نے اپنے والد ماجد اور مرشد راہ طریقت حضرت سید شاہ ابو الحسن قربی ویلوری کی تعریف میں ایک دکنی قصیدہ بھی لکھا جو حضرت قربی ہی کی زمین میں تھا، قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مطلع قربی: اک رات میں گیا تھا رنداں کی انجمن میں
بولے کہ اے ہوائی بو نکتہ رک تو من میں
(ایہ) (رکھ) (ل ا)

اشعار ذوقی: اوبے بدل ہے دائم ابرار برسر آمد
(وہ)

او قطب ہے زمین کا او غوث ہے زن میں
(وہ) (زہ)

اسرار و معرفت کے جو فہم سوں ہیں باہر
(اسے)

یا تھے ادالحن میں یا ہیں ابوالحسن میں
ذوقی تو کیا کرے گا اوس ولی کی
کرتے ہیں خسرواں جس تعریف چو کدن میں
(چاروں طرف)

بس کراتا کہ نیں ہے توصیف میں اوشہ کے.
(نہیں) (اس شہہ کی)

طاقت تری زباں میں، قدرت ترے سخن میں
ہرگز تو نا سکے گا کرنے کوں وصف اس کا
(نہیں کرسکے گا)

حسان اگرچہ تو ہے، اس کشور دکن میں
جب لگ ہوے گگن ہور جب لگ ہے چاند، سورج
(تک) (رہے) (آسمان) (اور) (تک)

نام تس کا باقی خوبی سو تربھون میں
(اس) (عالم)

(۲۹)

ترسٹھ ابیات پر مشتمل یہ قصیدہ "ماہ نامہ سب رس" حیدرآباد بابت جون ۱۹۶۵ء کے شمارے میں شایع ہوا ہے:

ذوقیؒ کے ایک اور قصیدے کے متعلق پروفیسر سید فضل اللہ صاحب نے اطلاع دی کہ "اس غزل کی زمین میں حضرت قربی کے فرزند اور شاگرد ذوقی نے اپنے پیرو مرشد قربی کی شان میں ایک دکنی قصیدہ قلم برداشتہ لکھا" (۳۰)۔

قربیؒ کی غزل کا مطلع یہ ہے:

جب جھب سوں باغ میں اوسرو سمن برآیا
خدمت میں اس کے برپا ہونے صنو بر آیا

پروفیسر صاحب نے ذوقی کے قصیدہ کے نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ بہرحال حضرت ذوقی کا مزید دکنی کلام تلاشِ بسیار کے باوجود مل نہیں سکا۔ حضرت ذوقی کے معاصرین میں سید محمد مولوی والد (متوفی ۱۱۸۴ھ) شاہ میر اول (۱۱۸۶)، خواجہ رحمت اللہ نلوری (م ۱۱۹۷ھ) شاہ نور اللہ کڑپوی (م ۱۲۱۴ھ) مولانا باقر آگاہ (م (۱۲۲۰) اور مولانا عبد العلی بحر العلوم (م ۱۲۲۵ھ) ممتاز ہیں۔

حواشی

۱- یوسف کوکن، عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک - ص ۱۳۳

۲- عبد الحیٔ شاہ، مثنوی مطلع النور - ص ۱۰

۳- مثنوی مطلع النور - ص ۱۳-

۴- انوار اقصاب ویلور - ص ۴۸ از مولانا محمد طیب الدین اشرفی مون گیری

۵- مطلع النور - ص ۱۴-

۶- اللطیف ۱۴۰۴ھ - ص ۵۸

۷- اللطیف ویلور ۱۳۸۵ھ ص ۱۰۱

۸- مثنوی مطلع النور - ص ۱۳-

۹- ایضاً ۱۴۰۴ھ ص ۶۸-

۱۰- Arabic and Persain in Carnatic -

۱۱- مطلع النور - ص ۱۲

۱۲- تذکرۂ گلزار اعظم - ص ۱۹۲

۱۳- سال نامہ اللطیف ۱۴۰۰ھ ویلور - ص ۷۳ تا ۷۵ اللطیف ۱۴۰۴ھ ص ۲۱۳

۱۴- مثنوی مطلع النور - ص ۱۱

۱۵- سال نامہ اللطیف ویلور ۱۴۰۴ - ص ۱۹۵

۱۶- عربک اینڈ پرشین ان کارناٹک - ص ۱۵۹

۱۷- مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما - ص ۱۳۶

۱۸- سال نامہ اللطیف ویلور ۱۳۸۵ھ ص - ۱۰۷

۱۹- اللطیف ویلور ۱۴۰۴ھ ص - ۵۵ -

۲۰- ایضاً ۱۴۰۰ھ ص ۵۰

۲۱- سال نامہ اللطیف ویلور ۱۴۰۴ھ ص ۱۹۵ - ص ۱۹۶

۲۲- ایضاً ۱۳۹۳ھ - ص ۷۶

۲۳- ایضاً ۱۴۰۴ھ - ص ۱۹۶

۲۴- عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک - ص ۱۶۲ اللطیف شمارہ ۱۴۰۴ - ص ۷۶ -

۲۵- یورپ میں دکنی مخطوطات - ص ۳۴۴

۲۶- انشاء عقائد ذوقی - ص ۶۳ تا ص ۶۵

۲۷- یورپ میں دکنی مخطوطات - ص ۳۷۳ تا ص ۳۷۹

۲۸- سال نامہ اللطیف بابت ۱۴۰۴ھ - ص ۶۴

۲۹- ایضاً ص ۱۹۶

۳۰- دیوان قربیؔ - ص ۳۸

علامہ محمد باقر آگاہ نائطی شافعی قادری ویلوریؒ

تاریخ ادب اردو میں حضرت آگاہ کی شخصیت خصوصی اہمیت اور انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ آپ ایک متبحر عالم و فاضل اور صوفی کامل ہونے کے علاوہ قادر الکلام شاعر اور اعلیٰ درجہ کے نثرنگار و انشاء پرداز بھی تھے۔ آپ نہ صرف عربی، فارسی اور اردو کے ماہر تھے بلکہ آپ کو سنسکرت، برج بھاشا، تلگو اور ٹمل زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ اردو زبان میں سب سے پہلے علم الالسنہ پر قلم اٹھانے والی آپ ہی کی ذات تھی، اردو زبان میں نقد و انتقاد کی داغ بیل آپ نے ڈالی۔ بلا شک و شبہ جدید نثر کے بانیوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ بہ ہرحال آپ کے علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ آپ کے مقام و منزلت کو متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔

حضرت آگاہ کے آباء و اجداد عربی الاصل اہل نوائط سے تھے (۱)۔ آپ کے والد ماجد مولوی محمد مرتضیٰ معروف بہ محمد صاحب زوال سلطنت عادل شاہی (۱۶۸۶ء) کے بعد بیجاپور سے ہجرت کر کے دارالسرور ویلور تشریف لائے اور وہیں متمکن ہوگئے۔ آگاہؔ کی ولادت (۲) ۱۴ / رجب ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء کو شہر ویلور میں ہوئی۔ حسب دستور آپ کی تعلیم کی ابتداء بھی قرآن شریف سے ہوئی۔ چناں چہ آپ نے صرف سات سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کیا، بعد ازاں آپ نے اپنے عم محترم مولانا شیخ حبیب اللہ خلیفہ، حضرت قربیؒ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ چند ہی دنوں میں چچا نے اندازہ لگایا کہ اپنے ہونہار ذہین و فہیم بھتیجے کے لیے حضرت قربیؒ ہی کی درس گاہ مناسب رہے گی۔ چچا کے توسط سے آگاہ حضرت قربیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ آگاہؔ نے حضرت قربیؒ سے فارسی کی مطولات سکندر نامہ اور قران السعدین وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ ہنوز تعلیمی سلسلہ جاری ہی تھا کہ آگاہؔ کو بعض ناگزیر حالات کے تحت ویلور دارالسرور کو خیرباد کہہ کر اپنے چچا مولانا حبیب اللہ قادری کے ہم راہ نطہر نگر (ترچناپلی) منتقل ہونا پڑا جس کا قلق آپ کو

بہت تھا۔ تاہم آپ نے ترچناپلی کے ایک مشہور صوفی عالم حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ (متوفی ۱۲۰۵ھ) ابن محمد عبدالعظیم بہاری سے رجوع کیا، شاہ صاحب سے آگاہ نے عربی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی، ویلور میں حضرت قربیؒ سے جو ذہنی ربط اور قلبی تعلق پیدا ہوا تھا اس کا نشہ اپنے شفیق استاذ کی مفارقت کے باعث دو آتشہ ہو گیا۔ چناں چہ آپ نے ۱۱۷۵ھ میں جب کہ آپ کی عمر ابھی ۱۷ سال تھی فرط عقیدت میں ایک پرجوش قصیدہ لکھ کر حضرت قربیؒ کی خدمت میں ارسال کیا، جس کا مطلع ہے:

آفتاب اوج وحدت ، ماہ تاب برج دیں
کاشف اسرار قربت ، صاحب عین الیقیں

حضرت قربیؒ نے اس قصیدے کو بہت پسند فرمایا۔ آگاہ کی موزونی طبع اور قصیدے کی سلاست و روانی سے بھانپ لیا کہ بہ مصداق "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" شاگرد رشید کے اشعار کی ذرا سی اصلاح کی جائے تو مستقبل قریب میں میدان شاعری کا شہہ سوار بن جائے گا۔ اب بس ایک آنچ کی کسر باقی ہے لہٰذا آپ نے جواباً تحریر فرمایا کہ:

"قصیدۂ غرا کہ در مدح فقیر و حقیر بود رسید، معانیش دیدہ، دعا۔ "اللھم زد فزد" کردہ آمد یا ایں قدر علم چنیں فکر صائب بہ ظہور آمد۔ چوں زیادہ علم شود فکر کارہا خواہد کرد کہ سزاوار آفرین نام و تحسین تمام خواہد بود۔ بعض محال اصلاح طلب است اگر در حضور می بودند ظاہر کردہ می شد۔ والسلام" (۳)۔

جب حضرت آگاہ اس واقعہ کے دو ہی سال بعد ۱۱۷۷ھ میں ترچناپلی سے ویلور لوٹ آئے تو حضرت قربی کی خدمت میں پہنچ کر نہ صرف علوم ظاہرہ کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوگئے بلکہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کے بعد علوم باطنہ کی تحصیل میں کماحقہ منہمک ہوگئے۔ حضرت قربی کا فیضان صحبت ہی تھا کہ آگاہ نے بہت کم عرصے میں علوم متداولہ اور شعر و ادب میں کامل مہارت حاصل کر لی، چناں چہ آپ

نے اس کا اقرار فرمایا:

بود ہر بیت من آئینہ دار دیدۂ آگاہ
کہ بروجہ حسن کسب سخن از بوالحسن کردم (۴)

ایک اور مقام پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

جام جہاں نما ہے نظم دقیق آگاہ
صاف اس کو کر دیا ہے صیقل ابوالحسن کا

حضرت قربی کی وفات ۱۱۸۲ھ مطابق جنوری ۱۷۶۹ء تک آگاہ ویلور ہی میں قیام پذیر رہے۔ بعد ازاں کسب معاش کے لیے مدراس منتقل ہو گئے اور آخر دم تک وہیں آپ کی مستقل سکونت رہی۔ دریں اثنا آپ کے علمی کمالات کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا، جب اس کا علم والی کرناٹک نواب محمد علی والاجاہ (متوفی ۱۲۱۰ھ) کو ہوا تو نواب صاحب نے آپ کو شرف باریابی بخشا اور اپنے دونوں صاحب زادوں نواب عمدۃ الامراء اور نواب امیر الامراء کی اتالیقی کی ذمہ داری بھی آپ کو سونپی۔ اس کے عوض بطور وظیفہ ماہانہ دو سو روپے اور قصبہ "التور" کی جاگیر جس کا سالانہ محصول ایک ہزار دو سو "ہون" تھا مرحمت فرمائی (۵)۔ آگاہ کے تبحر علمی کا اثر بہت جلد رنگ لایا نواب والاجاہ نے آپ کو اپنا "دبیر خاص" (Private Secretary) مقرر کیا۔ چناں چہ نواب صاحب آپ سے شریف مکہ، مکرمہ اور ممالک عربیہ کے مشاہیر علماء و فضلاء کے نام بہ زبان عربی ۱۱۸۵ھ ۱۲۰۵ھ تک خطوط لکھواتے رہے (۶)۔ علماء حجاز نے آپ کی انشا پردازی اور فصاحت و بلاغت کی دل کھول کر داد دی۔ نواب صاحب اہل عرب کی تعریف و توصیف سے اس قدر خوش ہوئے کہ حضرت آگاہ کے لیے ایک طلائی گہوارہ بنوایا اور اپنے صاحب زادوں کو حکم دیا کہ اس گہوارہ کو اپنے ساتھ لے چلیں اور اپنے استاذ محترم کو اس میں بٹھا کر جھلائیں۔ حضرت آگاہ نے اس عزت افزائی اور قدر شناسی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جھولے میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ البتہ نواب زادوں کے شدید اصرار پر زریں گہوارہ اپنے پاس رکھ لیا (۷)۔

جب حضرت قربی کی وفات ہوئی تھی تو آگاہ کا دل تمام ادبی مشاغل سے اوب گیا تھا۔ اس دل برداشتگی کے عالم میں آپ نے اپنا اکثر و بیشتر کلام دریا برد کر دیا اور مدت دراز تک شعر و ادب اور تصنیف و تالیف سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، جیسا کہ خود آپ نے اپنے دیوان کے مقدمے میں رقم فرمایا "یہ حقیر نارس آگے تیس، بتیس برس کے، کیا فارسی کیا ہندی میں سب اقسام، شعر میں نظم کیا تھا اور ان سب کو بعد انتقال حضرت مرشد کے قدس سرہ، دھو ڈالا مگر عقائد منظومہ، شش رسالہ، سیر اور تحفتہ النساء کو باقی رکھا" (۸)۔

دربار والاجاہی سے وابستگی کے بعد آپ کی بارگاہ میں علماء و صلحاء اور شعراء و ادباء کی آمد و رفت میں کافی اضافہ ہو گیا، علمی محفلیں اور شعری مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ آپ کی تخلیقی صلاحیتیں ایک عرصے سے ماند پڑی ہوئی تھیں۔ ذوق شعری پر گویا پردے پڑ گئے تھے۔ اب جب کہ مدراس کا علمی ماحول اہل علم و اصحاب فضل کی صحبتیں راس آگئیں تو پھر سے تخلیقی سوتے پھوٹ پڑے۔ فطری ذوق و شوق پر سے حجابات اٹھ گئے، از سر نو آپ کے نوک قلم سے تصنیف و تالیف کے گنگا جمنا بہنے لگے، شعر و سخن کے دریا جاری ہو گئے۔ بہ قول مؤلف تذکرۂ گلزار اعظم پچاس ہزار سے زائد اشعار آپ کی خلاقی و طباعی کی یادگار ہیں (۹)۔

حضرت آگاہ نے اپنی قابلیت اور فضل و کمال کا لوہا اپنے تمام ہم عصروں سے منوا لیا تھا۔ آپ کے معاصرین آپ کی خداداد صلاحیتوں پر رشک کرتے تھے۔ اس دور کے معروف اصحاب کمال میں درج ذیل شخصیتیں زہد و ورع اور علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھیں (۱) سید شاہ عبداللطیف ذوقی ویلوریؒ (متوفی ۱۱۹۴ھ) (۲) خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ رحمت آبادیؒ (متوفی ۱۱۹۵ھ) (۳) حضرت سید شاہ عبدالقادر مہربان فخری اورنگ آبادی ثم مدراسیؒ (متوفی ۱۲۰۳ھ) (۴) مولوی میر اسمعیل خاں ابجدی مدراسیؒ (متوفی ۱۲۰۳ھ) (۵) علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامیؒ (متوفی ۱۲۰۰ھ) (۶) حضرت شاہ کمال کڑپویؒ (متوفی ۱۲۲۴ھ) (۷) حضرت ملا عبدالعلی بحرالعلوم

لکھنوی ثم مدراسیؒ (متوفی ۱۲۲۵ھ) ۔ مذکورہ حضرات میں مولانا آزاد بلگرامی اور حضرت بحرالعلوم سے آگاہؒ کی معاصرانہ چشمکیں، بحث و مباحث اور آپس کی رد و قدح علمی دنیا کا عظیم ورثہ بن چکی ہیں ۔ بالخصوص آزاد بلگرامی کے کلام پر کیے گئے علمی و فنی چار سو اعتراضات کا ایک مجموعہ "چہار صد ایراد بر کلام آزاد" کے نام سے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے جو حضرت آگاہ کی عبقری شخصیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ "تذکرۂ مؤلف گلزار اعظم" نے علامہ باقر آگاہ کے حالات کے تحت مذکورہ چار سو اعتراضات میں سے صرف چار کا ذکر بہ طور نمونہ پیش کرتے ہوئے آگاہ کی بھرپور تائید کی ہے اور یہ خبر بھی دی کہ ان اعتراضات کا جواب تاحال دیا نہیں جاسکا ۔ ملا بحرالعلوم سے بھی آپ کو علمی مسائل میں اختلاف شدید تھا، بالخصوص مشاجرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے تعلق سے دونوں بزرگوں کی رائیں مختلف تھیں، باوجود ان اختلافات کے ایک دوسرے کے قدر دان تھے۔ حضرت ذوقی آپ کے بے تکلف دوست اور مداح تھے، ذوقیؒ نے اپنی معرکہ آراء مثنویوں، معجز مصطفیٰؐ، اور "نجیب نامہ" کو آگاہ کے نام سے معنون کیا ہے ۔ ابجدی نے اپنی بہترین مثنویوں "زبدۃ الافکار اور "راغب و مرغوب" کی ابتداء میں آپ کی خوب تعریف و توصیف کی ہے۔ حضرت فخری مولانا آزاد کے شاگرد ہونے کے باوجود حضرت آگاہ کی صلاحیتوں کے بے حد معترف تھے اور آپ کی تعریف میں اشعار بھی کہے تھے۔ آگاہؒ نے فخریؒ کی وفات پر درج ذیل تاریخی قطعہ کہا تھا:

فخری کہ در مشائخ دوراں عدیل او ۔ ہرگز نہ کرد جلوہ در آئینۂ شہود
از سرد مہری تن افسردہ گشتہ تنگ ۔ در سیر اوج جاں پر پرواز واکشود
بودم بفکر رحلت او کز صریر کلک ۔ خورد ایں فغاں بگوش دلم لانظیر بود (۱۰)

(۱۲۰۳ھ)

خواجہ رحمت اللہؒ اور شاہ کمال سے بھی آپ کے خوش گوار تعلقات اور عمدہ مراسم تھے۔ حضرت خواجہ رحمت اللہ کے انتقال پر آگاہؒ نے بہترین تاریخی قطعہ کہا تھا:

سر اہل یقیں و خواجۂ دیں ۔ ملاذ و ملجا ہر سالک راہ

تنش وابستہ حکم شریعت | دلش ازہر مقام و حال آگاہ
ازیں دارِ فنا بگذشت و بگذاشت | دل احباب را در دردِ جاں کاہ
برآمد از صریر خامہ فریاد | بحق گردیدہ واصل رحمت اللہ (۱۱)

(۱۱۹۵ھ)

حضرت آگاہ نے اپنی تصنیفات میں شمالی ہند کے ان معاصرین شعرا۔ کا بھی ذکر کیا ہے جن کے کلام سے وہ واقف تھے۔ آپ کی کتابوں میں مختلف مقامات پر خواجہ میر درد، مظہر جان جاناں، فغاں، آرزو، آبرو، میر حسن اور مرزا محمد رفیع سودا وغیرہ کا کثرت سے نام ملتا ہے۔ مگر کہیں میر تقی میر کا ذکر دیکھا نہیں گیا۔ ممکن ہے اس وقت تک میر کی شہرت مدراس نہیں پہنچی ہو۔ قدیم کرناٹک میں تالیف کردہ تمام مستند تذکروں میں حضرت آگاہ کا ذکر خیر ملتا ہے، چناں چہ تذکرۂ گلزار اعظم، تذکرۂ صبح وطن تذکرۂ گلدستہ، کرناٹک، تذکرۂ نتائج الافکار، تذکرۂ معدن الجواہر، تذکرۂ حدیقۃ المرام اور تذکرۂ علمائے ہند وغیرہ کے مؤلفین نے آپ کی خوب تعریف کی اور آپ کی علمی و ادبی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا، البتہ افسوس کا مقام ہے کہ شمالی ہند کے کسی بھی معتبر تذکرے میں آپ کا نام پایا نہیں گیا۔ شاید روابط و تعلقات کا فقدان یا تفتیش و تلاش بسیار کی کمی فہرست سازی میں مانع رہی ہو۔ بہ ہر حال اس موقعہ پر حضرت آگاہ کے تعلق سے تحریر کردہ تذکروں میں سے کسی ایک تذکرے کا اقتباس پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ چناں چہ مؤلف حدیقۃ المرام مولوی محمد مہدی واصف (متوفی ۱۲۹۰ھ) ابن محمد عارف الدین خاں رونق رقم طراز ہیں: (۱۲)

"آپ (مولوی باقر آگاہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم، من جانب اللہ آپ کی تائید ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرح صدر سے مشرف فرمایا اور علوم کے دروازے آپ پر کھول دیے۔ آپ نے اپنے سے سوائے مصباح (عربی) کے اور کچھ نہیں پڑھا، لیکن آپ جس کی نظیر نہیں۔ قاموس تو آپ کو حفظ تھی، علامہ کا آپ نے مطالعہ فرمایا اور بڑے عالم، کامل

اور شیخ فاضل ہوگئے، رات رات بھر مطالعہ میں گزر جاتی تھی حتیٰ کہ صبح ہوجاتی اور علم کی پیاس نہ بجھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء عصر کو آپ پر رشک و حسد ہوتا تھا۔ آپ کی معلومات، عربی و فارسی طرز تحریر آپ کے کمال فصاحت بردال ہے۔ آپ نے سیرۃ النبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ احادیث کی رو سے اپنی زبان (اردو) میں کیا تاکہ عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ آپ کی تصانیف تقریباً پچاس بلکہ اس سے بھی زائد ہی ہیں۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا البتہ میرے والد ماجد اور چچا ان کے شاگرد تھے۔ آپ نے ۱۴/ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی۔ خدا آپ پر رحمت نازل فرمائے

حضرت آگاہ کی وفات مدراس میں ہوئی تھی، آپ میلاپور کے راستہ میں واقع کرشناپیٹ کے مقام پر اپنی مملوکہ زمین میں سپرد خاک کیے گئے۔ قبر ایک چبوترے پر بنائی گئی تھی جس پر کتبہ موجود تھا، کتبہ پر درج ذیل قطعہ، تاریخ کندہ تھا:

آگاہ گنج علم دیں زیر زمین او نہفت
تاریخ رحلت عالے قدمات فردا العصر گفت ۱۲۲۰ھ

مگر فی الحال مزار شریف پر نہ کتبہ ہے اور نہ اس کی ظاہری حالت ٹھیک ہے۔ وہ گھر جس کے احاطہ میں تربت واقع ہے، سڑک کے متصل ہے۔ گھر کا دروازہ کھولیے تو سیدھے مرقد پر نظر جا ٹھہرتی ہے۔ اس خستہ و زبوں حالت پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ قبر شریف کی زیارت و فاتحہ خوانی کی کسی کو اجازت تک نہیں دی جاتی اور اس ظلم و زیادتی پر مسلمانوں کا کوئی ادارہ یا اردو کی کسی انجمن کو ہنوز صدائے احتجاج بلند کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی ہے۔ اہل علم و اصحاب دول کی اس بے حسی پر تاریخ کے صفحات حیران و ششدر منہ کھولے دیکھ رہے ہیں اور زبان حال سے سوال کر رہے ہیں کہ اردو کے عظیم محسن، قابل فخر شاعر اور علوم ظاہری و باطنی کے منبع و مخزن کی کیا آخری آرام گاہ یہی ہے؟ راقم الحروف نے

اپنے کرم فرما دوست مشہور شاعر جناب علیم صبا نویدی کی رہنمائی میں اس مقام کی زیارت کا شرف مالکین مکان سے انتہائی منت اور سماجت کے بعد حاصل کیا ہے۔ اس مقالے کے اختتام پر صدیق محترم علیم صبا نویدی صاحب نے یہ جاں کاہ اطلاع دی کہ حضرت باقر آگاہ کی قبر اور آپ کے فرزند محمد جعفر کی قبر کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ اطلاع پاتے ہی راقم الحروف اس کی تصدیق کے لیے مدراس پہنچا اور موصوف کے ہم راہ اس مقام پر گیا تو یہ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ واقعتاً قبروں کا کوئی نشان موجود نہیں ہے بلکہ اس پر نئی عمارت کی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ اس ظلم و بیداری پر رگ حمیت کیا پھڑکتی کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی ہے۔

حضرت باقر آگاہ نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی آغابی بی بنت حافظ بابا قاسم سے ۱۱۸۵ھ کے اوائل میں لڑکا تولد ہوا جو اتفاقاً چند دن حیات رہ کر بیماری کے عالم میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ نومولود کا غم ابھی ہلکا بھی نہیں ہوا تھا کہ چہیتی بیوی داغ مفارقت دے گئیں۔ ان ناگہانی آفات پر آپ نے بڑے صبر و حوصلہ کا مظاہرہ کیا مگر دل کی افسردگی اور طبیعت کا اضمحلال چھپائے نہیں چھپ سکتا تھا۔ اس کیفیت کو بھانپ کر نواب والاجاہ اور ان کے فرزند امیر الامرا نے بہت ہی اصرار کرتے ہوئے شہر نلور میں آپ کا عقد ثانی محترمہ نرگس سے ماہ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ میں (۱۳) کرا دیا۔

دوسری بیوی کے بطن سے آپ کے ہاں محمد جعفر خدیجہ عرف چھوٹی بی، عائشہ، کنیز فاطمہ اور صفیہ پیدا ہوئے بعد کو مولانا محمد جعفر صاحب کا نکاح محترمہ عائشہ بنت محمد عبد اللہ مخاطب لقادر علی خاں سے ہوا۔ پھر آپ کی وفات ۸ / ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں ہو گئی۔ (خانوادۂ قاضی بدر الدولہ ص ۲۴۰ از پروفیسر یوسف کوکن صاحب مطبوعہ ۱۳۸۲ھ دار التصنیف۔ مدراس۔ ص ۱۴) (۱۴)

کنیز فاطمہ مولوی حافظ محمد حسین قادری (۱۲۵۹ - ۱۱۷۷ھ) ابن مولانا محمد سعید (متوفی ۱۲۱۶ھ) سے بیاہی گئیں، جن کے گھر ایک لڑکا سید احمد تولد ہوا۔ حضرت آگاہ کی وفات کے بعد آپ کی بعض کتابیں آپ کے فرزند مولوی محمد جعفر اور آپ کے

نواسے مولوی سید احمد کے اشتراک و تعاون سے شائع ہوئیں۔ چناں چہ ۱۲۶۲ھ میں شائع شدہ "بہشت بہشت" کے ایک نسخے کے آخر میں دونوں حضرات کے نام درج ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ آپ کے ورثا میں سے کوئی بھی فرد اب شہر مدراس میں موجود نہیں ہے، جو بھی خویش و اقارب بستے تھے تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔

حضرت آگاہ انتہائی با مروت، متین اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ اسی وصف خاص کی وجہ سے آپ کے شاگردوں میں شیعہ و سنی دونوں شامل تھے۔ آپ نے کبھی کسی کو خواہ مخواہ رنجیدہ خاطر نہیں کیا۔ ایک اور آپ کا وصف خاص غنائے نفس تھا۔ آپ نے کسی نواب، امیر یا دنیا دار کی بیجا تعریف و توصیف نہیں کی۔ آپ نے قصیدے ضرور لکھے مگر ان میں سے اکثر و بیش تر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں مرقوم ہیں، باقی قصائد یا تو حضرت غوث اعظم قدس سرہ کی منقبت میں یا اپنے مرشد حضرت قربی ویلوری اور دیگر اہل علم و فضل کی تعریف میں تحریر کئے گئے ہیں۔ آپ مدح سرائی کے عوض انعام و اکرام کے حصول کو عزت نفس کے قطعاً خلاف تصور کرتے تھے۔ چناں چہ مؤلف تذکرۂ صبح وطن نے آپ کے استغناء کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

> "جب نواب عظیم الدولہ کی ولادت کے بعد آگاہ نے ایک قطعہ تاریخ لکھ کر امیر الامراء کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور خوش ہو کر کہا کہ وہ آگاہ کو شاہی صلہ سے سرفراز فرمائیں گے۔ اتنا سنتے ہی آگاہ برافروختہ ہو گئے اور اسی جگہ قطعہ تاریخ کا پرزہ چاک کر دیا اور کہا "این سخن از آں جناب بسیار عجب است کہ مرا در جرگہ شعرا داخل فرمودند" (۱۵)

حضرت آگاہ کو علم عقلیہ و نقلیہ [illegible] شعر و ادب و نقد و انتقاد میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہ فضل و کمال محض عطیہ [illegible]وندی تھا جس کا اعتراف کرتے ہوئے آپ

نے فرمایا:

مرا علم بے شک خداداد ہے | ہیں میرے علم سب بے ریب وہبی
معلم کی منت سے آزاد ہے | ولا فخر فهذا فضل ربی

(مثنوی نو بہار عشق)

آپ ایک ماہر تعلیم اور السنہ، شرقیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان تمام کمالات کے باوجود آپ مشفق استاذ اور مہربان معلم تھے، شاید اسی لیے آپ کے تلامذہ کی تعداد کافی سے زیادہ تھی۔ ان شاگردوں میں سے بعضوں نے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی، مؤلف تذکرہ "گلزار اعظم" رقم طراز ہیں:

"عالے بفیض تربیتش استعداد شاں بہ ہم رسایندہ در اماثل واقران نامی و ماجد برآمدند و بکملات رائقہ ومقامات فائقہ فائز گردیدند، غنچہ طبع اکثر از سخن سنجان والافطرت بہ نسیم اصلاح آں بہار آرائے چمن خیال شگفتہ و ثمر افکار معنی پروران معجز منزلت بآبیاری عنایت آں نخلبند حدیقہ۔ کمال پختہ گلستاں معانی رنگین بترشح ابر دریا بار طبیعت فیض ظویتش سراسر سیلاب و بوستاں مضامین دل نشیں باھتزاز ہوائے انفاس تقدس اساش یکسر شاداب لراحمہ:

بندہ راطاقت آں نیست کہ ساز دوصفے (۱۶)
از کمالات خدا دادہ آگاہ رقم

آپ کے ممتاز شاگردوں میں درج ذیل افراد نے شعرو سخن اور علم و ہنر میں بڑا نام کمایا تھا۔

(۱) نامی: غلام اعزازالدین نامی مستقیم جنگ بہادر ملک الشعرا مصنف "بہارستان عشق" (متوفی ۱۲۴۰ھ)

(۲) ماجد: محمد علی حسین تاج الامرا ظفرجنگ ذوالفقار الدولہ ولد عمدۃ الامرا بہادر (متوفی ۱۲۱۶ھ)

(۳) فائق: سید خیرالدین ولد سید معصوم خاں امامی استاذ سخن (المتوفی ۱۲۴۲ھ)

(۴) رائق: غلام علی موسی رضا رائق معروف بہ حکیم باقر حسین خاں ولد حکیم رکن الدین حسین نائطی مؤلف تذکرۂ گلدستہ، کرناٹک (متوفی ۱۲۴۹ھ)

(۵) معجز: غلام محی الدین ولد محمد ندیم اللہ نائطی اتالیق نواب عظیم الدولہ (متوفی ۱۲۲۹ھ)

(۶) ناظر: غلام عبدالقادر ناظر ولدِ غلام محی الدین معجز، مصنف بہارِ اعظم جاہی (متوفی)

(۷) امداد: میر امداد علی

(۸) انور: نور الدین محمد خاں بہادر حشمت جنگ بنسیہ نواب محمد محفوظ خاں بہادر شہامت جنگ (متوفی ۱۲۱۲ھ)

(۹) رونق: غلام محی الدین معروف بہ عارف الدین خاں

(۱۰) افصح: حسین علی مخاطب بہ محمود علی خاں ولد حاجی محمود علی خاں نائطی ملقب بہ افصح الشعرا

(۱۱) والا: سید ابو سعید رحمت آباد ثم مدراس مصنف بحرِ غم و آیہ، رحمت (سوانح خواجہ رحمت اللہ قدس سرہ) متوفی ۱۲۶۴ھ

(۱۲) شائق: غلام محی الدین مخاطب بہ شائق خاں ولد شاہ احمد ابوتراب مصنف مثنوی "رشکِ بہشت" و "مرج البحرین" وغیرہ (متوفی ۱۲۴۹ھ)

(۱۳) شایان: محمد اسلم خاں ولد علی احمد خاں نائطی مصنف مثنوی، "گداز دل" "ظفر نامہ" وغیرہ مؤلف وقائع حیدری و گلدستہ، مناقب وغیرہ (متوفی ۱۲۴۳ھ)

(۱۴) فدا: غلام حسین ولد مومن علی خاں حیدر آبادی۔

(۱۵) ناصر: صفی الدین محمد خاں مدراس ثم حیدر آباد (متوفی ۱۲۴۳ھ) ولد قادر علی خاں بہادر برادر زادۂ حضرت آگاہ

(۱۶) احقر: سید نظام الدین مدراسی ثم ملیباری میر منشی راجہ رام راج بہادر شمشیر جنگ ولد سید عبد القادر خوشنویس مصنف نظام الانشاء (۱۷)۔

حضرت آگاہ نے عربی، فارسی اور اردو زبان میں مختلف علوم و فنون مثلاً تفسیر حدیث، فقہ، سوانح، اخلاق، تاریخ اور شعر و ادب میں تقریباً تین سو تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں (۱۸)۔ مگر زمانے کے دست برد سے بہت ساری کتابیں ضائع ہو گئیں۔ اب جو کچھ تصانیف ہند و پاک اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں عربی کی دس تصانیف، فارسی کی بیس کے علاوہ چھپن رسائل پر مشتمل ایک ضخیم مجموعہ جس کی چار جلدیں والا جاہ روڈ، مدراس میں واقع کتب خانہ اہل اسلام (Mohammed Library) کی زینت ہیں اور اردو کی سولہ کتابیں (۱۹) آپ کے تبحر علمی پر دال اور آپ کے فضل و کمال کی شاہد ہیں۔ ذیل میں حضرت آگاہ کی اردو تصانیف کا تفصیلی ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ اردو دنیا میں آپ کی ادبی خدمات کا کماحقہ اعتراف کیا جا سکے۔

حضرت آگاہ نے پندرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنی مثنوی "ریاض الجناں" کے دیباچے میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> "اور بوج اے بھائی! یہ عاصی پندرہویں سال سے شعر کے ساتھ الفت و ارتباط رکھتا ہے اگرچہ شعر کم کہتا تھا، اس ہی واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا تھا۔۔۔ (۲۰)"

حضرت آگاہ کی ولادت چوں کہ ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں ہوئی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں شعر گوئی کی ابتدا کی تھی اس لحاظ سے مشق سخن کے آغاز کا سال ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۶۰ء قرار پاتا ہے لہٰذا ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "آگاہ نے پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۱ء میں شاعری کی ابتدا کی (۲۱)۔

حضرت آگاہ نے عربی اور فارسی کلام میں اپنا تخلص "آگاہ" رکھا اور دکنی کلام میں باقر مگر اکثر مثنویوں میں "آگاہ" کا استعمال ہی روا رکھا جس کی تفصیل بتاتے

ہوئے آپ رقم طراز ہیں:

"جب ۱۱۸۴ اور ۱۱۸۵ ہجری میں بعضے رسائل "ہشت بہشت" کے منظوم کیا، لفظ "باقر" کہ جزء نام ہے بجائے تخلص رکھا، من بعد بیچ سن یک ہزار ایک سو اور نود اور چہار کے وقت نظم کرنے دیوان غزل کے تخلص اپنا "آگاہ" مقرر کیا۔ اس تخلص کو اشعار عربی اور فارسی میں لایا۔ اکثر مراثی اور ریختوں میں بھی اس ہی تخلص کو اختیار کیا اور تتمہ رسائل "ہشت بہشت" میں بھی بیچ ۱۲۰۶ کے منظوم ہوئے اور بیچ کتاب "محبوب القلوب" کہ بیچ ۱۲۰۷ ہجری کے منظوم ہوئی اور اس رسالے میں کہ "ریاض الجناں" نام رکھا ہے۔ تخلص اپنا وہی لفظ "باقر" رکھا ہے اس واسطے کہ رسائل اول کے جا بہ جا مشہور ہوئے تھے اگر بعد ہوئے سو رسالوں میں تخلص "آگاہ" لاتا تو دو تخلص ہوتے۔ اس واسطے وہی تخلص بحال رکھا تا مثنویات ہندی میں یک تخلص رہے۔۔۔۔(۲۲)

حضرت آگاہ کے مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آپ نے ۱۱۸۴ تا ۱۱۸۵ کے دوران اپنے اردو کلام کے لیے لفظ باقر کا استعمال کیا حالاں کہ آپ نے ۱۱۸۶ ھ میں بھی باقر ہی کو جاری رکھا۔ جناں چہ مثنوی "من موہن" جو ۱۱۸۶ھ میں کہی گئی تھی اس کی غزل کا مقطع اس طرح درج ہے۔

عفو باقر کی اب کرو تقصیر　　ازبرائے خدا تمہارا ہوں (۲۳)

الغرض آپ کے کلام میں باقر اور آگاہ دونوں تخلص وقتاً فوقتاً استعمال ہوتے رہے ہیں، جس کی تفصیل بیک نظر اس طرح ہے:

(شعر گوئی کی ابتدا)	۱۱۷۲ھ تا ۱۱۸۳ھ	کوئی تخلص نہیں
	۱۱۸۴ھ تا ۱۱۸۶ھ	باقر تخلص
	۱۱۸۷ھ تا ۱۲۰۶ھ	آگاہ تخلص

(۱۲۰۷ھ ریاض الجناں لکھی

(۱۲۰۷ھ ریاض الجناں لکھی گئی)	۱۲۰۷ھ تا ۱۲۱۰ھ	باقر (دوبارہ)
(۱۲۱۱ھ میں گلزارِ عشق تحریر کی گئی)	۱۲۱۱ھ تا ۱۲۱۶ھ	آگاہ (دوبارہ)
(تصنیف و تالیف کا مشغلہ ترک کر دیا	۱۲۱۷ھ تا ۱۲۲۰ھ	(اسی سال وفات پا گئے)

حضرت باقر آگاہ چوں کہ بنیادی طور پر عالم و فاضل اور صوفی کامل تھے لہذا آپ نے دیگر صوفی شعرا کی طرح مذہبی تعلیم و تبلیغ کی غرض سے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا بقول ڈاکٹر بدیع حسینی:

> " دکنی زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز کرنے والے صوفی اور مذہبی رہنما تھے ان کی تعلیمات عوام کے لیے تھیں۔ اس لئے انھوں نے عوامی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا، ان کے مخاطب مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں، انھوں نے عورتوں کے لیے علحدہ ادب تخلیق کیا جس میں راست عورتوں سے تخاطب تھا ----(۲۴)

(۱) رسالہ عقائد: -

آپ کی تصانیف میں سب سے پہلی تصنیف " رسالہ عقائد " ہے۔ اس مثنوی کے جملہ اشعار ۵۰۰ ہیں اس میں اہل السنت والجماعت کے عقائد بڑی عمدگی سے پیش کیے گئے ہیں، کتاب کے آخری حصہ میں رویت باری تعالیٰ کی بحث ہے اور یہ مثنوی مناجات پر ختم کی گئی ہے۔ یہ آپ کی اولین دکنی شعری کاوش ہے جس کا ثبوت اس میں موجود درج ذیل اشعار سے ملتا ہے:

کہا نیں میں کبھی دکنی میں اشعار	مجھے ہے شعر کہنے سے بہت عار
و لے یہ نظم بولیا بالضرورت	پڑے تا اوسکو ہر امی و عورت

" عقاید نامہ " کا بہترین قلمی نسخہ " ادارہ ادبیات اردو " میں محفوظ ہے (۲۵)۔ جس کی کتابت نواب حیدر علی خان کے میر منشی میر حسین علی کرمانی ابن سید عبد القادر کرمانی مصنف نشان حیدری و تذکرۃ البلاد والحکام کے پاکیزہ قلم سے ۱۲۰۹ ھ میں مصنف علیہ الرحمن کے حین حیات ہوئی۔ اس مثنوی میں سال تصنیف مذکور

نہیں ہے مگر چوں کہ "ہشت بہشت" کے دیباچے میں اس مثنوی کا ذکر موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۱۸۵ھ سے قبل لکھی گئی تھی۔ "ہشت بہشت" کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ "(ہشت بہشت" کے) چھ رسالے اول کے مع رسالہ، عقائد و تحفتہ النساء سنہ یک ہزار و یک سو اور اسی اور پانچ میں اور ۱۱۸۶ھ ہی میں بنے ہیں۔ مصنف کے مذکورہ بیان کے برخلاف (ہشت بہشت) کا دوسرا رسالہ "من دیپک" ۱۱۸۴ھ ہی میں مکمل کر لیا گیا تھا جیسا کہ "من دیپک" کے اختتامی اشعار سے پتہ چلتا ہے، ملاحظہ ہوں:

اس ذکر کو یاں کرتا ہوں تمام — احمد پہ درود اں صبح و شام
جب گیارہ سو تھے از ہجرت — اور چوراسی اے با صفوت
اس وقت بنا یہ نسخہ خوب — جو ہے اہلِ دل کا مرغوب

بہ ہر حال مصنف سے دیباچے میں تسامح ہو گیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

ثنا ہور حمد ہے حق کوں سزاوار — کہ ہے قدرت کا جس کے سب یو بستار
کیا جب اپنی قدرت کو ہویدا — کیا یک کن سے سب عالم کو پیدا
محمدؐ کوں کیا سالارِ ہستی — طفیل اوس کے ہے سب بالا و پستی
کیا سب انبیاء کا اوسکو سرور — شرف اوسکوں دیا سب خلق اوپر

اختتامیہ اشعار یہ ہیں:

بچا نچ دل کو ہر محنت سوں یا رب — لجا نچ تن سے ہر زحمت کوں یا رب
منجے دے صحت وقوت خدایا — نگہہ رکھ آبرو، حرمت خدایا
سدا رکھ منجہ کوں اپنے دھیان کے ساتھ — لجا آخر منجے ایمان کے ساتھ
بحمداللہ ہوا یہ نامہ آخر — بحقِ مصطفیٰ سلطانِ فاخر

الغرض عقائد نامہ کے ابیات کی تعداد میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تذکرۂ گلدستہ۔ کرناٹک کے مؤلف نے چھ سو بیت لکھا ہے (۲۶)۔ مرتبِ تذکرۂ اردو مخطوطات نے پانچ سو اشعار کی اطلاع دی ہے (۲۷)۔ اور کتاب "باقر آگاہ" کے مصنف نے جملہ اشعار کی تعداد چار سو بیس بتائی ہے (۲۸)۔ مگر کسی نے کوئی داخلی ثبوت

فراہم نہیں کیا ہے۔ مثنوی "عقائد نامہ" کو "فرایدِ در عقائد" "شواہد در بیان عقائد" اور "عقاید مولوی محمد باقر آگاہ" کے مختلف عنوانوں سے یاد کیا گیا ہے اور یہ کتاب بارہا چھپ چکی اور کافی مقبول ہو چکی ہے۔

(۲) **تحفۃ النساء:** یہ رسالہ عورتوں کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا امہات المؤمنینؓ اور مشہور و مقدس خواتین اسلام کے سوانحی حالات بہ طورِ پند و نصیحت کے بیان کیے گئے ہیں۔ عورتوں کے مختلف مسائل خصوصاً ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سب سے پہلے باقاعدہ توجہ دینے والی ہستیوں میں حضرت آگاہ کا نام ممتاز و نمایاں ہے۔ بہ قول نصیر الدین ہاشمی:

> "آگاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو ضروری اور لازمی تصور کیا اور ان کے لیے خاص کتابیں لکھیں۔ اس نے اپنی تصنیفات میں صاف طور سے اس امر کی صراحت کی ہے کہ ان کا مقصد خاص طور سے صنف لطیف کی بہبودی ہے۔

چناں چہ "ہشت بہشت" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "بعض علماءِ متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ان سے فائدہ پاویں، لیکن اکثر عورتاں اور تمام امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں۔ اس لیے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکنی رسالوں میں بولا ہے۔"

پھر اسی میں بیان کرتے ہیں:

دکنی میں کہا ہوں اس لیے میں — تا ہووے سمج عوام کے تیں
تا سر بہ سر امیاں ہور عورات — پڑنے ستی اوسکی پاویں لذات

رسالہ عقائد میں لکھتے ہیں:۔

ولے بو نظم بولیا بالضرورت — پڑے تا اوسکو ہر امی و عورت

غرض کہ آگاہ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان میں سیر فقہ عقائد پر متعدد کتابیں خاص کر عورتوں کی تعلیم کے لیے مرتب کیں" (۲۹)۔

مثنوی تحفتہ النساء بالخصوص عورتوں کے لیے ہی لکھی گئی تھی، اسی بات کی صراحت کرتے ہوئے حضرت آگاہ فرماتے ہیں:

یہ نسخہ کہ ہے عجیب و نادر مخصوص ہے عورتاں کے خاطر
عورات کے واسطے بنیا ہے نام اس کا بھی تحفتہ النسا ہے

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ خواتین کے لیے اردو زبان میں علمی و مذہبی کتابیں تصنیف کرنے کا سہرا حضرت آگاہ کے سر جاتا ہے مگر آپ سے پہلے مختلف اہلِ قلم صوفیاءِ کرام نے چکی نامے، چرخہ نامے، سہاگن نامے لکھے۔ مثال کے طور پر آپ کے ہم عصر بلکہ دادا پیر حضرت خواجہ رحمت اللہ معروف بہ نائب رسول اللہ (متوفی ۱۱۹۵ھ) نے کم سواد و ناواقف عورتوں کے توہمات، رسوم اور بدعات کی اصلاح کی خاطر "تنبیہ النساء" کے نام سے ایک مثنوی تصنیف کی جس کا بند "سن سہاگن" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے، مثلاً:

سن سہاگن پندِ حق دل جان سے میں کہوں احادیث اور قرآن سے
سن سہاگن بات میری کر قبول میں کہوں فرمائے سو حضرت رسول
سن سہاگن یاد رکھ باتاں تمام پڑھ درود واں، چھوڑ دے گیتاں حرام (۳۰)

ان سب باتوں کے باوجود عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کی ذہنی و علمی پسماندگی کے مدِ نظر کوئی ٹھوس علمی تصنیف حضرت آگاہ سے پہلے لکھی نہیں گئی۔

حضرت آگاہ کی مثنوی "تحفتہ النساء" کے بعد قاضی غلام احمد میسوری نے جو عہد ٹیپو سلطان میں منصب قضا پر مامور تھے "احکام النساء کے نام سے نثر میں باون صفحات کا ایک مختصر رسالہ لکھا جس میں عورتوں کے متعلق مسائل فقہہ جمع کیے گئے تھے۔ یہ رسالہ نثر میں ہونے کی وجہ سے عوام میں مقبول نہ ہو سکا۔ علامہ باقر آگاہ کے بعد حضرت محمد صبغتہ اللہ المعروف بہ قاضی بدر الدولہ (۱۲۱۱-۱۲۸۰ھ) نے ۱۲۲۴ھ میں جب کہ آپ کی عمر ہنوز تیرا سال ہی کی تھی فقہہ شافعی میں عورتوں کے لیے ایک سو ایک صفحات پر مشتمل ایک عمدہ رسالہ "ریاض النسوان" کے نام سے لکھا جو حیدر آباد، مدراس اور بمبئی سے بارہا طبع ہو کر کافی مشہور ہوا۔ الغرض مشاہیر

علماء جنوب کی مذکورہ تمام تصانیف حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تالیف "بہشتی زیور" سے تقریباً ایک صدی پہلے معرض وجود میں آچکی تھیں۔ علامہ آگاہ نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں جو آواز بلند کی وہ صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی بلکہ اس کا خاطر خواہ اثر مرتب ہوا۔ آگاہ کے بعد پے در پے علماء کرناٹک نے اس تحریک کو آگے بڑھایا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج علاقہ مدراس میں جابجا دینی و دینوی تعلیم کے مدارس نسواں قائم ہیں۔ مثلاً مدرسہ نسواں وانیم باڑی اور ایس۔آئی۔ای۔ٹی۔کالج (S.I.E.T. College) مدراس میں لڑکیوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے علاوہ قیام وطعام کا بھی معقول انتظام موجود ہے۔

(۳) ہشت بہشت: یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات، حالات و کمالات اور خصوصیات و معجزات پر مشتمل ہے۔ اس کے جملہ اشعار کی تعداد نو ہزار ۹۰۰۰ ہے۔ یہ دراصل آٹھ مختلف و مکمل رسالوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر ایک کے لیے مستقل حمد، نعت، منقبت غوث اعظم اور مدح مرشد کے علاوہ الگ الگ اوزان کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب "ہشت بہشت" در حقیقت امیر الامراء نواب حافظ محمد منور خاں امیر ابن والی کرناٹک نواب محمد علی والاجاہ کی خواہش پر لکھی گئی۔ آگاہ نے دیکھا کہ واعظین ماہ ربیع الاول کے بارہ دنوں میں جو کچھ تقاریر عوام الناس کے روبرو پیش کرتے ہیں، اس میں اکثر و بیش تر موضوع روایات اور بے بنیاد احکامات ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے سامعین سیرت طیبہ کی حقیقی لذت سے نا آشنا رہ جاتے ہیں، اسی خیال کے تحت آگاہ نے "ہشت بہشت کے آٹھ رسالوں کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا تاکہ ماہ میلاد شریف کے بارہ دنوں میں سے ہر ایک روز ایک حصہ پڑھ کر عوام کو سنایا جائے۔ ان آٹھ رسالوں میں سے ابتدائی چھ رسائل ۱۱۸۴ھ سے ۱۱۸۶ھ تک مکمل ہوگئے تھے۔ بعد ازاں مختلف مصروفیات اور دیگر علمی مشاغل کی بنا پر طویل وقفہ کے بعد ۱۲۰۶ھ میں آخر کے دونوں رسائل تصنیف کیے گئے۔ جس کی تفصیل آپ نے دیباچہ میں بیان کر دی ہے۔

مذکورہ آٹھ رسالوں کے نام اور موضوع کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) من دیپک: اس رسالہ میں نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ بہ سلسلہ منتقل ہونے کا بیان موجود ہے۔ آپ نے اس مثنوی کو "مفعول فعولن فعولن فع" (مع زحافات) کے وزن پر نظم کیا ہے

(۲) من ہرن: ان تمام بشارتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کتب سابقہ میں موجود ہیں اور اس کا وزن "مفتعلن مفتعلن فاعلان" ہے۔

(۳) من موہن: اس مثنوی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک سے لیکر آپؐ کی عمر شریف آٹھ سال ہونے تک کے احوال نظم کئے گئے ہیں اور اس کا وزن "فاعلاتن مفاعلن فعلن" ہے۔

(۴) جگ سوہن: اس میں آٹھ سال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے تک کے تاریخی واقعات محفوظ کیے گئے ہیں اور اس کا وزن "فاعلاتن فعلاتن فعلن" ہے۔

(۵) آرام دل: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و خصائل اور عادات و عبادات کا تذکرہ ہے اور یہ "فعولن فعولن فعولن فعل" کے وزن پر نظم کی گئی ہے۔

(۶) راحت جہاں: اس رسالہ میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص کی تفصیل نظم کی گئی ہے اور اس کا وزن "فاعلاتن فاعلاتن فاعلن" ہے۔

(۷) من درپن: اس مثنوی میں معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے اور اس کا وزن "مفاعیلن مفاعیلن فعولن" ہے۔

(۸) من جیون: اس میں فرضیت محبت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم اور درود کے فضائل کے علاوہ زیارت بارگاہ نبوی کے آداب مذکور ہیں۔ اور یہ مثنوی "مفعول مفاعلن فعولن" کے وزن پر نظم کی گئی ہے۔

چوں کہ ان رسائل کا مقصد اصلی سیرت طیبہ کو بے کم وکاست بیان کرنا تھا

اس لیے حضرت آگاہ نے اس مجموعہ میں عوامی زبان دکنی ہی استعمال کی ۔چناں چہ دیباچے میں آپ فرماتے ہیں:

" ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیاہوں بلکہ صاف و سادہ کہاہوں اور "اردو" کے بھاکے میں نہیں کہا کس واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اوس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔"

آپ نے اشعار میں اس کی وجہ بیان کی کہ:

نہ بولیا یہ سخن شعرا کے ڈھب سے
لکھا ہوں صاف سیدھا دو سبب سے
اول پاس احادیثِ صفاکیش
لکھا ہوں ان کو جوں تھے بے کم وبیش
کیا ہوں ترجمہ اخبار کا جب
توکیوں دخل اس میں پادے شعر کا ڈھب
بھی یہ نسخہ کہ ہے اس فن میں نادر
بنا ہیگا عوا الناس --- خاطر
نزاکت شعر کی وہ جانتے نیں
دقائق اس کے کچھ پہنچانتے نیں
کہا صاف اس لیے یہ نظم مرغوب
کہ تاسب امیاں سمجھیں اسے خوب
اگر بھاکے میں اردو کے میں کہتا
کوئی اس کو یاں کے لوگاں سے نہ چہتا

آپ نے بجا فرمایا کہ اس میں شاعری نہیں کی گئی یعنی شاعرانہ مبالغہ آرائی اور بیجا تعلی سے یقیناً اس کا دامن آلودہ نہیں ہوا، مگر شاعرانہ صنائع اور تخیل کی بلند پروازی سے بھی تو دامن بچایا نہیں جاسکا، چناں چہ اس مجموعہ، "ہشت بہشت" کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

بلکہ جو ہیں مصطفیٰ کے ذکر میں
ہیں بلاشک وہ خدا کے ذکر میں
قفلِ دل کو ذکر اس کا ہے کلید
مگر یاں کو پل میں کرتا ہے رشید
دل کے درپن کو ہے ذکر اس کا صقال
گلشن جی کو ہے ذکر اس کا اہال
گھر کو سینے کے، ہے ذکر اس کا چراغ
جسم و جاں ہوتا ہے اس سے باغ باغ
روگ بھاگے تن سے اوسکے ذکر سے
بھاگ جاگے اوسکے ذکر و فکر سے (۳۱)

بہرحال آپ نے یہ کتاب "ہشت بہشت" بڑی تحقیق وتدقیق اور انتہائی عرق ریزی کے ساتھ لکھی تھی۔اسی لیے آپ نے قارئین کو آگاہ کیا کہ:

" اے بھائی یہ رسالے دکنی میں ہیں کر کے سہل اور سرسری نہ جان

کیا واسطے کہ بڑے معتبر کتب سے تحقیق کر کر لکھا ہوں ۔ اگر وہ تمام
کتاباں تو دیکھینگا یا کسی سے سینگا تو تجھے قدر ان رسالوں کی معلوم
ہوینگی " (۳۲) ۔۔۔

دکنی زبان چوں کہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے دعوت و تبلیغ اور ترسیل و تکفیل کے لیے موزوں ترین سمجھی گئی ہے اس لیے متقدمین و متاخرین صوفیاءِ کرام نے اس کو اپنے اظہار کا ذریعہ اور اپنی مقصدیت کا وسیلہ بنایا ۔ بہ قول ڈاکٹر محمد علی اثرؔ:

قدیم اردو شاعری کی اولین خصوصیت اظہارِ بیان کی سادگی ہے ۔ سادگی، روانی اور برجستگی دکنی شاعری کی وہ نمایاں خصوصیت ہے جو ۱۷۰۰ء کے بعد شمالی ہند میں نشو و نما پانے والی شاعری میں تدریجی طور پر کم ہوتی گئی ۔۔۔ قدیم اردو شاعری کی دوسری اہم اور نمایاں خصوصیت حقیقت پسندی یا واقعہ نگاری کا رجحان ہے ۔ دکنی شعراء نے اپنے محسوسات ، مشاہدات اور تجرباتِ زندگی کو بے تکلفی اور تصنع کے بغیر حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے " (۳۳) ۔

حضرت آگاہ نے اپنی کتاب " ہشت بہشت " کے آٹھوں رسائل کے عناوین ایسے منتخب کیے ہیں کہ صرف عنوان پڑھتے ہی دل گدازی ، جاں نثاری اور ایک گونا وارفتگی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے ۔ اس مجموعے کے اکثر عنوانات ہندی الفاظ کے تراکیب سے بنائے گئے ہیں ۔ اس سے آپ کی شاعری کی ایک خصوصیت کی نشان دہی ہوتی ہے، بہ قول کاوش بدری:

" آج سے دو سو سال پہلے آگاہ نے نظیر اکبرآبادی اور فراق گورکھپوری سے کہیں زیادہ اپنی شاعری میں ہندوستانی عناصر کو تخلیقی حسن کے ساتھ برتا ہے ۔ آگاہ کی شاعری میں ہندی الفاظ کی برت اتنی خوب صورتی سے ہوئی ہے کہ شاید ہی اس کی مثال شمالی ہند کے کسی

قدیم یا جدید شاعر کے یہاں ملے۔ آگاہ کی "ہشت بہشت" (جو سرور کائنات پر پہلی (طویل) منظوم تصنیف ہے، اس سے پہلے کوئی (اس قدر طویل نہیں لکھی گئی) اس کتاب میں ہندی سرخیوں کے ساتھ نو ہزار اشعار ہیں ۔۔۔۔ اور ہر حصہ ہندی کی ذیلی سرخیوں پر مشتمل ہے مثلاً من دیپک من ہرن، من موہن، جگ سوہن، من درپن، من جیون وغیرہ" (۳۴)۔

حضرت باقر آگاہ نے "من درپن" کے اختتام پر خدا کی بارگاہ میں مناجات کرتے ہوئے جہاں اپنی ضعیف العمری، پریشان خیالی اور دنیا بے زاری کا اظہار کیا ہے وہیں بارگاہ نبویؐ میں حاضری دینے کی شدید خواہش اور مسلمانوں کی ظفریابی کی دلی تمنا کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے سخت نفرت کا اعلان انتہائی چابک دستی سے کیا ہے:

ہوئی عاجز دوا میری دعا بھی	ہوئی عاجز مری طاقت غذا بھی
مرا خاطر پراگندہ ہوا ہے	پنٹ دنیاستی گندا ہوا ہے
ضعیفی سے ہوا ہوں میں زمیں گیر	نہیں کچھ سوجھتی ہے مجھ کو تدبیر
مدام اس فکر میں ہے یہ کمینہ	کہ چلتا سر سے جاوے تا مدینہ
نظر سے لپنے مجھ کو تو کرامت	مجھے دے شہر میں تیرے اقامت
ہوں رہنے سے یہاں کے بہت بے زار	بہت اس بات سے پاتا ہوں آزار
ہوا ہے کفر کا یاں گرم بازار	مسلماناں اوپر ہے سخت دشوار
سمایاں مشکل ان پر آکھڑا ہے	پہاڑ ان کے سر اوپر آکھڑا ہے
کدھر جاویں کہ یہ لشکر ہیں تیرے	اگر ہیں نیک و بد چاکر ہیں تیرے
اگرچہ ہیں بدیاں ان کے گھنیرے	ولے بے شبہہ کہلاتے ہیں تیرے
تو لپنے دین کا ہے آپ حامی	ہے میری عرض۔ یہ از راہ خامی
بلاشک ان کو دیوے گا ظفر توں	کرینگا دشمنوں پر ان کوں ورتوں
جو نیں ہیں تیری امت کے ہواخواہ	انھوں کو خوار کر دو جگمیں اے شاہ
رکھ ان کو نت ذلیل و خوار منکوس	دکھا مت مجھ کو ان کی شکل منحوس (۳۵)

(۴) مجبوب القلوب: یہ ایک مذہبی مثنوی ہے جس میں حضرت محبوب سبحانی سید عبد القادر جیلانی قدس سرہ کے احوال و مناقب۔ مستند و معتبر کتابوں کے حوالوں سے نظم کیے گئے ہیں، تاہم اس مثنوی کا اصل مآخذ علامہ شیخ نور الدین علی شطنوفی شافعیؒ کی معرکہ۔ آراء عربی تصنیف "بہجت الاسرار" ہے۔ حضرت آگاہ سے پیش تر کسی دکنی شاعر نے حضرت غوث اعظمؒ کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ نظم نہیں کیے تھے۔ یہ مثنوی گیارہ وصلوں (ابواب) پر مشتمل ہے اور ہر وصل میں کئی جلوے (فصل) ہیں۔ مصنف حمد و صلواۃ کے بعد اپنی مثنوی کے تعلق سے درج ذیل اشعار میں اظہار خیال فرماتے ہیں:

و لیکن امیاں اور اکثر عورات سمجھتے نیں ہیں بالکل فارسی بات
کیا میں اس لیے یہ نسخہ منظوم کہ ہو وے سب کو آسانی سے مفہوم
وہ سمجھیں غوث کے تا کچھ مناقب کہ حق کیا کیا دیا اس کو مراتب
بہت نسخوں سے یہ مضموں لیا ہوں بہت تحقیق سے اس کو لکھا ہوں
خلاصہ ان کتابوں کا میں لے کر کیا ہوں درج اس نسخے کے اندر
ولیکن بہجت الاسرار اے یار اصل ان سب کی ہے بے تکرار اے یار
ہے میرا اصل مآخذ یہ سفینہ اگرچہ دوسرے بھی ہیں خزینہ (۳۶)

اس مثنوی کو خالص اردو میں لکھنے کے بجائے دکنی میں منظوم کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

لکھا ہوں صاف یہ نظم اے برادر کہ ہے کام امیوں سے اس میں اکثر
لطافت شعر کی وہ جانتے نیں نزاکت اس کی وہ پہچانتے نیں
بھی اردو کی زباں میں نیں کہا میں کہ اس بھا کے کویاں کوئی جانتا نیں

اس مثنوی کا نام اور ابواب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں محبوب القلوب اس کا رکھا نام کہ ہے لائق اسے یہ باصفا نام
ہے اس نسخے میں گیارا وصل اے سور ہے ہر ہر وصل میں کیے جلوۂ نور (۳۷)

یہ مثنوی ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۱ء میں قلم بند کی گئی اور اس کے جملہ اشعار چار ہزار تر سٹھ ہیں، جیسا کہ کتاب کے آخر میں درج شدہ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

بحمداللہ یہ دل کش نسخۂ خوب | کہ ہے آئینہ دار حسنِ محبوب
کرم سے اس کے پایا اختتام اب | تھا ماہِ نو ہوا بدرِ تمام اب
تھا ششم سال باراسواپر جب | بفال خوش ہوا ہے یہ مرتب
تمام ابیات اس کے ای مساعد | ہوے چار الف و ترسٹ بے قصائد (۳۸)

۱۲۸۵ھ میں حیدرآباد دکن سے طبع شدہ "ریاض الجناں" کے مقدمہ میں "محبوب القلوب" کا سال تصنیف ۱۲۰۷ھ لکھا ہوا ہے، حالاں کہ "برٹش میوزیم لندن" کے قلمی نسخے میں باراسو چھے کی وضاحت موجود ہے۔

"اور بیچ کتاب محبوب القلوب کے کہ در ۱۲۰۶ھ کے منظوم ہوئی اور اس رسالہ میں ریاض الجناں نام رکھتا ہے تخلص اپنا وہی لفظ باقرر کھا ہے" (۳۹)۔

اس مثنوی کے آخر میں پچپن پچپن شعر کے دو قصیدے بھی موجود ہیں جو حضرت غوث اعظمؒ کی شان میں نظم کیے گئے ہیں۔ پہلے قصیدے کے ابتدائی اشعار اس طرح ہیں:

پڑا ہوں اور طۂ اندوہ محنت میں بحیرانی | مری اب دستگیری کر تو اے محبوب سبحانی
لیا ہے گھیر حیرت کا اندھیرا یوں مرے دل کو | کہ میرا روزروشن ہوگیا دیجور ظلمانی
مری تاریک شب ہوں گی بنم کے چاند سے تاباں | دکھا ویگا اگر اک جلوہ تیرا مہر نورانی
ہوا ہے سینہ میرا چاہ آسا تیرہ و تاریک | دکھا جھلکار اپنا یک وہاں ای ماہ کنعانی

اس قصیدہ کا عنوان قصیدۂ مفرج القلوب و مفرج الکروب در مناقب حضرت محبوب علی علیٰ جدہ و علیہ الصلواۃ والسلام رکھا ہے۔ دوسرا قصیدہ کا عنوان "قصیدۂ ذوالمطلعین در مناقب حضرت غوث الثقلین علی جدہ و علیہ الصلواۃ والسلام" ہے۔ اس قصیدے کے آغاز کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کیوں حسن کا دکھاوے ہے کروفر آفتاب | ٹک دور کر نقاب کہ ہو شپر آفتاب
کرتا ہے لعل سنگِ سیہ کو گر آفتاب | تو جام مۓ کو لعل سے اپنے کر آفتاب
نکلے ہے جب تو دن کو تو ہو دھوپ چاندنی | موج عرق سے شرم کے ہوکر تر آفتاب
بے پردہ جب کرے تو شب تار میں خرام | محشر ہو چوطرف کہ ہے تیزے پر آفتاب

ہے یہ غلط کہ راس و ذنب سے کسوف ہے ہووے گرفتہ زلف سے تیرے پر آفتاب (۴۰)

(۵) ریاض الجنان: یہ مثنوی اہل بیت کرام کے فضائل و مناقب میں ہے۔ اس میں بہ قول مصنف:

"اے بھائی اس رسالہ میں ایک مقدمہ اور بارہ روضے ہیں اور اکثر روضوں میں کیتک خیاباں ہیں یعنی بجائے باب روضہ اور بجائے فصل خیاباں اور بجائے فائدہ گل دستہ یا نفحہ مقرر کیا ہوں اور اس کے بنانے میں داد تہذیب و تحقیق کا دیا ہوں" (۴۱)۔

مقدمہ اور ابواب کی تفصیل اس طرح ہے:

مقدمہ: لفظ آل اور اہل بیت کی تحقیق

روضہ اول: اہل بیت کرام کی تعریف و توصیف میں نازل شدہ قرآنی آیات کا بیان

روضہ دوم: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمۃ الزہرا کی اولاد کے حق میں دعائے خیر و برکت کرنا

روضہ سوم: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت

روضہ چہارم: اہل بیت تاروں کی مانند اور کشتی نوح کے مماثل ہیں

روضہ پنجم: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت دنیا اور آخرت میں نفع بخش ہے

روضہ ششم: اہل بیت اطہار کو عذاب و عقاب سے خلاصی

روضہ ہشتم: آل سے بغض رکھنا سخت حرام ہے

روضہ ہفتم: اہل بیت کی محبت تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔

روضہ نہم: آل سے حسن سلوک واجب ہے

روضہ دھم: سادات کرام پر کونسی چیزیں واجب ہیں۔

روضہ یازدھم: شہادت امام حسن و امام حسین کا بیان

روضہ دوازدھم: قاتلین اہل بیت سے قدرت کا انتقام

مثنوی کی ابتدا درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

ہیں تری بندی میں کل موجود — کیا ملک کیا رسول سر بہ سجود
دیکھ تیری قدر کا سر عظیم — کیا سر انبیا نے بھی تسلیم
ہے موکل تری ولا پہ بلا — ہے ترا ورد اہلِ دل کی دوا
غم ترا عین شادمانی ہے — مایۂ عیش جاودانی ہے
عشق میں تیری ہر کدورت و رنج — صفوتِ انبساط کا ہے گنج
جس نے رہ میں تری دھرا ہے قدم — اس کو حاصل ہے منزلِ ماتم(۴۲)

سببِ تالیف اور مثنوی کی زبان کی یوں وضاحت کی ہے:

سارے اوصاف اون کے بالتفصیل — عربی ، فارسی میں ہیں پے قبیل
امیاں اور عورتاں اکثر — رکھتے نیں ہیں یہ دو زباں سے خبر
اور ہندی میں جو لکھے ابیات — نیں ہیں اون میں مناقب حضرات
ہے شہادت کا اوس میں ذکر فقط — سو بھی اکثر بیاں ہے اوس کا غلط
اس لیے میں بنایا یہ منظوم — تا باسانی سب کو ہو مفہوم
اس میں لکھتا ہوں کچھ مناقبِ آل — ایک با اختصار و با اجمال
ہیں سند اس بیاں کے بہوت کتاب — کہ ہیں تحقیق میں وہ لب لباب
جو یہ نسخہ میں ذکر ہیں یک یک — ترجمہ ہے حدیث کا بے شک
صاف اس واسطے لکھا ہوں میں — نہ سمجھ ہووے خوب اون کے تیں
شاعری کا نہیں ہے اس میں ڈھب — تا نہ ہو ذہن کو انو کے تعب
اور اردو زباں میں بولا نیں — کہ نہ سمجھیں گے اوس زبان کے تیں
ٹھیٹ دکنی میں بھی نہیں بولا — نظر آیا مجھے یہ طور اولیٰ(۴۳)

حضرت آگاہ کے دور میں دکنی بول چال کے تین مراکز مشہور و معروف تھے۔ ایک بیجاپور دوسرا حیدر آباد اور تیسرا مرکز مدراس تھا، اور ان تینوں مقامات کے لب و لہجے میں تھوڑا سا فرق اور لغات و الفاظ میں ذرا سا اختلاف بھی تھا۔ آگاہ کے آبا و اجداد چوں کہ بیجاپور کے باشندہ تھے اس لیے آپ کی مادری زبان "بیجاپوری" دکنی تھی جس کا اظہار آپ نے اپنی مثنوی "گلزار عشق" کے دیباچے میں کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ

"اول کہ تاثیرِ وطن یعنی دکن اس میں باقی ہے، کیا واسطے کہ اجداد پدری و مادری اس عاصی کے اور سب قوم اس کی بیجاپوری ہیں" ۔۔۔۔۔ آپ کی ابتدائی تصانیف مثلاً رسالہ، عقائد، تحفتہ النساء، ہشت بہشت، اور محبوب القلوب اسی دکنی زبان میں تحریر کی گئی تھیں تاکہ عوام الناس ان مذہبی موضوعات سے کماحقہ استفادہ کر سکیں۔ ایک عرصے بعد جب عوام کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں رفتہ رفتہ نمایاں تبدیلی رونما ہونے لگی تو حضرت آگاہ نے اپنے ان مخاطبین کی سہولت و سرعتِ فہم کی خاطر جن میں لامحالہ کم پڑھے لکھے مرد اور عورتیں ہوتی ہیں، ایک نئی زبان کی داغ بیل ڈالی، یہ زبان نہ تو شمالی ہند میں رائج بامحاورہ اردو تھی اور نہ جنوب کی زباں زد خاص و عام دکنی تھی بلکہ وہ ایک ایسی زبان تھی جس میں دکنی قواعد اور اردو محاورات میں اعتدال ملحوظ رکھا گیا تھا، وہ دو زبانوں کا سنگم تھی۔ حضرت آگاہ نے اسی زبان کو "ہندی" سے تعبیر کیا تھا، جیسا کہ آپ کی مثنوی "فرائد در فوائد" کا یہ شعر شاہد ہے:

کیا نیں شاعری کچھ اس بیاں میں
کیا ہوں صاف اسے ہندی زباں میں

یہی درحقیقت "ہندوستانی" ہے جس میں عربی اور فارسی کے نادر و غریب، بھاری بھرکم الفاظ سے شعر و ادب کا دامن بچایا جاتا ہے۔ چناں چہ آج بھی اس "ہندوستانی" زبان کی سیاسی بلکہ ادبی اہمیت مسلم ہے۔ بہ ہرحال اس نئی زبان کے بانی اور انوکھے اندازِ بیان کے موجد "علامہ باقر آگاہ" ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے۔

"ریاض الجنان" کے نثری دیباچے میں آپ نے ولی ویلوری اور شیدا حیدرآبادی پر کڑی تنقید کی کہ انھوں نے سیرت و شہادت کے واقعات کو نظم کرتے ہوئے صحت روایات کا لحاظ نہیں رکھا۔ جو بھی رطب و یابس ملا بغیر تحقیق کے شامل کر لیا۔ چناں چہ تحریر کرتے ہیں کہ:

بعضے علماء اس مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کیے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس بیان میں اب تک دیکھنے میں

نہیں آئی پس تصنیف ہونا اوسکا ہندی زبان میں معلوم مگر یہ کہ ولی ایلوری و شیدا حیدر آبادی دکنی زبان میں دو نسخہ منظوم لکھے نام ان کا "روضتہ الشہداء" اور "روضتہ الاظہار" مناقب عترت اخیار کے ان دونوں میں بہت کم ہیں بلکہ نہیں ہیں۔ وفیات و شہادت کی کچھ تفصیل کیے اور اکثر بیان ان دونوں کا غلط اور بے اصل ہے جیسا انتقام جھنا عکاشہؓ کا حضرت سے صلی اللہ علیہ وسلم اور اس تقریب سے برویت مہر نبوت مشرف ہونا یہ روایت موضوع (بے اصل) ہے۔ اے بھائی! عکاشہؓ بن محصن اسدی رضی اللہ عنہ سابقان مہاجرین سے ہے، اور ہمیشہ جلس وانیس اس جناب اقدسؐ کا ہے۔ ایسا صحابیِ خاص مدت تئیس برس میں مہر نبوت کو نادیکھا ہونا اور خواہش اوس کے دیکھنے کی اس بے ادبی سے کرنا از روئے قیاس طاہر کے بھی غلط ہے۔ اسی طرح اور مواضع میں بھی بہت بے اصل باتیں لکھے ہیں" (۴۴)۔

مذہبی مثنویوں کے نفس مضمون پر اس طرح کی جرح اور اس قدر مدلل تنقید حضرت آگاہ سے پہلے کسی شاعر و ادیب کی اردو تحریروں میں موجود نہیں تھی۔ آگاہ نے عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے ان تمام متعصب افراد پر سخت نکتہ چینی کی جن کی مذہبی حمیت کسی ایک خاص طبقے تک محدود رہی ہے۔

اس ضمن میں آپ رقم طراز ہیں:

"اے بھائی! یہاں بھی بعضے مردم اس طور کہ ہیں اگر مناقب حضرات خلفاء ثلثہؓ کے اون سے کہے تو ولولہ و طرب ان میں پایا جاتا ہے اور اگر مناقب حضرت امیر (حضرت علی) رضی اللہ عنہ کے کہے تو چنداں خوشی و جوشش نہیں کرتے ہیں بلکہ کسی بہانے سے اور اصحاب کرام کے ذکر طرف آتے ہیں۔ یہ طور خروج و رفض کے

خارستان کی یک شاخ ہے۔ سنی پاک مشرب کا طریقہ یوں ہے اگر ذکر حضرت صدیق اکبر کا آوے تو ایسا مشتاق ہو کر سنے کہ گویا صدیقی اور حضرت عمر کے ذکر میں فاروقی ہوئے اور حضرت عثمان کے ذکر میں عثمانی ہووے اور حضرت علی کے ذکر میں علوی ہووے رضی اللہ عنھم۔ بدستور حضرت امام حسن کے ذکر میں حسنی ہووے اور امام حسین کے ذکر میں حسینی ہووے و علی جدھما و علیھما الصلوٰۃ والسلام" (۴۵)۔

اردو نثر کی تاریخ میں آپ ہی نے سب سے پہلے نفس تاریخ کا تحقیقی جائزہ لیا اور مفکرین اور موافقین تاریخ کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتے ہوئے اعتدال کی راہ دکھائی۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

اے بھائی! یہ بات مشہور ہے کہ تاریخ کو اعتبار نہیں ہے۔ بعضے اس امر میں افراط اور بعضے تفریط کرتے ہیں، یہ دونوں امر بیجا ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ تاریخ یک قلم غیر معتبر و نامعقول نہیں ہے۔ کیا واسطے کہ حکم ناسخ و منسوخ کا اور دوسرے احکام عبادات و معاملات دینی کے، تاریخ پر مبنی ہیں گے اور سیر سید المرسلین کی اور مناقب خلفاء راشدین و ائمہ ماجدین کے صلی اللہ علیہ وسلم بھی فن تاریخ سے ہیں۔ اگر تاریخ بالکل منظور نہ ہووے تو ثبوت ان چیزوں کا کہاں سے ہووے گا۔ پس تحقیق اس مقام میں یہ ہے کہ اکثر اہلِ فن نے تساہل و سہل انگاری کے تیں شیوہ اپنا کر تواریخ کے لکھنے میں ضبط و تدقیق نہیں کیا، بلکہ رطب و یابس جو پایا سو لکھ لیا اس وجہ سے ان کی کتابوں میں غلط باتیں اور بے اصل روایتیں بہت پائے جاتے ہیں۔ جیسا حبیب السیر۔ روضتہ الصفا و روضتہ الشہدا۔ بخلاف حفاظ حدیث کے کہ تصانیف ان کی غایت تحقیق سے مقرون و

نہایت تدقیق سے مشحون ہیں" (۴۶)۔

اس مثنوی کا سنہ تالیف ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء ہے۔ سید شہاب الدین سقاف مہتمم مطبع رحمانی، حیدر آباد (دکن) نے ۲۱/ رمضان ۱۲۸۵ھ میں "ریاض الجنان" کو چھاپا اور کسی "حسین محی الدین" کے ذریعہ خواہ مخواہ بعض اشعار کی اصلاح کروائی اور کتاب کے آخر میں اپنے اس کارنامے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے یہ غلط اعلان کیا کہ مولوی محمد باقر آگاہ نے اس کتاب "ریاض الجنان" کو ۱۱۸۵ھ میں منظوم فرمایا۔ حالاں کہ اس مثنوی کے آخر میں مؤلف نے خود ہی سنہ تالیف کی وضاحت کر دی۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

جب تھے بارا سو اور سات برس تب بنا ہے یہ نسخۂ اقدس

اس مثنوی کے جملہ اشعار بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہیں گے ابیات اوس کے تین ہزار اور نود پہ نو بلا تکرار (۴۷)

مؤلف "گل دستۂ کرناٹک" نے اس کے اشعار کی تعداد سات ہزار بتائی ہے (۴۸) جو حقیقت سے بعید ہے۔

(۶) **تحفۃ الاحباب در مناقب اصحاب:** حضرت آگاہ کی یہ مثنوی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے مناقب میں بالخصوص عشرۂ مبشرہ کے احوال و فضائل میں نظم کی گئی ہے۔ یہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تعریف صحابہ میں، دوسرا باب فضائل صحابہ پر مبنی آیات قرآنی کے بیان میں، تیسرا احادیث مناقب صحابہؓ کے تعلق سے، چوتھا باب حضرت ابو بکر صدیقؓ، پانچویں باب میں حضرت عمر فاروقؓ، چھٹے باب میں حضرت عثمان غنیؓ، ساتویں باب میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے حالات و کمالات کے متعلق تفصیل درج ہے۔ اس کے بعد ابواب میں حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبیدہؓ، اور حضرت سعیدؓ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء میں تالیف کی گئی۔ اس کے ابیات کی تعداد تین ہزار چار سو چھبیس ہے۔ چناں چہ مؤلف رقم

طراز ہیں:

درسنِ یک الف و دو صدا اور سات ‌ ‌ ‌ ‌ فضل حق سے ختم پایا خوب دھات
مہینگے سب ابیات اس کے بے گماں ‌ ‌ ‌ ‌ سہ ہزار و چار سو چھبیس جاں

مؤلف فہرست اردو مخطوطات (کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد) نے "تحفۃ الاحباب" کی تاریخ تصنیف ۱۲۰۶ھ (۴۹) لکھی ہے اور مؤلف "تذکرۂ گلدستہ کرناٹک" نے اشعار کی تعداد سات ہزار بیان کیا ہے۔ مثنوی کی داخلی شہادت کی روشنی میں مذکورہ دونوں اطلاعات غلط ثابت ہوئی ہیں۔ اس مثنوی کے متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ البتہ گورنمنٹ اوری ینٹل میانس کرپٹ لائبریری مدراس میں موجود "تحفۃ الاحباب" کا ایک نادر مخطوطہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے جو مؤلف کے حین حیات نقل کیا گیا تھا اور اس کے کاتب حضرت ٹیپو سلطان کے منشی میر حسین علی کرمانی ابنِ سید عبدالقادر کرمانی ہیں۔ اس کا ترقیمہ اس طرح ہے۔ "تمت الکتاب تحفۃ الاحباب فی مناقب لاصحاب" من تصنیف مولوی محمد باقر آگاہ بتاریخ ماہ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ کاتبش میر حسین علی کرمانی" اس کے جملہ صفحات ۲۴۸ اور ہر صفحے پر پندرہ شعر درج ہیں۔

حضرت باقر آگاہ نے اس مثنوی کو بھی "ریاض الجناں" کی طرح "ہندی" یعنی ہندوستانی لب و لہجہ میں نظم کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

گرچہ ہے ہندی زباں کا اس میں ڈھب
معنی اوس کے ہے حقیقت میں عرب
از عنایات کریم کار ساز
کردیا میں نے دکن کے تیں حجاز

آپ نے اس مثنوی کے لیے صاف اور سادہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ مبالغہ آرائی اور رنگینی سے اس کو دور ہی رکھا، اس کے اسباب بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

شعر کا ہرگز نہ لایا اس میں ڈھب ‌ ‌ ‌ ‌ صاف بولا ہوں اسے از سہ سبب
پہلے یہ ہے کہ عوام اے نیک نام ‌ ‌ ‌ ‌ جانتے نیں شعر کی دقت تمام
وجہِ دیگر یہ کہ ہے ذکرِ صحاب ‌ ‌ ‌ ‌ ترجمہ اخبار کا ہے ارتیاب
شعر کی دقت سے نسبت کیا اسے ‌ ‌ ‌ ‌ جیوں حدیثوں میں ہے ووں کہنا اسے
تیسرا یہ ہے کہ تمہیدات میں ‌ ‌ ‌ ‌ استعارات اور تشبیہات میں
شاعری کا صرف اگر کرتا میں فن ‌ ‌ ‌ ‌ دیتا واں جوں چاہیے دادِ سخن

ہوتا یہ نسخہ مطول بالضرور ہمتیں مردم کے ہیں اب پر قصور
پس کروں میں کسی بھروسے پر دراز دے کر اس کو شاعری کا برگ و بار

آپ نے مذکورہ سادگی کے باوجود کہیں کہیں پرکاری سے بھی کام لیا ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

باوجود اس کے میں در بعضے محل کر گیا ہوں خوب اس فن پر عمل
کردیا ہوں اس کی میں ترتیب چست ترجمہ اخبار کا بولا درست
نیں کیا ہوں کچھ کم و بیش اس میں میں صاحب فن بوجھے اس محنت کے تیں

اس مثنوی میں آگاہؔ نے بہ طور تحدیث نعمت عربی، فارسی اور اردو پر اپنے کمال قدرت کا اظہار فرمایا اور اس ضمن میں سودا اور نصرتی پر تفاخر بھی کیا:

دیکھ تو ہندی کتابوں کو سبھی ہور قصائد، ریختوں کو دیکھ بھی
کیوں ہیں سب الفاظ وہ زیر و زبر خاص تازی فارسی ای با خبر
مجھ کو رب میرا دیا قدرت یتی کہ کہے النصر منکم نصرتی
کھولوں گر اردو کے بھاکے میں زباں سود سب سودا کا ہوجائے زیاں
جوں دیا ہندی میں جس مجھ کو خدا فارسی، تازی میں یوں ایکا کیا
فخر نیں کرتا ہوں میں اے نیک نام تیکھ تینوں بات میں میرا کلام

(۷) فرائد در بیانِ فوائد: یہ قرآنیات پر اردو کی اولین مثنوی ہے جس کو ستائیس فائدوں پر تقسیم کیا گیا ہے، عناوین اس طرح کے ہیں۔ اقسام وحی، کیفیت وحی، آسمان دنیا پر تمام قرآن مجید کا بہ یک وقت نازل ہونا، مکی اور مدنی سورتوں کی تعریف، قرآن شریف کے اجزا اور سورتوں کے نام، خصائص و فضائل کلام مجید، تدوین قرآن، قرأت سبعہ، اعجاز قرآن وغیرہ۔ مثنوی کی ابتدا مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

پس از حمد خدا و نعت مختار میں لکھتا ہوں فوائد کئے سن اے یار
نہیں ہر فائدے کو اس کے جوڑا کروں جو وصف میں اس کا ہے تھوڑا
یہ نسخہ گرچہ ہے ہندی میں منظوم بھی ہے اجمال سے ذکر اس کا مرقوم
ولے بحرِ ہدایت کا گہر ہے طلسم گنج قرآن و خبر ہے
یقیں کے باغ کا وہ تازہ پھل ہے رواقِ دیں کا شمعِ بے مثل ہے

حضرت آگاہ نے "ریاض الجنان" اور "تحفتہ الاحباب" کی طرح اس مثنوی کو بھی "ہندی" یعنی "ہندوستانی" میں لکھا تھا تاکہ عوام الناس کے فہم سے بالاتر نہو ہو۔ اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہے ہندی کر کے اس کو سہل مت جان — بہ غور و فکر اس کی قدر پہچان
کر اس نسخے کو دن رات اپنا گلہار — تو بہ رغبت شوقِ دل سے اس کا بلہار
کیا ہوں صاف اسے ہندی زباں میں — کیا نیں شاعری کچھ اس بیان میں
عوام الناس اور عورات یک سر — کریں تا اس کو آسانی سے ازبر
ہے زبدہ کئی کتابِ معتبر کا — خلاصہ ہے تفاسیر و خبر کا
"فرائد درفوائد" اس کا ہے نام — خدا اس کو کرے خوبی سے اتمام

یہ مثنوی ۱۲۱۰ھ میں لکھی گئی اور اس کے جملہ اشعار ایک ہزار پانچ سو دس ہیں۔ جیسا کہ خاتمہ میں بیان کیا گیا ہے:

بحمداللہ کہ یہ دل کش رسالہ — کہ قرآن و خبر کا ہے رسالہ
بہت جلدی ستے اتمام پایا — چھپے اسرار کو جلوے میں لایا
جسے ہے علمِ دیں ہو شوق جانی — کرے گا اس کی پوری قدردانی
تھے بارا سو پہ جب دس اے گرامی — بہ شہرِ صوم پایا ہے تمامی
تمام ابیات اس کے جو ہیں سب رس — ہوئے ہیں ایک ہزار و پانصد و دس
تصدق سے محمدؐ کے الہا — کہ اس نسخے کے تیں مقبول دلہا
حیات و موت کر ملت میں اس کے — تو میرا حشر کر امت میں اسؐ کے(۵۰)

اس رسالہ کے ابتدا میں بھی حضرت آگاہ نے چھ صفحات کا نثری مقدمہ قلم بند کیا ہے جس میں اپنی مثنوی کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ مقدمہ کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے:

"بعد حمد و نعت کے کہتا ہے محمد باقر شافعی قادری ویلوری کان اللہ، لہ و ختم بالصلحت عملہ، کہ اس رسالہ کا نام "فرائد در فوائد" ہے۔ ہر فائدہ اس کا در دانہ ء بے مول ہے اور خراج ملک معنیٰ کا ہم قول ہے۔ ہندی زبان میں ہے کر کر اسے سرسری نجان بلکہ امعانِ نظر

اور غور و فکر سے قدر اس کی پہچان" (۵۱)۔

(۸) گلزارِ عشق: یہ مثنوی حضرت آگاہ کی معرکہ آرا مثنویوں میں سے ایک ہے۔ اس میں رضوان شاہ اور روح افزا کی عشقیہ داستان نظم کی گئی۔ بہ قولِ یوسف کوکن عمری:

اصل قصہ فارسی میں تھا۔ منشی فائز نے سنہ ۱۰۹۴ھ میں اس کو دکنی میں نظم کیا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ اہلِ اسلام مدراس میں ہے۔ اس کی زبان قدیم ہے، اس کے کل صفحات ۲۵۴ ہیں اور ایک صفحہ میں نو سطریں ہیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ "گلزارِ عشق" کے لکھتے وقت فائز کی مثنوی پیشِ نظر تھی یا نہیں۔ بہ ہر حال آگاہ نے نصرتی کے "گلشن عشق" اور "علی نامہ" کو دیکھ کر ایک مثنوی کا تصور قائم کیا۔ ۱۱۹۱ھ میں اس کی ابتدا کی مگر چھ سو اشعار کے لکھنے کے بعد دوسری مشغولیتیں پیش آئیں اور یہ مثنوی یوں ہی ادھوری رہ گئی آخر انیس برس کے بعد ۱۲۱۱ھ میں اس کام کو ہاتھ میں لیا اور اس کی تکمیل کی چناں چہ خود ہی کہتے ہیں:

تھے جب یک ہزار اور نو کم دو سو — بنا اس کا دیباچہ اے گرم رو
گذر گیے ہیں جب اس پر انیس سال — ہوا بدرِ کامل یہ زیبا ہلال
کیا اس کے بیتوں کو جب میں عدد — ہوئے سہ ہزار اور پانسونود

(۵۲)

ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے لکھا ہے کہ "یہ مثنوی ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں لکھی گئی (۵۳) حکیم غلام علی رضا رائق مدراسی نے "گلزارِ عشق" کے اشعار کی تعداد چار ہزار بتائی ہے (۵۴)۔ مگر مذکورہ اشعار کی داخلی شہادت کی روشنی میں دونوں فاضلین کی رائے صحیح نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حضرت آگاہ نے اپنے دیباچہ میں بھی اس کی صراحت کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"الحال کہ تاریخ ہجرت باجاہ جلال کے یک ہزار و دو سو پر گیارواں

سال ہے، قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا پسند کر کر اوسے نظم کیا۔۔۔

(۵۵)

اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رضوان شاہ چین کے بادشاہ کا لخت جگر تھا جو ہر علم و ہنر میں یکتائے روزگار تھا، باپ کے مرنے کے بعد تاج و تخت کا مالک بن گیا تھا۔ ایک دن شکار کے لیے نکلا، اور شکار کی تلاش میں بہت دور نکل گیا تو روح افزا نامی پری ہرن کی صورت میں دکھائی دی۔ اس نے ہرن کا تعاقب کیا مگر ہرن ایک چشمہ میں جاکر لاپتہ ہو گیا، بادشاہ نے چاہا کہ چشمہ میں غوطہ لگا کر اس کا پیچھا کرے لیکن مصاحبین و ارکان دولت مانع ہوئے۔ بادشاہ اس پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ روز بہ روز عشق بڑھتا گیا۔ اس نے چشمہ کے کنارے ایک محل بنوا کر اس میں خود رہتے ہوئے روح افزا کا انتظار کرنے لگا، بالآخر وہ ایک رات اپنی اصلی صورت میں بادشاہ کے پاس حاضر ہو گئی۔ وصل کے خوشگوار لمحات نصیب ہوئے مگر بہت جلد جدائی بھی ہو گئی۔ دونوں ایک لمبے عرصے تک فراق کے مصائب برداشت کرتے رہے آخر کار دونوں کو دوبارہ وصال نصیب ہوا، دونوں کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس طرح بادشاہ بامراد اپنے ملک چین کو واپس ہو گیا۔

حضرت آگاہ نے مثنوی "گلزارِ عشق" سے پہلے ایک طویل اور شاندار دیباچہ لکھا جس میں کئی علمی و فنی مباحث کو اردو نثر میں پہلی بار پیش کیا۔ آپ دکنی زبان اور دکنی شعرا کی عظمت و برتری کے قایل تھے، اسی لیے لکھا کہ:

> "مقصد اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان بے معنی و ہرزہ سرایان لا یعنی، زبانِ دکنی پر اعتراض اور "گلشنِ عشق" و "علی نامہ" کے پڑھنے سے اعتراض کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے، زبان اون کے درمیان اون کے خوب رائج اور طعن شماتت سے سالم تھی۔ اکثر شعر وہاں کے مثل نشاطی و فراقی و شوقی و خوشنود و غواصی و ذوقی وہاشمی و بحری و نصرتی

و مہتاب و غیر ھم کہ بے حساب ہیں۔ اپنی زبان میں قصائد و غزلیات
و مثنویات و مقطعات نظم کیے اور داد سخنوری کا دئے"۔۔۔

آگاہ کے دورِ آخر میں ہی خالص دکنی زبان کا رواج عوام سے مٹتا گیا، لوگوں کو دکنی کہنے سننے سے شرم آنے لگی تو آپ نے اپنے مخاطبین کی نفسیات کا بروقت اور صحیح اندازہ لگا کر اس مثنوی کو صاف اور شستہ زبان میں نظم کیا تاکہ اہلِ ذوق کو اس سے استفادہ کرنے میں کسی طرح کا تکلف نہ ہو۔ چناں چہ اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب شاہانِ ہند اس گلشن جنت نظیر کو تسخیر کیے طرز روزمرۂ دکن نہجِ محاورۂ ہندی سے تبدیل پانے لگی۔ تا آں کہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی ۔۔۔۔ جب زبان قدیم دکنی اوس سبب سے کہ آگے مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے۔ اوسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو کہ قریب روزمرہ اردو کے ہے اختیار کیا

آپ کی موجودہ جملہ تصانیف کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی ابتدائی تصانیف جو ۱۱۸۴ھ تا ۱۲۰۶ھ کے درمیان لکھی گئیں دکنی زبان میں ہیں اس کے بعد ۱۲۰۷ھ تا ۱۲۱۰ھ کے مابین تحریر کردہ کتابوں میں آپ نے ہندی یعنی ہندوستانی زبان کو برتا ہے۔ پھر آپ نے اپنے آخری دور میں یعنی ۱۲۰۷ھ تا ۱۲۱۵ھ کے بیچ جتنی بھی کتابیں اردو میں لکھیں ان سب میں حتی المقدور معیاری اور محاوراتی زبان استعمال کی۔ اپنی وفات ۱۲۲۰ھ سے چار پانچ سال پیشتر آپ ضعیفی و بیماری کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے مشغلہ کو خیرباد کہہ دیا۔ اس طرح آپ کے تخلیقی مشاغل تین ادوار میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ رائے صدفی صد صحیح ہے کہ:

"باقر آگاہ نے اپنے اس (گلزارِ عشق) دیباچہ میں محمد حسین آزاد سے

سو سال پہلے برج بھاشا کو اردو کی اصل بتایا ہے۔ اور ریختہ و اردو کی روایت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :۔" ہندوستان میں مدت تک زبان ہندی کہ اوسے برج بھاشا کہتے ہیں رواج رکھتی تھی، اگرچہ لغت سنسکرت اون کی اصل اصول اور مخزن فنون فروع و اصول ہے۔ پیچھے محاورہٴ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کو اوس کی کھونے لگے۔ سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان "ریختہ" سے مسمیٰ ہوئی "(۵۶)۔

بعض اہل علم کی یہ رائے ہے کہ "آگاہ اردو اور دکنی کو دو علاحدہ زبانیں سمجھتے تھے "(۵۷)۔ حالاں کہ بات اس کے برعکس ہے۔ آگاہ نے یہ بات دوٹوک کہی کہ "شاہان ہند نے جب دکن کی سرزمین فتح کی تو "طرز روزمرہ دکنی نہج محاورہٴ ہندی سے تبدیل ہونے لگی "یہی "ہندی" دراصل "برج بھاشا" ہے اور یہی "برج بھاشا" رفتہ رفتہ عربی اور فارسی کی آمیزش کی وجہ سے "ریختہ" کہلائی۔ بعد ازاں اس "ریختہ" کا نام "اردو" رکھا گیا، چناں چہ آپ رقم طراز ہیں:

ولی گجراتی "ریختہ" کی ایجاد میں سبھوں کا مبدأ و استاذ ہے۔ بعد اس کے جو سخن سنجان ہند بروز (ظہور) کیے بہ شبہ اس نہج کو اوس سے لیے اور من بعد اوس کو باسلوب خاص مخصوص کر دیے اور اوسے "اردو کے بھاکے سے موسوم کیے ۔۔"(۵۸)

خلاصہ یہ ہی ہے کہ اردو اپنی ابتدائی شکل میں جب ملک دکن (کرناٹک) میں رائج ہوئی اور کسی خاص تبدیلی و تغیر کے بغیر جاری رہی تو دکنی کہلائی اور عربی و فارسی کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے ترقی کے منازل طے کر گئی تو "اردو" کے نام سے موسوم ہوئی۔

حضرت باقر آگاہ نے اپنی مثنوی "گلزار عشق" کو صاف و شستہ زبان میں لکھنے کے باوجود پوری طرح دکنی اثرات سے پاک نہ رکھنے کے وجوہ اس طرح بیان کیے ہیں:

" صرف اس محاورے میں کہنے سے دو چیز مانع ہوئے اول یہ کہ تاثیر وطن یعنی دکن اس میں باقی رہی ۔۔۔۔۔۔ دوسرے یہ کہ بعض اوضاع اس محاورہ کے میرے دل نہاد ہیں "۔

حضرت آگاہ نے دوسری وجہ کو سمجھاتے ہوئے بڑی خوبی سے دکنی اردو اور دہلوی اردو کے درمیان موجود فعل کی تذکیر و تانیث کے فرق کو بیان کیا ہے:

"تذکیر و تانیث فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہے اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے، اگر مونث ہے تو مونث، یہ قاعدہ موافق قاعدۂ عربی کے کہ سید السنہ ہے اور قیاس صحیح بھی اوس کی تائید کرتا ہے۔ برخلاف محاورۂ اردو کے کہ اس میں نسبت فعل کی مفعول کی طرف کر کر مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر کرتے ہیں "(۵۹)۔

اردو داں حضرات عام طور پر عربی الفاظ کے صحیح تلفظ کا لحاظ نہیں رکھتے ہیں۔ اس پر تنبیہہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اے برادر سب دکنی کتابوں کو ایک طرف دھر، کلام ریختہ گویوں پر انصاف سے نظر کر کہ اکثر الفاظ عربی و فارسی اوس میں زیر و زبر ہیں۔ برخلاف اس گلزار کے کہ پھولیں اس کی شکست و ریخت سے سلامت ہیں ۔ اگر کوئی لفظ کے اعراب خلاف مشہور نظر آویں تو خلاف صواب کا گماں مت کر جیسا لفظ " امن " اور " لفظ " شہر " ۔ اس میں کہیں حرکت میم و حرکت ہا لایا ہوں اگرچہ مشہور دونوں کا ساکن ہے۔ حالاں کہ دونوں لفظ زیر سے میم وہا کے لغت فصیح ہے "
(۶۰)۔

آپ مثنوی میں نصرتی کو تمام سے افضل قرار دیتے ہیں کہ ملک الشعرا نصرتی کی زبان اگرچہ کہ قدیم ہے مگر اس کے ہاں جو کیفیت اور معنیٰ آفرینی ہے اس کی سطح بہت بلند ہے۔ اور مرزا رفیع سودا کے محاسن و معائب پر ان الفاظ میں جچی تلی تنقید

کرتے ہیں کہ:

ہم انصاف کرتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا قصائد و غزل میں بڑا سخن تراش و صاحب تلاش ہے۔ محاورۂ شستہ و صاف میں یگانہ، زمانہ اور شوخیِ مزاج و رنگینیِ طبیعت میں ہر کہیں افسانہ، پر سو افسوس کہ ہجوہائے رکیک سے آشنا اور اندازِ تدین و تمکین سے بیگانہ تھا" (۶۱)۔

حضرت آگاہ نے ظاہر داروں اور نرے ملاؤں کے اعتراضات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی اس عشقیہ مثنوی کے تعلق سے یہ وضاحت کر دی کہ:

" (اس مثنوی میں) وہ مضامین تازہ اور اندازہ ہائے بلند آوازہ لایا ہوں کہ حسن و عشق آفریں اور ناز و نیاز تحسین کریں ـ ـ ـ ـ ہر محل مناسب میں داد سوز و ساز عشق کا دیا ہوں اور معانیِ عرفان کو لباسِ مجاز میں ادا کیا، اکثر رسوم شادی میں کہ معروف و مشہور ہیں۔ نکات دقیق معرفت کے بولا ہوں۔ عقدہ ہائے حقائق کو ناخن زبان قلم سے کھولا، اگر کوئی فقیہ جامد اس محل میں میرے پر انکار کرے کہ یہ امور سب بدعت و ناروا ہیں، توجیہات ایسی رسموں کی خلاف شریعت غرا جواب اس کا یہ ہے کہ اگر منکر کمال تصوف و اہلِ تصرف کا مقر ہے تو یہ اعتراض اوس کا بیجا اور نہایت نارسا ہے۔ و اگر معارف و اہلِ مکاشف کا منکر ہے تو بھی ایرار اوسکا پوچ و نازیبا "

(۶۲)۔

خمسۂ متحیرۂ اوج آگاہی: حضرت آگاہ کی یہ کتاب دراصل آپ کی پانچ معرکہ آرا مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مثنویاں ۱۲۱۲ھ سے ۱۲۱۵ھ کے درمیان لکھی گئی تھیں۔ ان میں پہلی مثنوی " صبح نور بہار عشق " ہے جو عشق ذاتی، صفاتی، افعالی اور آثاری کی تفصیلات پر مبنی ہے اور اس میں لیلیٰ مجنوں کی داستان اور شیخ اکبرؒ کی حکایت بہ طور تمثیل درج کی گئی ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا میں ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ مثنوی

۱۲۱۲ھ میں نظم کی گئی تھی جیسا کہ خود مصنف کے درج ذیل تاریخی اشعار سے واضح ہوتا ہے:

کیا جب جلوۂ صبح بہاری　　اندھیرا سرد مہری کا چلا ہے
کیا جب فکرِ تاریخ اس کی آگاہ　　کہا ہاتف " شرارہ عشق کا ہے "

نصیر الدین ہاشمی نے تاریخِ تصنیف ۱۲۰۹ھ (۶۳) اور ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے ۱۲۱۳ھ (۶۴) تحریر کی ہے جو غالباً سہو کا نتیجہ ہے۔

دوسری مثنوی " ندرتِ عشق " ہے جس میں جنوب کے مشہور و معروف عشقیہ قصہ "چندر بدن مہیار" کو نظم کیا گیا ہے۔ اس داستان کو سب سے پہلے دکنی میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری (متوفی مابین ۱۰۷۵ھ ۱۰۸۰ھ) نے ۱۰۳۵ تا ۱۰۵۰ھ کے درمیان نظم کیا تھا مگر اس مین صرف عشق مجازی ہی کی جلوہ سامانی ہے۔ آگاہؔ کی مثنوی "ندرت عشق" میں حقائق و معارف کے دریا بہائے گئے ہیں۔ مثنوی کے جملہ اشعار ۱۵۵۲ (ایک ہزار پانچ سو باون) ہیں۔

مثنوی کا آغاز درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

کہوں کیا ترا حمد اے ذوالجلال　　کہ انت الجمیل و انت الجمال
عدم تھے جو ظلمت میں بے ما و من　　ہوئے نور سے تیرے چندر بدن
تری ضو کی جب مہہ میں آثار ہیں　　چکور اور کتاں اوسکے مہیار ہیں

اس مثنوی کے جملہ عنوانات اشعار میں ہیں۔ تاریخ تصنیف شاعر کے اس شعر سے برآمد ہوتی ہے:

میں چاہا جب کروں نظم اوسکی تاریخ　　کہا ہاتف عجب ہے ندرتِ عشق ۱۲۱۴ھ

دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور کے کتب خانہ میں "خمسہ متحیرۂ اوج آگاہی" کا نادر نسخہ موجود ہے۔ جس میں "ندرت عشق" بھی شامل ہے، مثنوی کے اختتام پر حضرت آگاہ کے ہم عصر حضرت شاہ غوثی آرکاٹی (متوفی ۱۲۲۵ھ) مصنف ریاضِ غوثیہ، قصص الانبیاء، ضیافت نامہ کا تاریخی قطعہ مرقوم ہے، جس کا عنوان اس طرح ہے۔ "مثنوی در تعریف و تاریخ "ندرتِ عشق" از سید محمد غوث غوثی تخلص"

ابتداء: کہوں کیا عجب ندرتِ عشق
که جس سے عیاں قدرتِ عشق

اختتام: ہو مشتاق غوثی قلم سے کہا
کہ نغمہ سنا اس کی تاریخ کا
ستابی سے طرح دوی کر ضمیر
سنایا عجب قصہ دل پذیر ۱۲۱۴ھ

مولانا یوسف کوکن مرحوم نے لکھا کہ "مولانا آگاہ نے یہ مثنوی "ندرتِ عشق" ۱۲۱۵ھ میں لکھی تھی جو ان کی عمر کا آخری زمانہ تھا کیوں کہ اس مثنوی کے لکھنے کے بعد پانچ سال بعد انھوں نے مدراس میں وفات پائی" (۶۵)۔

مولانا کا مذکورہ بیان مثنوی کی داخلی و خارجی شہادتوں کی موجودگی میں درست نہیں ہے۔

اس مجموعے کی تیسری مثنوی "غرقابِ عشق" ہے۔ اس مثنوی میں رودِ گنگا کے ساحل پر واقع ہونے والے عشقیہ داستان کو موضوع بنا کر عشق حقیقی کی طرف رجوع ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

نہ کیوں حیراں ہوا وس حمد میں من | نظارہ کو کیا جو دل کا درپن
بنایا حسن کو آئینۂ عشق | عیاں جس سے ہوا گنجینۂ عشق
صل مولانا علیٰ خیرالوریٰ | سیدالاملاک ختم الانبیاء
باہر آیا ناگہاں کہتا ہوا | کیا ہے حسن و عشق کے دریا کا جوش

۱۲۱۵ھ

"غرقابِ عشق" کی تاریخِ تصنیف ۱۲۱۵ھ ہے جیسا کہ مذکورہ اشعار کے آخر کے پورے مصرعے سے مطلوبہ سال برآمد ہوتا ہے۔ مرتب (۶۶) اردو مخطوطات نے تاریخِ تصنیف ۱۲۱۴ھ رقم کی ہے جو مذکورہ حقایق کی روشنی میں صحیح نہیں ہے۔

اس مجموعے کی چوتھی اور پانچویں مثنوی بالترتیب "حیرتِ عشق" اور "حسرتِ عشق" ہے۔ ان دونوں کا موضوع بھی عشق و محبت اور معرفت و حقیقت ہے جیسا کہ دیگر تینوں مثنویوں کا ہے۔

مؤلف گل دستہ، کرناٹک نے لکھا ہے کہ اس مجموعے یعنی " خمسہ، متحیرۂ اوج آگاہی " کے کل اشعار تقریباً چار ہزار ہیں۔

(۱۱) روضتہ الاسلام: حضرت آگاہ نے یہ مثنوی اپنی دختر نیک اختر کنیز فاطمہ کے لیے لکھی تھی۔ اس کا موضوع فقہ۔ شافعیؒ ہے۔ اس کے کل اشعار دو ہزار چار سو چوبیس ہیں، جیسا کہ درج ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے:

ہیں سب ابیات اس کے بے تلبیس　　" دو ہزار چار سو چوبیس "

یہ مثنوی سنہ ۱۲۱۴ھ میں تحریر کی گئی تھی۔ چناں چہ اس کا تاریخی شعر:

کہا از سرِامداد سروش　　بول اٹھا روضۂ دین و اسلام ہے

۱۲۱۳ +۱

جس سے مطلوبہ تاریخ ۱۲۱۴ھ کا استخراج ہوتا ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے:

حمد ہے اس علیم برحق کا　　جو ہے فیاض علم مطلق کا
چاہا جس کو چلانے خیر کی راہ　　کر دیا اس کو فقہ سے آگاہ
جس پہ کرتا ہے اپنا فضل و کرم　　اس کو کرتا ہے علم سے ہمدم

وجہ تصنیف کے بارے میں رقم طراز ہیں:

اب میں لکھتا ہوں کچھ مسائل فقہ　　تا خبردار ہووے سائل فقیہ
بعضے احباب اس کے تھے خواہاں　　چہیتے تھے اس کے تیں بصد دل و جاں
خاص کر نور چشم و جان عزیز　　نام ہے جس کا فاطمہ کی کنیز
دل سے شائق ہے علم دیں کی سدا　　دیوے توفیق اسے زیادہ خدا (۶۷)

(۱۲) مثنوی روپ سنگار: حضرت آگاہ کی یہ ایک نادر و نایاب مثنوی ہے جس میں آپ نے اردو زبان میں پہلی بار " نائکہ بھید " پر قلم اٹھایا ہے۔ سنسکرت شاعری میں عورتوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے جذبات و کردار اور عادات و اطوار پر جو بحثیں ملتی ہیں، حضرت آگاہ نے اپنی مثنوی میں ان سب کی تفصیل بیان کی۔ علاوہ ازیں آپ نے " روپ سنگار " میں " رس " کی تعریف اور اس کی اقسام، عشق اور اس

کے اسباب و معقولات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "ہر عورت کے جذبات کی خصوصیات سنسکرت شاعروں نے جس طرح قلم بند کی ہیں ان کی وضاحت کے لیے آگاہ نے خود ہی دھرے اور کبت تصنیف کیے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کبت درج ذیل ہے جو "دھیرا نائکا" کا ترجمان ہے:

نہیں یہ کاجل زحل طرح کا ہلال لب پر ترے پیارے
کیا ہے بل مہر تجھ دہن پر سیاہ بختی نے میری آرے
نہیں ہوئی ہے گی شب کی جگنی سے لال ایسی نین تمہارے
وہ آرسی سے نگہہ کے جوہر ہوے ہیں رنگیں مژہ ہمارے (۶۸)

۳۷۰ ابیات کی اس عجیب و غریب مثنوی کے آغاز میں عربی زبان کی فضیلت و برتری بیان کی گئی ہے پھر "سنسکرت" زبان کی تعریف و توصیف کی گئی۔ مصنف نے "سنسکرت" کے لیے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جناں چہ شاعر کا ارشاد ہے:

زبانیں جو مروج ہیں بہ عالم — کہ شہرت سے ہوئے ہیں وہ مکرم
سنے ہم بعض اور بعضوں کو دیکھے — نگاہ غور سے سب کو پرکھے
نہیں کوئی ان میں ہے ہندی کے مانند — ہے جس کا نام سنسکرت اے خردمند
ہے بس وسعت اس کی بے حد اے گرامی — فصاحت اور تفرد سے ہے نامی

اس مثنوی کے مواد کو آپ نے حضرت امیر خسروؒ کی تصنیف "نہ فلک" اور حضرت جلال الدین سیوطیؒ کی "غایۃ الاحسان" وغیرہ معتبر و مستند کتابوں سے اخذ کیا ہے، جس کا اظہار آپ نے جا بہ جا بلا تکلف کر دیا ہے۔ اس مثنوی کی وجہ تسمیہ اور تاریخ کے تعلق سے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بنا جب حسن کا آئینہ اوتار — رکھا میں نام اس کا روپ سنگار
ہے یہ "روپ سنگار" وہ آرسی — کہ منہ اپنا دیکھے وہاں حسن و عشق
میں جب سال تاریخ چاہا سروش — کہا میں عجب گلفشاں حسن و عشق ۱۲۱۵ھ
ہے اب ہجرت سے بارہ سو پہ پندرا — کہ اعجاز اس کا ہے جیسے کا ویسا

مثنوی کا آغاز ان شعروں سے ہوتا ہے۔

پس از حمد خدا و نعت مختار — سن اس مضمون کو گوش دل سے اے یار

کہ ہے تازی زباں کی طرز تازی — کرے ہے نت فلک پر ترکتازی

اختتامی اشعار اس طرح ہیں:

درودیں بھیج ہردم اوس پہ یارب — اور اوس کے آل اور اصحاب پر سب

اور اس کے تابعانِ خاص اوپر — خصوص اوس پر جو ہے محبوب اکبر

اس مثنوی سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آگاہ عربی و فارسی کی طرح سنسکرت اور ہندی کے بھی عالم و فاضل اور ماہر و کامل تھے۔

(۱۳) ریاض السیر: ایک سو اٹھائیس صفحات کا یہ نثری رسالہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد (کتب خانہ۔ آصفیہ) کی زینت ہے۔ اس کتاب کا موضوع سیرت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ مخطوطہ میں کہیں بھی مصنف کے نام کی صراحت موجود نہیں ہے۔ مگر نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ یہ شاید باقر آگاہؔ ہی کی تصنیف ہو (۶۹)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (۷۰) اور ڈاکٹر افضل الدین اقبال (۷۱) نے اس کتاب کو بغیر کسی تردد و تبصرہ کے باقر آگاہؔ کی طرف منسوب کیا ہے۔

بہ ہر حال اس کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

> "تمہیدات بے نہایت اور تمجیدات بے غایت ثابت ہے۔ اس ذات خدائے بے ہمتا۔ بے چون و بے چگونہ بے شبہ و بے نمونہ کو کہ مماثل سے پاک، عیب و نقصان سے مبرا، ظلم و تعدی سے منزہ واحد احد صمد فرد یک اکیلا ہے۔"

آخر میں چند شعر دیے گئے ہیں مثلاً:

بے ہوش کر اپنا رخ دکھا کے — صدقے میں بتول پارسا کے

دے دو جہاں میں امن چین — یارب بہ تصدقِ امامین

اس کتاب کے دو اور نام مذکور ہیں۔ ایک مولود شریف دوسرا حقیقت نورِ محمدیؐ۔

حضرت آگاہ کی مذکورہ تصنیفات کے علاوہ بعض اہلِ علم نے دیگر کتابوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے مگر تفصیلات پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے لکھا ہے کہ:

"کتب خانہ، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) میں آگاہ کی دو کتابوں رسالہ۔
تعزیہ داری اور شرح کلمہ، لسان مجمل (مثنوی) کے مخطوطے محفوظ ہیں
(۷۲)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے احسن التبیین، کراماتِ قادریہ اور ادب سنگار کا ذکر کیا ہے۔ "احسن التبیین" جس کا پورا نام "احسن التبیین فی آداب المتعلمین" ہے، فارسی تصنیف ہے جس کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ "ادب سنگار" "غالباً" روپ سنگار" ہی کا دوسرا روپ ہو۔

فہرست کتب خانہ، مدرسہ، محمدی (مدراس) میں وفات نامہ، رسول اللہ اور مناجات مولوی باقر صاحب نامی کتابوں کا ذکر موجود ہے (۷۳)۔ ممکن ہے کہ یہ مستقل تصنیفات نہ ہوں بلکہ کسی ضخیم کتاب کا حصہ ہوں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی فہرست میں حاشیہ، "من درپن" کا تذکرہ اور تعارف کے ضمن میں سبب تالیف کے اشعار نقل کیے گئے ہیں (۷۴):

پس از حمدِ خدا و نعت مختار — سن اس مضمون کو گوشِ دل سے اے یار
کہ "من درپن" میں بولا میں بلاعجاز — باٰئین بہیں قرآں کا اعجاز
جب اس کو مختصر تر کردیا ہوں — کئی جا میں اشارت کر گیا ہوں
یہ نظمِ صاف کے تئیں اب کہا میں — بہ طور حاشیہ اس پر لکھا میں

مذکورہ اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کوئی مستقل تالیف نہیں ہے بلکہ "من درپن" کا حاشیہ ہے، لہذا ۲۵۰ ابیات کے اس مثنوی کو اس کا حصہ یا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ مؤلف "یورپ میں دکنی مخطوطات" نے پیارس (Paris) کے قومی کتب خانے کے حوالے سے حضرت آگاہ کے تین رسالوں ہدایت نامہ، معراج نامہ، اور رسالہ۔ فرقہ ہائے اسلام کا قدرے تعارف کرایا ہے (۷۵)۔ مثنویوں کے ابتدائی اور انتہائی اشعار بھی پیش کیے ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ انھوں نے ان رسالوں کی مکمل جانچ نہیں کی ورنہ ان رسالوں کو باقر آگاہ کی طرف منسوب کرنے کی غلطی نہیں کرتے در حقیقت ہدایت نامہ اور معراج نامہ باقر آگاہ کے مربی و مرشد حضرت سید شاہ

ابوالحسن قربیؔ (متوفی ۱۱۸۲ھ) کی تصنیفات ہیں۔ راقم الحروف کے پاس ہدایت نامہ، قربیؔ کے مطبوعہ رسالہ کی نقل (زیراکس) موجود ہے۔ یہ رسالہ مطبع ۱۳۰۵ھ میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اس رسالہ (ہدایت نامہ) کے ساتھ ایک اور رسالہ "ہدایت نامہ" بھی منسلک ہے۔ مثنوی "معراج نامہ" کا مخطوطہ کتب خانہ، آصفیہ حیدرآباد کی زینت بنا ہوا ہے۔ خود نصیرالدین ہاشمی نے اس مخطوطہ کا تفصیلی تعارف "اردو مخطوطات" جلد اول میں کرایا ہے (۷۶)۔ باقرآگاہ کی طرف منسوب رسالوں اور حضرت قربی کے رسالوں کے ابتدائی اور اختتامی اشعار ہی نہیں بلکہ درمیان کے منتخب اشعار میں بھی یکسانیت ہے، علاوہ ازیں ان رسالوں میں باقرآگاہ کا تخلص کہیں نہیں ہے البتہ حضرت قربی کا نام اشعار میں استعمال ہوا ہے۔ لہذا اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں رسالے یعنی "ہدایت نامہ" اور "معراج نامہ" حضرت آگاہ کی نہیں بلکہ حضرت قربی کی تصنیف ہیں۔ البتہ "فرقہ ہائے اسلام" کے بارے میں کوئی بات وثوق سے کہیں نہیں جاسکتی ہے۔

(۱۴) دیوان آگاہ: یہ دیوان غزلیات، قصائد، مثنوی، مرثیہ اور قطعات و رباعیات وغیرہ تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ دیوان کے ابتدا میں بیس صفحات کا طویل مقدمہ درج ہے۔ غزلوں کی تعداد تقریباً تین سو تین ہے۔ قصائد جملہ دس ہیں۔ پہلا قصیدہ مسمیٰ بہ طلسم گنج توحید در تحمید حضرت قیوم وحیہ شانہ، و عزبرہانہ ہے۔ اس قصیدے کے تعلق سے شاعر کا دعویٰ ہے کہ حمدیہ تشبیب سے مزین اس طرح کا قصیدہ اردو زبان میں پہلی بار تحریر کیا گیا ہے۔ چناں چہ مقدمہ کے آخر میں آپ لکھتے ہیں:

> "قصیدۂ اول کہ حمد و سپاس حضرت قیوم اجل میں ہے۔ عزوجل مشبب ہے، اب تک عربی و فارسی و ہندی میں قصیدۂ مشبب حمد میں اس عاصی کو نظر نہیں آیا"۔

حضرت آگاہ کے جملہ قصائد یا تو حمد و نعت سرور کونین میں ہیں یا اہل بیت و اولیا کی منقبت میں۔ آپ نے کسی نواب یا کسی امیر کبیر کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا،

حالاں کہ دربارِ والاجاہی سے قریبی تعلق اور خصوصی ربط وضبط رہا ہے۔ بہ ہر حال دیوان میں شامل قصائد کی زبان منجھی ہوئی ہے۔ پرشکوہ الفاظ اور بلند آہنگ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ تشبیہہ و استعارات کی فراوانی اور علو خیالات کی ارزانی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ بالخصوص قصیدۂ کافیہ اور لامیہ کے تعلق سے خود شاعر کو فخر ہے کہ:

> خصوصاً قصیدۂ کافیہ کہ حضرت خیر البریہ علیہ الصلواۃ والتحیہ کے شمائل قدسیہ میں باسلوب کنایت و مجاز کہا گیا ہے اور تصور میں ناظم کے منتہاء لطافت و دقت کو پہنچا اور قصیدۂ لامیہ ہلالیہ کہ تشبیہاتِ تازہ سے لبریز اور مضامین تلاشی بلند آوازہ سے شور انگریز ہے۔ صاحبان استعداد ان دونوں قصیدوں کو غور سے دیکھیں اور داد دیویں۔"

البتہ غزلوں کی زبان صاف، شستہ اور سادہ و پاکیزہ ہے۔ فارسی اور عربی کے تراکیب کا بوجھل پن ان غزلوں میں بہت کم ہے جس کی وجہ سے اشعار میں سلاست و روانی پیدا ہو گئی ہے اور بندش میں چستی و شگفتگی نمودار ہوئی ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اگرچہ حشر کا طوفاں مچایا اشک مرا ۔۔۔ گزار راہ میں تیری نہ پایا اشک مرا
یہ مشتِ خاک سے میرے تھا دل میں تیرے غبار ۔۔۔ ہزار شکر کہ اوسکو اٹھایا اشک مرا
ہوا ہے کون سے خورشید رو سے گرم اتنا ۔۔۔ کہ مرے دل کو جو ایسا جلایا اشک مرا

اس خستہ حال پر تو کر اب لطف یا نہ کر ۔۔۔ میں نے تو حالِ دل کا تجھے سب سنادیا

جو چاہے سو ہو، ایک نہ عاشق ہو۔ سخن مان ۔۔۔ یہ عشق بلاخیز عجب کچھ ہے بھبو کا

تھمتا نہیں طفلِ اشک ہر چند ۔۔۔ گہوارۂ چشم میں سلایا

تجلی میں کس کی فنا ہوگیا ہوں ۔۔۔ کہ ہستی نے سایہ کو میرے نہ پایا

پہلو میں مرے ہے نام کو دل ۔۔۔ گر صبح ہے، نہیں ہے شام کو دل

زلف میں منہ کو چھپایا نہ کرو　　شام کو صبح میں لایا نہ کرو

خواب شیریں سے نہ شیریں کو جگایا افسوس
ہرزہ جولاں ہے عبث نالہ فرہاد ہنوز

قیامت نے خرام ناز تیرا دیکھ کر پیارے
کھڑے قد کی بلالیتیں ہے تیرے بار بار آرے

پیری میں کٹ گئی سب افسوس زندگانی
دیکھی کبھی نہ ہم نے ہوتی ہے کیاجوانی

ہے یار کا میرے سینے میں بود و باش ہنوز
عجب ہے پھر مجھے اس کی ہے کیوں تلاش ہنوز

ہر اشک میرا تھا رشک یاقوت
ایسے کو تو خاک میں ملایا

ناکارہ و بے چارہ و آوارہ دل آگاہ
المنۃ للہ مرے دل دار کو بھایا

شعر کے گرچہ قلم رد کو ہی چھوڑا آگاہ
عرب و ہندو عجم میں ہے مرا داب ہنوز

حضرت آگاہ نے ابتدا میں اپنے معاصرین خواجہ میر درد، سراج اورنگ آبادی اور مظہر جان جاناں وغیرہ مشاہیر شعرا کی زمینوں میں طبع آزمائی کی اور مرزا محمد رفیع سودا سے بھی متاثر رہے مگر رفتہ رفتہ آپ کا کلام پختہ ہوتا گیا اور آپ نے اپنی راہ الگ نکالی۔ دکنی بولی چھوڑدی، ہندی یا ہندوستانی کو بالائے طاق رکھا اور اردوئے معلیٰ میں غزلیں کہیں، خالص محاورتی زبان میں مثنویاں رباعیاں اور قصیدے لکھے مگر افسوس کہ شمالی ہند میں شہرت کیا پاتے۔ تاریخ ادب اردو میں اس دور کے ممتاز شعرا کی فہرست میں بھی شمار نہیں کیے جاسکے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> آگاہ اردو کے بہت بڑے محسنوں میں سے ہیں۔ نثر و نظم دونوں پر قابو۔ غزل، قصیدہ، مثنوی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ واقعہ یہ

ہے کہ دکنی علم و فضل اور شعر و سخن ان پر ختم ہو گیا۔ ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب اور شاعر پیدا نہ ہو سکا، وہ میر اور سودا کے ہم عصر تھے لیکن زبان قدیم استعمال کی ہے۔ اس لیے شمالی ہند میں شہرت حاصل نہیں ہوئی" (۷۷)۔

ڈاکٹر زور مرحوم کے خیالات ہی کی باز گشت ڈاکٹر جمیل جالبی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا زور استدلال درج ذیل اقتباس میں نمایاں ہے، ملاحظہ ہو

"جب دکن کا اثر ختم ہوا اور بحیثیت ادبی زبان کے اس کا سر چشمہ سوکھنے لگا اور شمال کی زبان کا محاورہ صاف شستہ و معیاری سمجھا جانے لگا تو دکنی میں لکھنے والے ادیب و شاعر جدید اور زندہ روایت کے دھارے سے الگ ہو گئے اور ان کی آواز تاریخ ادب کے کانوں کو گراں گزرنے لگی۔ "محمد باقر آگاہ" اور "شاہ تراب" قسم کے شعرا و ادیب تاریخ کی اسی بے رحمی کا شکار ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے جدید ادبی زبان کو اس وقت پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش کی تھی جب نہ دکنی زبان کی رسم باقی رہی تھی اور نہ بدلے ہوئے تہذیبی و معاشرتی حالات میں اس کی کوئی قدر و قیمت تھی یہ کوشش بالکل ویسی ہی تھی جیسے آج کوئی ولی کی زبان میں شعر کہنے کی سعی کرے" (۷۸)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا مذکورہ بالا بیان دراصل حضرت باقر آگاہ کو دل چسپی اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہ کرنے کا شاخسانہ ہے ورنہ "باقر آگاہ" پر جدید ادبی زبان کو پیچھے کی طرف لے جانے کا الزام لگایا نہیں جا سکتا۔ یہ بات اس سے پیش تر تفصیل سے بتائی گئی تھی کہ درحقیقت باقر آگاہؒ کے تین دور ہیں۔ پہلے دور میں انھوں نے خالص دکنی زبان استعمال کی۔ دوسرے دور میں ہندی زبان کو بروئے کار لایا اور تیسرے اور آخر دور میں صاف و شستہ اردو یعنی بامحاورہ زبان میں غزلیں اور مثنویاں کہیں۔

بہ قول مولانا یوسف کوکن مرحوم:

"تیسرے حصہ کی زبان تو خالص اردو ہے۔ قصائد جذبات سے لبریز ہیں، الفاظ میں بھی شان و شکوہ پایا جاتا ہے، طرزِ ادا بہت ہی عمدہ ہے غزلوں میں فارسی کا تتبع ہے۔ صحتِ زبان اور محاورہ کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ حسن و عشق کی واردات کے ساتھ معرفت اور تصوف کے خیالات بھی قلم بند کیے گئے ہیں" (۷۹)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا اعتراض اس لیے بھی بے محل ہے کہ خود حضرت آگاہ اپنی مثنوی "گلزارِ عشق" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ:

"جب شاہانِ ہند اس گلشن جنت نظیر کو تسخیر کیے، طرز روزمرہ دکنی، نہج محاورۂ ہند سے تبدیل پانے لگی تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی ۔۔۔ جب زبان قدیم دکنی اس سبب سے کہ آگے مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو کہ قریب روزمرہ اردو کے ہے اختیار کیا ہے" (۸۰)

باقر آگاہؔ نے اپنی آخری عمر میں اپنا دیوان مرتب کیا تھا، دیوان کے مقدمہ میں دیوان کے مشتملات کی زبان کے تعلق سے برملا اظہار فرمایا کہ:

"یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے، سب اقسام سخن پر مشتمل ہے اور اوسے محاورہ اردو سے مخصوص کر دیا، جسے تفننِ سخن میں پوری رسائی اور تصوف و چاشنیٔ محبت سے جوں چاہیے آشنائی ہے۔ انداز اس کا بواقعی جانے گا اور رتبہ اس کا کماحقہٗ پہچانے گا" (۸۱)۔

حضرت آگاہ کے مذکورۂ بالا خیالات و بیانات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ باقر آگاہ نے تقاضائے وقت کو پہچانا، اپنی قدیم زبان دکنی میں شعر و سخن کا مشغلہ مکمل ترک کر دیا اور وقت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے شمال کی ٹکسالی زبان اور

وہاں کے محاوروں کو اپنی تصنیف و تالیف کا جزوِ لاینفک بنا دیا پھر اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود شمالی ہند میں حضرت باقر آگاہ کی شہرت و مقبولیت نہ ہونے کی وجہ دکنی زبان کے استعمال کو قرار دینا راستی و حق پرستی کے یکسر خلاف ہے۔

حضرت آگاہ قادر الکلام استاذ شاعر تھے۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد جنوبِ ہند کے وسیع و عریض علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ آگاہ کو فنِ شاعری اور علم عروض میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

آپ ایک بلند پایہ رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی اپنے زمانے میں مقبول تھے۔ چناں چہ آپ کے دیوان کے آخر میں حمدیہ، نعتیہ اور عشقیہ رباعیات کافی مقدار میں درج کیے گئے ہیں۔ یہاں نمونتہً چند رباعیات پیش کی جارہی ہیں تاکہ آپ کی فنی مہارت کی ایک جھلک سامنے آئے۔

حمدیہ رباعیات:

اس نثر سے اس نظم سے یارب توبہ
اس علم سے اس فہم سے یارب توبہ
تصنیف ہے وہم اور تالیف ہوس
ایسے ہوس و وہم سے یارب توبہ

اس گریہ وزاری و دعا سے توبہ
اس توبہ پہ عجب وریا سے توبہ
ہستی کی علامات ہیں یہ سب چیزیں
یا رب یہ علاماتِ بلا سے توبہ

یا رب ہے ازل سے تا ابد تج کو غنا
یہاں وہاں ہے تصرف میں ترے منع و عطا
بے ریب ہیں تیرے فقرا سب امرا
مج کو تو نہ کر ایسے گداؤں کا گدا

تو دل کو مرے عینِ یقین کر یا رب
سجدہ کو ترے نقشِ جبیں کر یا رب
لبریز ہیں خوبی سے مظاہر تیرے
دو جگ میں مجھے تو نیک بیں کر یا رب

یا رب تو مجھے محبت ذاتی دے
اس راہ میں علم کا مجھے ساتی دے
ہر ایک تجلی میں تری عرش ہے فرش
یہ بار اٹھانے کو مجھے چھاتی دے

نعتیہ رباعیات:

اے صبحِ بہارِ حسنِ ازل کے گل
ٹپکا ہے تری نگہہ سے یک رشحہ مل
ارواحِ قدس، عشق کے تیرے بلبل
اس طرح مچی انفس و آفاق میں غل

اے کاشفِ اعیانِ خفی تیرا نور
ہوتا نہ اگر جلوہ ترا راہ نما
اے سِرِّ علن تیری تجلی کا ظہور
رہتے سب اندھیرے میں عدم کے مستور

اے ذات تری محمدؐ و احمدؐ نام
ہے ظاہر و باطن ترا مشتق از حمد
اے وصف ترا حامد و محمود مقام
ہر لحظہ تری روح پہ صلوات و سلام

اے انفس و آفاق ترے دیوانے
کوئی وسعتِ مشرب کو ترے کیا جانے
ارواح تری شمع کے ہیں پروانے
تو جلوۂ ذاتی کے پیا خم خانے

اے پایہ ترے مقام کا " اوادنیٰ "
تو ذات و صفات کا ہے عالِم پورا
ادنیٰ ہے ترے کمال میں ہر اعلیٰ
آدم کو اگر نصیب ہے ازا سما

اے روحِ قوالبِ نفوس و آفاق
جیسا ہے الوہیت میں رب تیرا فرد
ظلمت میں عدم کی ہے ترے سے اشراق
ویسا ہے عبودیت میں تو ہیگا طاق

(۸۲)

حضرت آگاہ چوں کہ فنِ شاعری کے مایہ ناز استاذ اور بلند پایہ ماہر عروض تھے لہذا انھوں نے قصیدے کی طرح " صنفِ رباعی " میں بھی تجربات کیے۔ " غزل مستزاد " کی طرح " رباعی مستزاد " میں کہ جس میں رباعی کے چاروں مصرعوں کے ساتھ رباعی کے ہی وزن کا ایک ایک فقرہ زیادہ کیا جاتا ہے۔ نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ آپ نے اس میں بھی ایک انوکھا تجربہ کیا، وہ یہ کہ رباعی کے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں فقط رکنِ رباعی کا اضافہ کر دیا۔ اردو شاعری میں اس طرح کا تجربہ آگاہ سے پہلے دیکھا نہیں گیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنی تالیف " دکنی رباعیاں " میں جہاں " رباعی مستزاد "

کے ضمن میں سودا اور درد کی ایک ایک مستزاد رباعی پیش کی (۸۳) وہاں نہ تو باقر آگاہ کا ذکر کیا اور نہ ان کے تجربہ کی خبر دی۔ بہ ہر حال حضرت آگاہ کی مستزاد رباعیاں درج ذیل ہیں۔

بوسے سے ترے پان و مسی ہیں دم ساز اور ہم ناکام
قلیلان و صراحی تیرے لب سے ہم راز ہم خوں آشام
دامن ہو ترا خاک اوپر نقش تراز ہنگام خرام
یہ مشتِ غبار اس کا نہ ہو پا انداز کیا ہے یہ کام

تجرباتی رباعی:

گھستا ہوں تری راہ میں نت جبہ و سر
اے جان تغافل گئی یوں عمر گزر ناٹھور نہ ٹھاؤں
افسوس کہ اب تک بھی نہ پوچھا تو کبھو
ہے کون تو کس واسطے آتا ہے ایدھر کیا ترا ناؤں

(۸۴)

"دیوانِ آگاہ" کے آخر میں اردو رباعیات کے اختتام پر ایک "تلگو رباعی" اور ایک "ٹمل بیت" (اردوی) دونوں بہ خطِ اردو لکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح کی جدت طرازی باقر آگاہ کے علاوہ شاذ و نادر ہی کہیں اور مل سکے گی۔ بہ ہر حال مذکورۂ بالا امور کے مدِ نظر "حضرت آگاہ" کا شمار بجا طور پر ممتاز رباعی گو شعرا میں ہونا چاہیے مگر افسوس کہ "صنفِ رباعی" پر قلم اٹھانے والے ہمارے اکثر اہلِ علم حضرات نے "باقر آگاہ" کو یک سر نظر انداز کر دیا چناں چہ پروفیسر سید مرتضیٰ جعفری نے اپنے گراں قدر مقالے "اردو رباعی کا دکنی دور" میں سب سے پہلے ملا وجہی، بعد ازاں علی عادل شاہ، پھر ولی دکنی و سراج اورنگ آبادی اور اس کے بعد راج مکھن لال مترجمِ رباعیات عمر خیام" (ترجمہ ۱۲۶۰ھ) وغیرہ شعرا کے نام لیے اور ان کی رباعیوں کے نمونے پیش کیے (۸۵)۔ مگر مؤلف کے ذہن میں "باقر آگاہ" جیسے جید رباعی گو شاعر کا نام بھولے سے بھی نہیں آیا۔

حضرت آگاہ کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے قرآن ، حدیث ، فقہہ ، سیرت ، سوانح اور تاریخ جیسے خالص علمی موضوعات کو اردو شعر و ادب کا جامہ پہنایا جس سے اردو کی آبرو بڑھی اور اس کی زیب و زینت میں چار چاند لگ گئے۔ آپ کا یہ کام بجائے خود ایک بڑا احسان ہے جس کو اردو دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ سچتناں چہ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں " آگاہ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان میں سیر، فقہہ ، عقائد پر متعدد کتابیں خاص کر عورتوں کی تعلیم کے لیے مرتب کیں (۸۶)۔

علاوہ ازیں حضرت آگاہ نے ایک اور زبردست ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی اولیت کا سہرا آپ ہی کے سر جاتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے اپنی شعری تصنیفات کی ابتدا میں علمی و تنقیدی نثری مقدمے لکھے سچتناں چہ ڈاکٹر عابدہ بیگم ، نصیر الدین ہاشمی کے حوالے سے اس دعوے کو قبول کرتی ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

" آگاہ اردو زبان کی تنقید اور تاریخِ ادب کے موجد قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل تاریخ زبانِ اردو اور تنقید زبانِ اردو کے متعلق اپنی کتابوں میں اظہارِ خیال کیا ہے۔"

ہاشمی صاحب کی بات کسی حد تک ٹھیک ہے کہ باقر آگاہ نے دکنی اردو میں تنقید کی ابتدا کی اور مثنوی " گلزارِ عشق " کے دیباچے میں دکنی کے متعلق اظہارِ خیال کیا لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے باقر زبان و بیان میں دکنی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے نظر آتے ہیں " (۸۷)۔

ڈاکٹر عابدہ بیگم صاحبہ کا مذکورہ بیان بڑی حد تک ٹھیک ہونے کے باوجود باقر آگاہ کی نثر کے تعلق سے جو رائے قائم کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ باقر آگاہؔ نے شمالی ہند کی نثر بالخصوص مرزا محمد رفیع سودا کے دیباچہ " سبیل ہدایت " اور عبدالولی عزلت کے دیباچہ اردو دیوان کی نثر کے مقابلے میں قدرے صاف ،

شستہ اور شگفتہ نثر لکھی جو آگے چل کر جدید نثر کی بلاشک و شبہ بنیاد ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی باقر آگاہ اور ان کے معاصرین کی نثر کا موازنہ کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"عبدالولی عزلت پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے اردو دیوان پر جو ۱۱۷۲ ھ / ۵۹ ۔ ۱۷۵۹ء سے پہلے مرتب ہوا۔ اردو نثر میں دیباچہ لکھا، اس نثری دیباچہ میں فارسی اسلوب اور اس کا مخصوص طرز احساس بھی موجود ہے لیکن ساتھ ساتھ اردو جملہ بھی اپنی مخصوص ساخت کے ساتھ موجود ہے۔ جہاں اردو نثر میں فارسی طرز احساس نمایاں ہے وہاں استعاروں اور صفات کے استعمال سے جملہ پیچیدہ اور طویل ہوگیا۔۔۔ محمد تقی انصاف نے اپنا دیباچہ ۱۱۷۵ھ / ۶۲۔۱۷۶۱ء میں لکھا اس کی نثر پر پورے طور پر فارسی طرز احساس حاوی ہے۔ اسی لیے اس میں دقیق فارسی و عربی الفاظ و تراکیب کے علاوہ فاعل و فعل میں فاصلہ بڑھ جاتا ہے اور جملہ پیچیدہ اور اردو زبان کے مزاج سے دور ہوجاتا ہے۔ سودا کے دیباچوں میں بھی یہی صورت ملتی ہے۔ سودا نے فارسی انشا کے انداز پر اردو میں انشاپردازی کی کوشش کی ہے۔ محمد باقر آگاہ نے عام بول چال کی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرکے ایک نئے رنگ و بیان کی طرح ڈالی ہے۔ آگاہ نے اپنے دیباچوں میں جو ۱۱۸۵ھ / ۷۲۔۱۷۷۱ء اور ۱۲۱۰ھ / ۹۶ ۔ ۱۷۹۵ء کے درمیان لکھے گئے۔ ایک طرف تنقیدی و تخلیقی نقطہ نظر سے اپنے ماخذ پر روشنی ڈالی ہے اور دوسری طرف عام و سادہ نثر میں اپنے نقطہ نظر کی اس طور پر وضاحت کی ہے کہ بات براہ راست پڑھنے والے تک پہنچ جاتی ہے۔ محمد باقر آگاہ کی نثر میں عبارت آرائی کے بجائے عام بات چیت کی سطح پر سلاست بیان قائم رہتی ہے اور محسوس ہوتا ہے

کہ نثر کا زور نقطۂ نظر کی وضاحت پر ہے۔ اردو میں تنقیدی نثر کی روایت کے یہ وہ اولین نمونے ہیں جن کا رشتہ سرسید احمد خاں اور حالی کی نثر سے ہوتا ہوا ہمارے دور کی تنقیدی نثر سے آملتا ہے۔ آگاہ کے برخلاف "پدماوت" (از غلام علی عشرت) کے دیباچے کی نثر سے فارسی اسلوب کا اثر گہرا ہے اور اسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی فارسی عبارت کا لفظی ترجمہ ہے" (۸۸)۔

حضرت باقر آگاہ کے دور تک پہلے تو اردو میں علمی نثر لکھنے کی عادت نہیں تھی اور لکھی بھی جاتی تو فارسی تراکیب سے بوجھل اور مقفیٰ و مسجع عبارتوں سے لدی ہوئی منظوم آہنگ کا احساس دلاتی تھی جس سے مصنف کی بات براہِ راست قاری کے ذہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ جمیل جالبی ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"اس دور میں جب اردو نثر فارسی کے زیرِ اثر استعاروں، فارسی ترکیب اور فارسی انشاپردازی کے تصنع و تکلف سے بوجھل تھی۔ محمد باقر آگاہ نے بول چال کی عام زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے اردو نثر نویسی کی روایت میں ایک نئے رنگ بیان کی طرح اس دور میں ڈالی جب شمال کی اردو نثر فارسی عبارت آرائی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی (۸۹)۔

بہرحال حضرت آگاہ نے اپنے اردو دیوان کے دیباچہ میں مختلف علمی و تنقیدی بحثیں کی ہیں، اس طرح کی بحثیں آپ سے پہلے کسی شاعر نے نثر اردو میں نہیں کی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک الشعرا اسد اللہ وجہی نے اپنی معرکہ آرا مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء) میں تنقید شعر کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار اردو زبان میں پہلی بار منظوم شکل میں پیش کیا تھا جیسا کہ درج ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے:

کہتا ہوں تجھے پند کی ایک بات   کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات

جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس | بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
اسی لفظ کوں شعر میں لیائے توں | کہ لیا یا ہے اوستاذ جس لفظ کوں
اگر فام ہے شعر کا تجھ کو چند | چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور ہے | ولے بھی مزا بات کا ہور ہے (۹۰)

ملا وجہی کے بعد عہد ابو الحسن تاناشاہ (۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۷ء) کے ممتاز شاعر فائز دہلوی نے اور شاہ حاتم (متوفی ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء) نے اپنے اپنے اردو دیوانوں کے فارسی خطبوں اور مقدموں میں تنقیدی شعور کا احساس ضرور دلایا ہے اور اسی طرح مرزا سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء) نے اپنی مثنوی "سبیل ہدایت" میں میر محمد تقی کے مرثیہ پر منظوم تنقید کی ہے مگر مذکورہ بالا شعرا میں سے کسی نے باقر آگاہؒ کی طرح اردو نثر میں زبان و بیان کی سادگی و سلاست کے ساتھ تنقیدی بحثوں کا احاطہ نہیں کیا ہے چناں چہ ڈاکٹر مسیح الزماں "دیوانِ آگاہ" کے دیباچہ کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "یہ دیباچہ اس وقت کی تمام نثری تحریروں میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے جس اختصار و جامعیت کے ساتھ اصنافِ نظم پر اس میں بحث کی گئی ہے۔ اس کی مثال اس وقت تک کی دکنی تحریروں میں نہیں ملتی" (۹۱)۔

بہر حال حضرت آگاہ نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اصنافِ شاعری مثلاً قصیدہ، تشبیب، مسمط، ترجیع، مثنوی، درسنی، غزل، فرد، رباعی، قطعہ، مستزاد، معمیٰ، نغز وغیرہ کے لغوی و اصطلاحی معانی بیان کرنے کے ساتھ اس کی وجہ تسمیہ اور خصوصیت بھی بیان کی۔ علاوہ ازیں آپ نے اشعار میں جدید خیالات پیش کرنے پر زور دیا اور خلاف شرع مضامین نہ باندھنے کی تلقین بھی کی۔ معائب سخن، عیوبِ قافیہ مثلاً ایطاء جلی اور قافیہ شایگاں وغیرہ کی بھی وضاحت کی، اہل زبان پر گرفت کرتے ہوئے الفاظ کے صحیح تلفظ کی تاکید فرمائی اور بعض شعری اصطلاحات مثلاً مصرعہ حرفِ روی اور ادیب وغیرہ الفاظ کی عمدہ تعریف کی۔ آپ نے شعرا کے لیے فنی طور پر

ایک ضابطہ عمل مقرر کیا، چناں چہ آپ فرماتے ہیں:

"ریختہ کہنے والے پر واجب ہے کہ قصیدہ، و غزل و مثنوی میں الفاظ عرب و لغات غیر مشہور عربی و فارسی کہ ہندیاں اوس سے چنداں مانوس نہیں ہیں، نہ لاوے اور ترکیب میں وضع ہندی کو ترتیب نہج فارسی پر غالب کر دیوے اور تا مقدور ترکیب شوخ و چست بانداز درست اختیار کرے، اہل صنائع بدیعہ اسے "انجسام" کہتے ہیں ۔۔۔

ناظم ریختہ پر لازم ہے کہ واو عطف کو درمیان دو حرف صحیح کے ایسے نہج سے لاوے کہ حرکت کو اس کی ظاہر کرنا نہ پڑے اور دو حرف صحیح میں پیوند اس طرح ندیوے کہ اظہار حرکت سے اون کا وزن الوداع بولے، اگر حرف علت ہو تو مضائقہ نہیں۔

لفظ فارسی یا ہندی کو طرف دوسرے کلمہ ہندی کے مانند فارسی مضاف نہ کرے کہ بہتر ہے۔ مگر بہ صورت شدت ضرورت وہ بھی بہ طریق ندرت لفظ "ہریک" کا ایسے طور سے نہ لاوے کہ حرف "یا" تقطیع میں ساقط ہووے، "ہر ایک" لانا مضائقہ نہیں، کیا واسطے کہ اجتماع دو ساکن کا روا ہے اور "الف" وصل کا ساقط ہوتا ہے ۔۔۔

واجب ہے کہ شاعر خلاف شرع سے کہ بزرگان اوسے "ہفوات شعر" کہتے ہیں، پرہیز کرے ۔۔۔

تا مقدور تلاش مضامین تازہ و نکات بلند آوازہ کرے کہ مضمون تازۂ دل کشا جان قالب سخن رسا ہے ۔۔۔

ناظموں پر واجب ہے کہ انواع سخن میں قوانین قوافی فارسی سے عدول نہ کرے بلکہ تتبع پر اوس کے بواقعی من دھریں۔ عجب و سو عجب ہے کہ اکثر بلکہ سب ریختہ کہنے والے اس سر رشتہ کو

چھوڑے اور یک لخت اوس سے منہ موڑے جیسا کہ کاف فارسی (گ) کو سات کاف عربی (ک) کے اور رائے ہندی (ڑ) کو ساتھ رائے عربی (ر) کے اور اسی قبیل کے اور حرفوں کو ساتھ حروف دیگر کے قافیہ کرتے ہیں ـــــ

اکثر ریختہ گویاں الفاظ مشہور عربی و فارسی کو زیر و زبر کرتے ہیں۔ اصلاً انقیاط و احتیاط پر خیال نہیں دھرتے ـــــ لفظ "منہیات" کو کہ سکون سے ہے بہ فتح نون لانا اور لفظ "کند" کو کہ بہ سکون نون ہے زبر دینا اور لفظ "شکل" کو کہ بہ سکون کاف ہے۔ حرکت فتحہ دے کر اوسے قافیہ قصیدۂ لامیہ کا کہ ماقبل اس کے "روی" کا مفتوح ہے کرنا اور لفظ "بحل" کو کہ کسر حاسے ہے فتحہ دے کر الفاظ مفتوحہ کا قافیہ لانا نار واتر ہے (۹۲)۔

بہ ہر حال حضرت باقر آگاہ نے سادہ و سلیس نثر لکھ کر خود کو جدید نثر کے بانیوں میں شامل کر دیا ہے ـ بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی:

شمال کی نثری روایت ہے کہ برخلاف عام فہم اور سیدھی سادی بول چال کی زبان میں ساری بات بیان کر کے آج سے تقریباً دو سو سال پہلے نثر نویسی کی ایک نئی روایت قائم کی ہے ـ یہ نثر دکنی اردو کے اثرات اور چند مخصوص تلفظ کے باوجود آج بھی اس لیے تازہ ہے کہ اس کا براہ راست رشتہ جدید نثر نویسی کی روایت سے قائم ہے ـ یہ سادہ و سلیس نثر فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے بہت پہلے اور مدراس جیسے دور دراز کے علاقے میں لکھی گئی ہے" (۹۳)۔

الغرض حضرت باقر آگاہ اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے فہامہ تھے ـ آپ کے ایک نامور شاگرد نامی والاجاہی مصنف مثنوی بلقیس و سلیماں نے آپ کی وفات ۱۲۲۰ھ سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی تھی جس کے بعض اشعار پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ

آپ کے صحیح مقام و مرتبت کا احساس ہو۔

علاوہ جہاں سے کیا انتقال — جو تھا مولوی باقر باکمال
سخن گو سخن رس سخن داں تھا وہ — علوم جہاں جسم اور جاں تھا وہ
کمالوں کا گھر اس سے آباد تھا — وہی عصر کا شہر استاد تھا
مجھے بھی ملا فیض اس ذات سے — وہ آگہہ کیا مج کو ہر بات سے
عجب کچھ تھا وہ عالم با عمل — حق آگاہ تھا وہ عجب بے بدل
تھی ذات اوس کی حامیِ شرعِ متیں — وجود اوس کا تھا منبعِ علم دیں
پنت اس کی دوری سے ہوکر ملول — کیا شعر اور شاعری میں نے بھول
بہشتِ بریں کہ گیا وہ خلیل — کیا اپنی ہجرت سے ہم کو علیل
جہاں سے گیا آفتاب کمال — کمالوں کا کیوں اب نہ ہوئے زوال
بن اوس کے ہنر کو نیں اعتبار — گیا پھول گلشن سے باقی ہے خار
سدا روح پر اس کے لیل و نہار — اترتی رہے رحمتِ کردگار(۹۴)

آخر میں حضرت آگاہ کے ایک نامور معاصر عہد ٹیپو شہید کے باکمال قصیدہ گو صوفی شاعر محمد علی مہکری خانہ زاد (متوفی ۱۲۳۸ھ) کے قصیدہ کے بعض اشعار پیش کیے جارہے ہیں جو حضرت آگاہ کی توصیف میں رقم کیے گئے تھے:

آگاہ ضمیر بے دلاں ہو — کشافِ رموزِ ہر نہاں ہو
ظاہر ہو علوم ظاہری سے — اور علمِ بطوں کے ترجمان ہو
اور اہلِ کمال کے ہی صف میں — جیوں ماہ میانِ اختراں ہو
عارف ہو نہ معرفت سے — نوردل چشم عارفاں ہو
اس ظلمتِ محض میں سراسر — خورشید سے دہر پر عیاں ہو
بے تابیٔ عشق سرمدی سے — سرخیلِ گروہ عاشقاں ہو
حق رکھے سلامت آپ کو بس — اس دور میں جانِ مقبلاں ہو

(۹۵)

حواشی

۱- تاریخ لنوائط مؤلفہ نواب عزیز جنگ بہادر ص ۲۸ مطبوعہ ۱۳۲۲ حیدر آباد دکن

۲- "باقر آگاہ" از مولانا یوسف کوکن مرحوم مطبوعہ ۱۹۵۸ء مدراس

۳- "باقر آگاہ" ۴-تذکرۂ گلزار اعظم ص ۹

قطعہ۔ تاریخ رحلت کے ابتدائی وانتہائی دو شعر اس طرح ہیں:

ولی اللہ آں اوستا کامل کزو بزم افادات داشت رونق
بگوشم خورد فریادی فلک برید از قید تن گردید مطلق

۱۲۰۵ھ

۵- گلزار اعظم۔ ص ۹

۶- Arabic and Persian in Cornate P 198

۷- تذکرۂ گلزار اعظم۔ ص ۱۰

۸- دیباچہ دیوان آگاہ (اردو مخطوطہ)

۹- تذکرۂ گلزار اعظم۔ ص ۱۰

حضرت آگاہ نے آپ کی وفات پر مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

افسوس کہ آزاد سخن زجہاں رفت زیں ماتم جاں سوز چہ پرسی زمن آگاہ

۱۰- باقر آگاہ۔ ص ۲۵

۱۱- دیوان آگاہ (فارسی مخطوطہ) مخزونہ۔ کتب خانہ۔ مدرسہ۔ محمدی مدراس

"چہار صد ایداد بر کلام آزاد" کی تالیف کا سن ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء ہے، اس کتاب کا ایک اور نسخہ کتب خانہ۔ مدرسہ۔ محمدی کی زینت ہے جو ۱۵ x ۲۲۲ پر مشتمل ہے۔ اس مخطوطہ کی کتابت حضرت آگاہ کے حین حیات ہی میں ۱۲۰۰ھ م ۱۷۸۵ء میں ہوئی تھی۔

۱۲- حدیقتہ المرام (علمائے مدراس) از مہدی واصف مترجم سخاوت مرزا مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان۔

۱۳- "باقر آگاہ" - ص ۵۰

۱۴- بہار اعظم جاہی ص ۳۱ مقدمہ از غلام عبد القادر ناظر

۱۵- تذکرۂ صبح وطن از نواب غلام غوث خاں اعظم
۱۶- تذکرۂ گلزار اعظم ص ۱۱
۱۷- "باقر آگاہ" ص ۱۴۵ از یوسف کوکن عمری
۱۸- یورپ میں دکنی مخطوطات - ص ۴۳۷ از نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ ۱۹۳۲ء شمس المطابع حیدر آباد دکن۔
۱۹- "باقر آگاہ" - ص ۵۹ تا ۱۲۰
۲۰- "ریاض الجنان" مقدمہ ص ۸ از باقر آگاہ مطبوعہ ۱۲۸۵ھ در مطبع رحمانی حیدر آباد۔
۲۱- "دکنی رباعیات" از ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۲۱۰ مطبوعہ ۱۹۶۶ء اے۔پی اردو اکاڈمی، حیدر آباد
۲۲- "ریاض الجنان" مقدمہ ص ۸
۲۳- "ہشت بہشت" از باقر آگاہ ص ۱۱۵ مطبوعہ ۱۳۰۲ھ در مطبع فتح الکریم بمبئی
۲۴- دکن میں ریختی کا ارتقا از بدیع حسینی ص ۱۰۳ مطبوعہ انجمن ترقی اردو، حیدر آباد
۲۵- تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول ص ۷۶ مرتب ڈاکٹر سید محی الدین زور مطبوعہ ۱۹۸۴ء ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۲۶- حکیم باقر حسین خاں بہادر غلام علی رضا رائق شاگرد حضرت باقر آگاہ، مرقومہ ۱۳۵۵ھ (مخطوطہ) مخزونہ، کتب خانہ۔ رحمانیہ دیوان صاحب باغ مدراس۔
۲۷- ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول ص ۷۷
۲۸- افضل العلما۔ یوسف کوکن صاحب "باقر آگاہ" ص ۱۰۹

"ہشت بہشت" کی داخلی شہادتوں کے قطع نظر صرف دیباچہ کے مطالعہ نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو بھی سال تصنیف کے تعلق سے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا چناں چہ آپ رقم طراز ہیں "پہلے ہی چھے رسالے ۱۱۸۵ھ (۷۲-۱۷۷۱ء) میں لکھے گئے" (تاریخ اردو جلد دوم حصہ دوم ص ۱۰۱۲)

۲۹- یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۴۶۵ مطبوعہ ۱۳۵۰ھ حیدر آباد
۳۰- "تنبیہ النساء" از خواجہ رحمت اللہ مخطوطہ، مخزونہ۔ ابوالحسان اکاڈمی، کڑپہ
۳۱- دیباچہ "ہشت بہشت" ص ۱۰ مطبوعہ ۱۳۰۲ھ مطبع فتح الکریم بمبئی۔
۳۲- ایضاً ص ۸
۳۳- دکنی شاعری تحقیق و تنقید ص ۳۲ از ڈاکٹر محمد علی اثر مطبوعہ ۱۹۸۸ء حیدر آباد

۳۴- تامل ناڈو میں اردو کی ادبی تاریخ از کاوش بدری ماخوذ از ماہ نامہ "آج کل" دہلی بابت جون، جولائی ۱۹۷۷ء (تامل ناڈو)

۳۵- رسالہ "من درپن" "از ہشت بہشت جلد دوم ص ۴۰۸

۳۶- محبوب القلوب ص ۷ مطبوعہ ۱۳۰۸ھ در المطابع، مدراس (اس کا ایک نسخہ محمڈن لائبریری والاجاہ روڈ، مدراس میں اور دوسرا نسخہ جامعۃ العلوم الثنائیہ۔ الماس پیٹ کڑپہ میں محفوظ ہے)

۳۷- ایضاً ص ۸

۳۷(ا) ایضاً ص ۲۳۴

۳۸- یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۴۵۰ از نصیرالدین ہاشمی مطبوعہ ۱۹۳۲ء شمس المطابع، عثمان گنج، حیدرآباد

۳۹- محبوب القلوب ص ۲۳۶۔

۴۰- ایضاً ص ۲۴۰

۴۱- مقدمہ۔ ریاض الجناں ص ۵ مطبوعہ ۱۳۰۴ در مطبع محمدی بنگلور

۴۲- "ریاض الجناں ص ۲ مطبوعہ ۱۲۸۵ھ در مطبع رحمانی حیدرآباد دکن

۴۳- "ریاض الجناں" بہ حوالہ۔ "باقر آگاہ" از یوسف کوکن ص ۱۱۵- یہ امر قابل افسوس ہے کہ ۱۲۸۵ھ میں شائع شدہ "ریاض الجناں" کے نسخے میں مندرجہ۔ بالا اشعار میں سے آخر کے چار شعر حذف کیے گئے ہیں اور:

صاف اس واسطے لکھا ہوں میں تا سمجھ ہووے خوب اون کے تیں

اس شعر کی اصلاح اس طرح کی گئی ہے:

اس لیے صاف لکھا ہے میں نے فہم میں تاکہ سب کے آجاوے

۴۴- دیباچہ ریاض الجناں ص ۳

۴۵- ایضاً ص ۸

۴۶- ایضاً ص ۴

۴۷- ریاض الجناں ص ۱۹۰ مطبوعہ ۱۲۸۵ھ

۴۸- "تذکرۂ گل دستہ۔ کرناٹک" از رائق مدراسی مخطوطہ شمارہ نمبر ص ۹۷ مخزونہ۔ کتب خانہ۔ رحمانیہ۔ دیوان صاحب باغ، مدراس

۴۹- اردو مخطوطات (کتب خانہ۔ آصفیہ) جلد اول از نصیرالدین ہاشمی ص ۲۱۱ مطبوعہ ۱۹۶۱ء

حیدر آباد

۵۰- "باقر آگاہ" ص ۱۲۳-

۵۱- فہرست اردو مخطوطات (کتب خانہ آصفیہ) ص ۲۰ جلد دوم

۵۲- "باقر آگاہ" ص ۱۲۴-

۵۳- مدراس میں اردو کی نشو ونما ص ۱۶۴

۵۴- تذکرۂ گل دستۂ کرناٹک (مخطوطہ)

۵۵- مقدمہ۔ گلزار عشق (مخطوطہ) ص ۱۲

۵۶- تاریخ ادب اردو جلد دوم، حصہ دوم ص ۱۰۱۴

۵۷- مدراس میں اردو کی نشو ونما ص ۷۰ اڈاکٹر افضل اقبال

۵۸- مقدمہ۔ گلزار عشق (مخطوطہ) ص ۷

۵۹- ایضاً ص ۱۳-

۶۰- ایضاً ص ۱۶

۶۱- ایضاً ص ۱۱

۶۲- ایضاً ص ۱۳

۶۳- اردو مخطوطات جلد دوم (کتب خانہ آصفیہ) ص ۲۶۵

۶۴- "مدراس میں اردو کی نشو ونما" مطبوعہ ۱۹۷۹ء ص ۱۶۸

۶۵- سال نامہ اللطیف بابت ۱۳۸۶ھ ص ۷۸

۶۶- کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے اردو مخطوطات جلد دوم از نصیر الدین ہاشمی ص ۲۶۶-
ص ۲۶۷
- کتب خانے کے فہرست ساز نے "خمسہ متحیرہ" کو غوثی آرکاٹی کے نام سے موسوم کیا
ہے جو سراسر غلط ہے-

۶۷- "باقر آگاہ" از یوسف کوکن عمری ص ۱۲۷

۶۸- تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد ص ۲۴۲

۶۹- کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اول ص ۱۹۳

۷۰- تاریخ ادب جلد دوم حصہ دوم ص ۱۰۱۱

۷۱- مدراس میں اردو کی نشو ونما ص ۱۷۰

۷۲- ایضاً ص ۱۷۰

۷۳- یادگار نمبر بہ تقریب جشن صد سالہ مدرسہ۔ محمدی دیوان صاحب باغ مدراس ص ۱۴ مطبوعہ ۲۶/ رجب ۱۴۰۹ھ ص ۸۴
مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) - فارسی - عربی - مرتبہ سید سرفراز علی رضوی ص ۵۲ ۔

۷۴- تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) ص ۸۶، ۸۷، از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۷۵- "یورپ میں دکنی مخطوطات" از نصیر الدین ہاشمی ص ۴۴۵ تا ۴۴۷ مطبوعہ ۱۹۳۲ء حیدر آباد

۷۶- مخطوطات اردو کتب خانہ۔ آصفیہ حیدر آباد جلد اول ص ۸۵ از نصیر الدین ہاشمی

۷۷- تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) ص ۷۶ ص ۷۷

۷۸- تاریخ ادب اردو (جلد اول) قدیم دور ص ۵۲۴ مطبوعہ ۱۹۸۹ء دہلی

۷۹- "باقر آگاہ" ص ۱۳۲ مطبوعہ ۱۹۵۸ء مدراس

۸۰- مقدمہ۔ گلزار عشق (مخطوطہ) اس کی نقل راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے

۸۱- مقدمہ دیوان باقر آگاہ (مخطوطہ) اس مقدمہ کی نقل (زیراکس) بھی راقم کے پاس موجود ہے- اس کی اصل کتب خانہ۔ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ مدراس کی زینت ہے-

۸۲- دکنی رباعیات ص ۱۲ ص ۱۳ مطبوعہ ۱۹۶۶ آندھرا پردیش ساہیہ اکاڈمی، حیدر آباد

۸۳- " دیوان آگاہ " ص ۱۰۴ مخطوطہ سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدر آباد - کلیات ودواوین، مخطوطہ نمبر (۳۲)

۸۴- "قومی زبان" کراچی ص ۵۱ شمارہ اکتوبر، نومبر ۱۹۶۳ء مقالہ "اردو رباعی کا دکنی دور از سید مرتضیٰ جعفری، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی - پاکستان

۸۵- "یورپ میں دکنی مخطوطات" ص ۴۶۵

۸۶- "اردو نثر کا ارتقا" (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک) مصنفہ ڈاکٹر عابدہ بیگم شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ص ۱۰۱ مطبوعہ ۱۹۸۸ء

۸۷- تاریخ ادب جلد دوم حصہ دوم ص ۹۸۸، ص ۹۸۹

۸۸- ایضاً ص ۱۰۱۱

۸۹- دکنی شاعری تحقیق و تنقید ص ۷۷ ڈاکٹر محمد علی اثر مطبوعہ ۱۹۸۸ء حیدر آباد

۹۰- "اردو تنقید کی تاریخ ص ۳۷ ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم مطبوعہ ۱۹۸۷ء اترپردیش اردو

اکاڈمی، لکھنؤ

۹۱- دیباچہ "دیوان آگاہ" (مخطوطہ)

۹۲- تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم) ص ۱۰۱۲ مطبوعہ ۱۹۸۹ء ایجوکیشنل پبلی کیشنگ ہاؤس دہلی ۶

۹۳- "مثنوی بلقیس و سلیمان" از نامی والا جاہی - ماخوذ از "نواب ادب" بمبئی شمارہ اپریل ۱۹۵۷ء مضمون نگار جناب سخاوت مرزا صاحب

۹۴- گنج شائگاں (مخطوطہ) مخزونہ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور اور علامہ اقبال میسور میں اور دیگر مضامین میں ص ۹۹ مؤلفہ پروفیسر میر محمود حسین میسوری مطبوعہ ۱۹۷۹ء اردو لائبریری سنٹر سٹی مارکٹ بنگلور ۲

حضرت محوی ویلوریؒ

آپ کا اسم گرامی سید شاہ ابوالحسن قادری، والد ماجد سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقی ویلوری (متوفی ۱۱۹۴) اور جدِ امجد حضرت محمد سید شاہ ابوالحسن قادری قربی ویلوری (متوفی ۱۱۸۲ھ) ہیں۔ حضرت محوی کی ولادت ۲۷/ شعبان المعظم ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء بمقام ویلور ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوتی رہی۔ آپ جب آٹھ سال کے ہوئے تو والدِ حضرت ذوقی کا وصال ہو گیا (۱)۔ والد کی وفات کے بعد آپ کی والدہ سکینہ بی بی بنتِ عبدالعلی محمد خداوند خاں غوری بیجاپوری آپ کی تعلیم و تربیت پر کمربستہ ہو گئیں۔ چنانچہ آپ کو لے کر مدراس پہنچیں۔ جہاں حضرت محوی نے جید و ماہر علما و فضلا سے۔ تفسیر، حدیث، عقائد، فقہ وغیرہ علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا پھر صرف پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد کے جانشین اور آستانے کے سجادہ نشین ہوئے جیسا کہ حضرت شاہ عبدالحی احقر بنگلوری نے فرمایا:

پنجدہ سالہ ہوا ہے جب وہ بجا اپنے والد کا جانشین ہوا

(مثنوی مطلع النور ص ۱۵)

حضرت محوی نے راہ معرفت و منزلِ حقیقت عجیب و غریب طریقے پر خرقِ عادت طے کی تھیں، حضرت ذوقیؒ، حضرت غوث الاعظمؒ اور حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے براہِ راست بذریعہ منام فیضان حاصل کیا، اس تعلق سے مصنف "مطلع النور" بروایت ی شاہ عنایت اللہ فخری رحمت اللہ علیہ ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

کہ میں یکبار خواب میں دیکھا بحر عرفان ذوقی والا
میرے فرزند پر بہ فضلِ رب دیکھ کرتا ہوں میں توجہ اب
پس توجہ کیا وہ دونوں پر وہیں ظاہر ہوا ہے اس کا اثر
تربیت پر تھی اس کی اے گیانی پارہا تھا وہ فیض روحانی
لایا تشریف ہے بشانِ علا اور اس طرح مجھ کو فرمایا
وہیں عرض جناب میں نے کی کہ کرم سے توجہ مجھ پر بھی

روحِ پاک اور غوث اعظم کی ... اور حضرت علی اکرم کی
اور بہ علم و کمال روز بہ روز ... دیا مولیٰ ترقی فیروز (۲)

حضرت قطب ویلور اپنے والد محوی کے متعلق ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"ابی و شیخی حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری نیزاویسی بودند، از روحِ پر فتوح حضرت سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ اخذِ فیض کردہ اند وپس از بیداری جامہ و بدن خود را از اثرِ غسلِ خواب تربتر یافتہ اند" (۳)۔

یعنی میرے والد اور مرشد حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری بھی نسبتِ "اویسیہ" رکھتے تھے، خواب میں آپ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے فیضِ روحانی حاصل کیا۔ چناں چہ عالم رویا میں کیے ہوئے غسل کا اثر خواب سے بے دار ہونے کے بعد بھی محسوس کیا کہ جسم وجامہ بھیگے ہوئے ہیں۔"

حضرت محوی نے ایک رسالہ میں "نسبت اویسی" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"در نفحات است شیخ طریقت شیخ فریدالدین عطار قدس سرہ، گفتہ اند قومے از اولیاء اللہ عزو جل باشد کہ ایشاں را مشائخ طریقت و کبرای حقیقت "اویسیا" نامند، وایشاں را در ظاہر بہ پیرے احتیاج بشود، زیرا کہ ایشاں را حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم درِ حجر عنایتِ خود پرورش می دہند بے واسطہ، بحرسے چناں کہ اویس را دادر ضی اللہ عنہ ایں عظیم مقامے بود و بس" (۴)

یعنی "جیسا کہ "نفحات" میں ہے کہ شیخ طریقت شیخ فرالدین عطارؒ نے ارشاد فرمایا کہ اولیااللہ میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ جنھیں اکابرِ صوفیا و مشائخِ کرام "اویسیا" کا نام دیتے ہیں۔ گروہ اویسیا کو بہ ظاہر کسی مرشد کی حاجت نہیں ہوتی وہ تو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں بغیر کسی واسطے کے پرورش پاتے ہیں جیسا کہ حضرت اویس رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے۔ ایک ایک اونچا مقام ہے اور بس۔"

مؤلف تذکرۂ اقطاب ویلور کی اطلاع کے بموجب حضرت محوی نے اصلاح سے اکتساب فیض کرنے کے علاوہ اپنے رشتے کے دادا حضرت مولانا سید شاہ میر تقی قادری قدس سرہ، سے بھی اجازت و خلافت حاصل کی۔ اس طرح نسبت ظاہری اور نسبت باطنی دونوں نعمتوں سے مستفیض ہوئے (۵)۔

تقریباً بیس سال کی عمر میں آپ کا نکاح حضرت سید علی قادری کی دختر نیک اختر بی بی امتہ المجید صاحبہ سے ہوا، جن کے بطن سے ۱۲۰۷ھ میں حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری معروف بہ قطب ویلور پیدا ہوئے۔ بعدازاں حضرت سید شاہ عبدالعلی قادری تولد ہوئے۔ نکاح کے بعد ۱۲۰۶ھ میں آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جذب و سکر کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ جن کے بعد آپ کے احوال میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی، کرامتیں صادر ہوئیں اور خلق خدا کو بے حد فائدہ پہنچا۔ مؤلف ضمیمہ جواہر السلوک رقم طراز ہیں:

"و در شہور ہزار ۱۲۰۶ و دوصد و شش اوراجذبہ رسید و حالات عجیبہ ازوے ہویدا گردید" (۶)

مصنف مثنوی مطلع النور فرماتے ہیں کہ:

ہوئی سن اس کی بیس سال کی جب — اس کو پہنچا ہے ایک جذبہ، رب
حالتیں بس عجیب اور فاخر — اس سے ہونے لگے ہیں، تب ظاہر (۷)

مولانا محمد طیب الدین اشرفی مونگیری (۸) (بہار)، ڈاکٹر افضل الدین اقبال (۹) (حیدرآباد) اور مولوی حافظ بشیر الحق قریشی (۱۰) (ویلور) نے اپنے اپنے مقالات میں لکھا ہے کہ حضرت محوی مدراس میں حصول علم کی خاطر بیس سال تک قیام پذیر رہے۔ حالاں کہ مذکورہ بالا تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ بات قرین قیاس نہیں ہے۔ بالخصوص پندرہ سال کی عمر میں جانشینی کی واضح روایت کی موجودگی میں اس طرح کا دعویٰ بے معنی ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں ان فضلاء نے کسی مستند ماخذ کا حوالہ بھی اپنی کتابوں میں نہیں دیا ہے۔

حضرت محوی کے کشف و کرامت کے تعلق سے ایک تاریخی واقعہ مؤلف " خانوادۂ اقطاب ویلور " نے نقل کیا ہے:

حضرت ٹیپو سلطان نے ایک مرتبہ حضرت محوی کی خدمت میں ایک کثیر رقم کا گراں قدر نذرانہ روانہ کیا اور آپ سے میسور آنے کی درخواست کی۔ آپ نے شاہی نذرانے کو شکریہ کے ساتھ واپس کیا اور قاصد سے کہا کہ سلطان سے کہنا کہ سلطنتِ خداداد کو چھ ماہ بعد زوال آنے والا ہے اگر میں اس وقت آتا ہوں تو زوال سلطنت کے وقت لوگ کہیں گے کہ ابوالحسن کے قدم کی نحوست سے سلطنت کو زوال آگیا، لہذا میں آنے سے قاصر ہوں۔ قاصد یہ جواب پاکر واپس چلا گیا اور اس پیش گوئی کے چھے ماہ بعد (۱۲۱۳ھ) حضرت ٹیپو سلطان کی جنگ میں شہادت ہوئی " (۱۱)۔

بہ ہر حال حضرت محوی پر سے جب بھی جذب و استغراق کی حالت زائل ہوتی، آپ تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس میں محو ہوجاتے تھے۔ بہ قول مؤلف " انوراقطابِ ویلور " "آپ پر ایک ہزار گیار مرتبہ جذب طاری ہوا " (۱۲)۔
حضرت محوی متوکل علی اللہ بزرگ تھے تاہم آپ کی جود و نوال اور عطا و افضال کے چرچے حیران کن تھے۔ بہ قول حضرت شاہ عبدالحیٔ احقر بنگلوری:

که بیاں اس کے ہو توکل کا اور قناعت کا اور تبذل کا
اور سخاوت میں اس کی شان علی ایسی بخشا تھا لطف سے. مولی
که امیروں کو تھی پشیمانی اغنیا کو کمال حیرانی (۱۳)

آپ کے پوتے حضرت سید شاہ رکن الدین محمد قادری ابن حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی معروف بہ قطب ویلور فرماتے ہیں:

حاتمِ وقت ایسے کہ علاوہ روپیوں کے سات سو گھوڑے اللہ کی راہ میں خیرات فرمائے، حضرت قطبِ ویلور قدس سرہ اکثر فرماتے تھے کہ والدِ ماجد کی صحبت میں (تقریباً) چالیس سال رہا کبھی آج کی چیز کو کل

کے لیے رکھنے نہیں فرمائے ، جب حضرت کی عمر شریف ۵۷ سال کی ہوئی تو جام وصال حق پیے" (۱۴)۔

حضرت محوی کا وصال ۲۶ / جمادی الآخر ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء بہ روز دوشنبہ بہ مقام حضرت مکان ویلور ہوا، آپ کا مزار شریف اپنے جد امجد حضرت قربی ویلوری کے پہلو میں واقع ہے، جس پر حضرت قطب ویلورؒ نے ۱۲۴۵ھ میں پر ایک عالی شان گنبد تعمیر کرائی اور دیواروں میں سنگین کتبے نصب کرائے چناں چہ آپ کے مقبرے کی دیوار پر حسب ذیل قطعہ۔ تاریخ کندہ ہے۔

شد از طاق رخصت رواں ابوالحسن　　پئے سیر در روضہ جاوداں
درآمد بہ مغرب سر آفتاب　　چو گویم سنش "غاب قطب الزماں"

۱۲۴۳ھ

حضرت محوی نے جذب و استغراق کے باوجود علم و ادب اور مذہب و ملت کی قابل ذکر خدمت انجام دی۔ آپ ہی نے دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان کے احاطہ میں اپنے آبا و اجداد کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۲۳۵ھ میں ایک عالی شان مسجد بنائی۔ علاوہ ازیں خانقاہ کی مستقل عمارت اور مدرسہ و مسافر خانہ کے دو الگ الگ حصے تعمیر کرائے حالاں کہ حضرت قربی اور حضرت ذوقی کے عہد میں اس طرح کی مضبوط اور مستقل عمارتیں نہیں تھیں۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالحیؒ فرماتے ہیں:

مسجد و خانقاہ و رباط کلاں　　مدرسہ وہ بنایا عالی شان (۱۵)

حضرت محوی اپنے دور کے علامہ، ولی کامل، شفیق استاذ اور صاحب قلم بزرگ تھے۔ آپ کے سینکڑوں شاگردوں، مریدوں اور خلفاء میں ممتاز و معروف شخصیت آپ کے فرزند کلاں حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی ویلوری معروف بہ قطب ویلورؒ کی ہے۔ آپ کے علاوہ ایک اور بزرگ حضرت مولانا مولوی حافظ شیخ عبدالقادر آتوری (متوفی ۱۲۵۱ھ) قدس سرہ کی ہے۔ شیخ آتوری حضرت محوی کے چہیتے شاگرد اور مرید و خلیفہ تھے، جنھوں نے اپنے شیخ کی خواہش پر متاہل ہونے

کے باوجود ویلور میں دوسری شادی کی اور حضرت محوی کی پیش گوئی کے مطابق اس بیوی سے جو لڑکا کا تولد ہوا وہ یکتائے روزگار بنا، جنھیں دنیا حضرت مولانا مولوی الحاج سید شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری بانیِ مدرسۂ باقیات صالحات ویلور کے نام سے جانتی اور قدر کرتی ہے۔

حضرت محوی ویلوری نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں تصوف و معرفت کے موضوعات پر کتب و رسائل تصنیف کیے، تاحال جن مصنفات کا علم ہوا ہے اس کی تفصیل درج کی جارہی ہے۔ یہ کتابیں مخطوطات کی شکل میں خود دارالعلوم لطیفیہ ویلور اور برصغیر کے دیگر کتب خانوں میں موجود ہیں۔

(۱) رسالۂ شرحِ حقیقت محمدیؐ (فارسی)

(۲) مسئلہ بیعتِ غائب و حاضر (فارسی) اس معرکہ آرا کتاب میں بیعت کی قسمیں نسبت کی تفصیل، خرقۂ خلاف کا غائبانہ حصول، بقاءِ ارواح اور تصرفات اموات وغیرہ مسائل پر سوال و جواب کے پیرایے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(۳) تفصیل المراتب فی اطوار المراقب: یہ رسالہ دکنی زبان میں ہے، مراقبہ کی تفصیل وجود اور اس کی قسموں کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔

اس مختصر ۱۴ صفحات ۱۳ سطری) رسالہ کا ایک مخطوطہ مدرسۂ لطیفیہ کے کتب خانے کی زینت ہے اور دوسرا نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد) کا مخزونہ ہے۔ جس کی کتابت کا سال ۱۳۰۱ھ ہے۔

(۴) رسالۂ ذکر صفحہ (۱۷) سطر (۱۱) تاریخ تصنیف ۱۲۴۰ھ

(۵) نفسِ رحمانی: یہ رسالہ ایک مرید خاص کی عرض و گذارش پر لکھا گیا تھا چناں چہ مرقوم ہے:

> "شیخ جمال الدین لنگری جو مریدِ خاص با اخلاص تھے انھوں نے عرض کیے ہمنا (ھمیں) عربی ہور (اور) فارسی کی عبارت بوجنا (سمجھنا) محال

ہے اگر دکنی میں ہوگا تو ہمنا ہور پیر بھائیوں کو فائدہ تمام حاصل ہوگا۔"

یہ رسالہ مراتب عروج و نزول کی وضاحت اور دعا کی فضیلت و اہمیت میں ہے۔

(۶) رسالہ ٔ معرفت: اس رسالہ میں حضرت محوی نے "**من عرفه نفسه فقد عرف ربه**" کی جامع تشریح فرمائی ہے۔ اختتام میں کلمہ ٔ طیبہ کی تشریح و توضیح بھی بیان کر دی ہے۔

(۷) رسالہ ٔ عالمِ ارواح: یہ رسالہ روحانی عالم کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

(۸) رسالہ ٔ عالمِ مثال: اس رسالہ میں عوالم کی تقسیم و توضیح بہت ہی عمدہ طریقے پر کی گئی ہے اور آخر میں [illegible]ک و معرفت کا بیان بھی موجود ہے۔

(۹) رسالہ وجود و مراتب وجود: یہ رسالہ ۱۲۴۲ھ میں یعنی وصال سے ایک سال قبل تصنیف کیا گیا ہے۔ اس میں صوفیاءِ کرام کی مشہور بحث "**کل شئی فی کل شئی**" کی جامع وضاحت پیش کی گئی ہے۔

(۱۰) رسالہ ٔ اسماءِ ربوبی الہیٰ: (۱۷) یہ رسالہ آپ کا سب سے آخری رسالہ ہے۔ اس کی سال تصنیف ۱۲۴۳ھ ہے۔ اس میں صفات باری تعالیٰ کی تشریح بڑے شگفتہ پیرایے میں کی گئی ہے۔ الغرض آپ کے مذکورہ بالا تصنیفات میں سے آخر کے آٹھوں تصانیف قدیم اردو یعنی دکنی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔ حالاں کہ حضرت محوی کا دور ادبی اعتبار سے دکنی کے لیے سازگار نہیں تھا۔ اس وقت شمال میں فارسی آمیز ٹکسالی اردو رائج ہو چکی تھی۔ ادھر جنوب میں بھی شعرا و ادبا اپنی تخلیقات اسی معیاری زبان میں پیش کرنے لگے تھے۔ ان تمام حقائق کے باوجود حضرت محوی نے دکنی زبان ہی کو اپنے تمام رسائل و کتب کے لیے ذریعہ ٔ اظہار بنانا پسند فرمایا۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ آپ کے مخاطبین اور آپ کی کتابوں کے قارئین میں کم خواندہ عوام الناس بالخصوص خواتین کی ایک بڑی تعداد تھی جن کی دینی ضرورتوں او۔

اصلاحی تقاضوں کے لیے ان کی فہم و فراست کے مطابق معاملہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی بات کی طرف آپ نے "تفصیل المراتب فی اطوار المراقب" کی تمہید میں اشارہ فرمایا ہے کہ "تامی امی لوگ اور عورتاں کو کام آوے۔" ورنہ اہلِ علم کے لیے عربی، فارسی کی کتابیں اور درس و تدریس کے مواقع میسر تھے اور نسبتاً ان کی اصلاح و تربیت بھی آسان تھی۔ عام طور پر تصنیف و تالیف کی مقصدیت میں نظرانداز کیے جانے والا طبقہ کم سوادوں ہی کا تھا۔ اسی لیے صوفیاءِ کرام انھیں امیوں اور عورتوں کے لیے لکھتے اور لکھاتے تھے۔ حضرت محوی نے دکنی رسائل سے زبان کا اس قدر تو بھلا ہوگا کہ اس دور کی عوامی بولی کتابوں میں محفوظ ہوجائے گی اور اس وقت کا عام تلفظ حیطہ تحریر میں آجائے گا۔ بہ ہر حال حضرت محوی صوفیاءِ کرام کے اس زریں سلسلہ کی کڑی ہیں جن کی تخلیقات کو زبان و بیان کے اعتبار سے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

حواشی

(۱) شاہ عبدالحیٔ احقر بنگلوری نے اپنی مثنوی "مطلع النور" میں حضرت محوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ حضرت ذوقی کے انتقال کے وقت آپ کی عمر پانچ سال تھی۔ حالاں کہ ذوقیؒ کا سالِ رحلت ۱۱۹۴ھ اور محویؒ کا سنِ ولادت ۱۱۸۶ھ کو دیکھتے ہوئے احقرؔ کا بیان صحیح نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ مثنوی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

لیکن برخواہشِ خدائے کریم انھیں لڑکائیں ہوا ہے یتیم
عمر تب اس کی پانچ سال کی تھی اس سے ظاہر ہر نشاں کمال کی تھی(۱۴)

(۲) مثنوی مطلع النور (ص ۱۵)

(۳) مکتوبات لطیفی (غیر مطبوعہ) ص ۸، ۲ مخزونہ کتب خانہ۔ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

(۴) رسالہ۔ بیعیت غائب و حاضر از حضرت محوی ویلوری

(۵) اللطیف ۱۴۰۴ اقطاب ویلور نمبر ص ۱۷ مقالہ بہ عنوان تذکرۂ اقطاب ویلور از مولوی حافظ بشیرالحق قریشی لطیفی ادھونی

(۶) ضمیمہ۔ جواہر السلوک از سید شاہ محمد قادری ہمشیر زادۂ حضرت قطب ویلورؒ ص ۲۶۵

(۷) مثنوی مطلع النور ص ۱۵

(۸) انوار اقطاب ویلور ص ۶۰ مطبوعہ ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان و یلور

(۹) سال نامہ اللطیف بابت ۱۳۹۹ھ م ۱۹۷۹ء ص ۱۶۶ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان و یلور

(۱۰) سال نامہ اللطیف اقطاب و یلور نمبر ۱۴۰۴ھ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان و یلور

(۱۱) خانوادۂ اقطاب و یلور - از محمد زکریا ادیب خاور رائے چوٹی (ضلع کڑپہ)

(۱۲) انوار اقطاب و یلور ص ۶۳ از مولانا محمد طیب الدین اشرفی مونگیری

(۱۳) مثنوی مطلع النور ص ۱۶

(۱۴) روئداد دار العلوم لطیفیہ بابت ۱۳۱۱ھ ص ۳۲ (مطبوعہ)

(۱۵) مثنوی مطلع النور ص ۱۷

(۱۶) مخطوطہ کتب خانہ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان و یلور مجموعہ رسائل)

(۱۷) سال نامہ اللطیف ۱۴۰۴ھ ص ۷۶

حضرت میر حیات میسوری

آپ کا اسم گرامی سید محمد حیات علی ہے مگر میر حیات کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ والد کا نام سید یوسف حسین ہے، آپ نے اپنے رسائل میں اپنا نام اور تخلص کئی طرح لکھا ہے۔ چناں چہ اپنے فارسی رسائل مسمیٰ " مجمع الارشاد " اور " سفینتہ النجات " کی ابتدا میں رقم طراز ہیں:

" اما بعد می گوید فقیر الی اللہ میر حیات علی ابن یوسف عظیم آبادی " (۱)

اپنا دکنی رسالہ " باب المغفرت " کے اختتام پر لکھتے ہیں:

اس عقائد کو لکھا سید حیات یاد اس کو جو رکھا پایا نجات (۲)

اپنی مثنوی " احوال النبی " کے آخر میں اس طرح گویا ہیں:

پڑھ درودان مصطفیٰ پر اے حیات پائے گا تو رحمتِ حق اور نجات (۳)

مؤلف " ادبیاتِ میسور " لکھتے ہیں " آپ کا نام میر محمد حیات تھا (۴) ۔۔۔۔ آپ کے والد کا نام میر یوسف تھا جو عظیم آباد کے متوطن تھے۔ عظیم آباد سے یہاں مراد " پٹنہ " (PATNA) تو نہیں ہو سکتا شاید ریاستِ میسور ہی کے کسی مقام کا نام ہوگا۔ ٹیپو سلطان شہید نے سلطنتِ خداداد کے متعدد مقامات کے نام بدل کر اپنی طرف سے نئے نام رکھے تھے۔ مثلاً نظر آباد، ظفر آباد، منظر آباد، گلشن آباد وغیرہ، لیکن کسی تاریخ میں کہیں " عظیم آباد " نام نہیں ملتا "

" عظیم آباد " دراصل قصبہء " بیرن درگ " کا نام ہے جو " کولار " کے قریب واقع ہے، اس کا ذکر " صحیفہء ٹیپو سلطان " (مجموعہء مکاتیب سلطان شہیدؒ) حصہء اول میں موجود ہے۔ عظیم آباد (بیرن درگ) " کولار " کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے شاید مولوی محمد خاں اور ڈاکٹر حبیب النساء نے حضرت میر حیات کے والد کا نام " میر یوسف حسین (۵) " کولاری " لکھا ہے۔ حضرت میر حیات کی تاریخ ولادت اور تفصیلی حالات کا ذکر کسی بھی تذکرہ میں موجود نہیں ہے، البتہ آپ کے تذکرہ نگاروں نے چند

بے ترتیب اطلاعات فراہم کئے ہیں۔ مثلاً آپ کی ابتدائی تعلیم "مدرسۂ لطیفیہ حضرت مکان ویلور" میں ہوئی۔ حضرت محویؒ سے بیعت کی۔ علامہ باقر آگاہ سے تعلیم حاصل کی حضرت شاہ کمالؒ سے خرقۂ خلافت پایا اور کافی طویل عمر پا کر ۱۲۸۱ھ میں واصل بہ حق ہوگئے۔ حضرت میر حیات کی وفات کا تاریخی قطعہ غلام محمد علی عبدالرؤف المعروف بہ میراں امیر مہسوری (میسوری) نے کہا تھا، اس کا آخری شعر اس طرح ہے:

از سرِ آب حیات اے با میراں حضرم — آہ صد آہ حیاتِ دو جہاں رفتہ بگفت
۱۲-ھ-۸۱

ابو الخیر محمد عبدالحق ترچنا پلوی نے مادۂ تاریخِ وصال اس طرح کیا ہے:

جانِ مولانا حیات رفت ۱۲-ھ-۸۱

آپ کے سالِ وفات ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جائے کہ چوں کہ آپ نے کافی طویل عمر پائی ہے لہٰذا وفات کے وقت آپ کی عمر کم از کم اکاسی سال رہی ہوگی تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حضرت میر حیات کی ولادت ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۶ء سے قبل ہوئی ہوگی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی والد ماجد کی سرپرستی میں ہوئی، دس بارہ سال کی عمر میں ویلور دارالسرور پہنچے ہوں اور اقطاب ویلور کے خانقاہی مدرسہ میں داخلہ لے لیا ہو تو ویلور جانے کی تاریخ تقریباً ۱۲۱۲ھ کہی جا سکتی ہے۔ اس زمانے میں اس عظیم خانقاہی مدرسہ کے جو بعد میں "دارالعلوم لطیفیہ" کے نام سے شہرت حاصل کیا۔ سجادہ نشین حضرت مولانا سید شاہ ابوالحسن قادری معروف بہ محوی ویلوری قدس سرہ (۱۱۸۶ھ - ۱۲۴۳ھ) تھے۔ حضرت میر حیات پانچ، چھے سال تک مدرسۂ لطیفیہ میں زیرِ تعلیم رہے وہاں آپ کے ساتھیوں میں حضرت محویؒ کے فرزند ارجمند حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی المعروف بہ شاہ محی الدین قطب ویلور (۱۲۰۷ھ - ۱۲۸۹ھ) کی ذات گرامی تھی جن سے آپ کو ذہنی لگاؤ اور قلبی عقیدت ہو گئی تھی۔ حضرت حیات نے اپنے جذباتِ عقیدت کا برملا اظہار اپنی اولین مثنوی مفتاح الایمان (۱۲۴۴ھ) میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

ہے افضل خانوادوں سے زیادہ — محی الدین کا ہے خانوادہ

تو رکھ اس سے ارادہ پاک اے یار — ہے تیرے دل منے گر شوقِ دیدار
عبث اپنے کے تیں ہرگز نکو کھو — مرید اب قادری میں جا کے تو ہو (۷)

حضرت حیات نے قیام ویلور کے دوران شاہ محوی علیہ الرحمہ سے نہ صرف اکتسابِ علم کیا بلکہ آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت بھی کی۔ حضرت حیات جب ویلور میں رہ کر علوم متداولہ تفسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ، تصوف، اور علمِ طب سے فارغ ہوگئے تو آپ کے جذبۂ علم اور شوق تحقیق نے آپ کو مدراس کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا، اس وقت شہر مدراس علما و فضلا کا مرکز اور اصحاب فضل و کمال کا معدن تھا۔ آپ نے ملک العلما حضرت علامہ باقر آگاہ ویلوریؒ (متوفی ۱۲۲۰ھ) اور حضرت بحر العلوم مولانا عبد العلی مدراسیؒ (متوفی ۱۲۲۵ھ) سے قیام مدراس کے دوران خوب فیضان حاصل کیا (۸)۔ یہ وہ دور تھا جب کہ جنوبی ہند کے مشہور صاحب تصنیف بزرگ جامیِ دکن حضرت شاہ کمال کڑپویؒ (متوفی ۱۲۲۴ھ) اکثر و بیشتر شہر مدراس تشریف لائے تھے۔ حضرت باقر آگاہ اور حضرت بحر العلوم سے شاہ کمال کا یارانہ تھا۔ ان بزرگوں کی علمی محفلیں قابلِ دید رہی تھیں۔ ظن غالب ہے کہ حضرت حیات شاہ کمال کڑپوی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے مرشد و شیخ طریقت حضرت محوی سے اجازت حاصل کر کے شاہ کمال کی طرف رجوع کیا اور شاہ صاحب سے طالب ہوئے۔ شاہ صاحب ولیِ کامل ہونے کے علاوہ حضرت محوی ویلوریؒ سے عمر میں بڑے تھے۔ اس لیے حضرت محوی نے بطیب خاطر اجازت مرحمت فرمادی تھی۔ حضرت حیات نے شاہ کمال کی صحبت میں علوم باطنی کی تکمیل کر لی اور بہت جلد اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ چناں چہ سخاوت مرزا نے اپنے مقالہ (۹) "سید شاہ کمال الدینؒ میں اور حکیم سید محمود بخاری نے اپنی (۱۰) تالیف "شہمیری اولیا" میں شاہ کمالؒ کے خلفا میں میر حیات کا ذکر کیا ہے۔ مگر تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ کے بجائے ۱۲۸۲ھ لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔

حضرت حیات تکمیلِ علوم ظاہری و تزئین کمالِ باطنی کے بعد وطن مالوف

میسور تشریف لائے اور تعلیم و تدریس اور طباعت و حکمت میں منہمک ہو گئے۔ بہ قول حضرت صوفی احمد علی میسوری (متوفی ۱۳۲۹ھ):

"علم طب میں مہارت کاملہ تھی، بڑے ذہین و فہیم تھے، تشخیص مرض میں ان (میر حیات) کا ثانی نہ تھا" (۱۱)

حضرت حیات کا نکاح عہد سلطان ٹیپو کے قابل قدر مصنف شہرت یافتہ شاعر و ادیب منجم سلطانی منشی غلام حسین عاصی (متوفی ۱۲۸۰ھ) کی دختر نیک اختر سے ہوا۔ منشی منجم عاصی ابتدا میں دربار حضرت ٹیپو سلطان سے وابستہ تھے اور سلطان کے معتمد علیہ احباب میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ آپ کو علم نجوم میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ چناں چہ سلطان کی شہادت کی صبح ۴/ مئی ۱۷۹۹ء کو منجم عاصی نے سلطان سے عرض کیا کہ آج کا دن آپ پر بہت سخت واقع ہو گا لہذا خوب صدقہ و خیرات کی جائے (۱۲) ۔ بہ ہر حال تقدیر غالب آگئی۔ سلطان نے شہادت کا جام نوش فرمایا، شہادت سلطان کے بعد منشی غلام حسین منجم عاصی "سری رنگ پٹن" سے ہجرت کر کے "میسور" آگئے۔ میسور کا مہاراجہ کرشنا راج وڈیر سوم (عہدِ حکومت ۱۷۹۹ء۔ ۱۸۳۱ء) نے آپ کے علم و فضل اور آپ کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے دربار میں منجم و منشی کے معزز عہدے پر مامور کر دیا، جب منشی غلام حسین درباری خدمات سے سبکدوش ہوئے تو حضرت میر حیات کو ان کی جگہ فارسی کے منشی کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ آپ ایک عرصے تک اسی خدمت پر مامور رہے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بہت جلد داغِ مفارقت دے گئیں تو شہر میسور کے ایک اور نامور بزرگ حضرت سید حسین علی شاہ قادری نے اپنی نورِ نظر کو آپ کی زوجیت میں دے دیا۔ حضرت سید حسین علی شاہ کا وطن مالوف سکندر آباد تھا۔ شاہ صاحب بمبئی، تلچری ہوتے ہوئے میسور تشریف لائے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ بھوپال کی نواب قدسیہ بیگم شاہ صاحب کی مریدہ تھیں، میسور پہنچے تو آپ کے کشف و کرامات کو دیکھ کر مہاراجہ کرشنا راج وڈیر آپ کا بے حد معتقد ہو گیا (۱۳)۔ نذر و نیاز کی بارش ہونے لگی، شاہ صاحب صاحبِ جود و سخا

تھے۔حاجت مند و احباب کو خوب سرفراز کرتے تھے۔حضرت حیات کو شاہ صاحب نے " سری رام پیٹ " مسجد کے روبرو ایک کشادہ مکان دے دیا تھا جس میں آپ تشنگانِ علم کو سیراب کرتے تھے اور فارغ اوقات میں اپنا مطب بھی چلاتے تھے۔اسی مکان میں آپ نے اپنی ساری زندگی گزار دی اور یہیں سے ۱۸۶۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا تھا (۱۴) ۔اپنے داماد کی وفات کے بعد شاہ صاحب واپس سکندر آباد لوٹ گئے اور وہیں آپ کا وصال ۱۸۶۹ء میں ہو گیا۔آپ پیر برہنہ کے مزار کے احاطے میں مدفون ہیں (۱۵) ۔حضرت میر حیات کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔بہ قول مولوی محمد خاں مرحوم " آپ (میر حیات) کی اکلوتی لڑکی کی ایک ہی دختر محمد سلطان محی الدین صاحب کی خوش دامن اور محمد نصیر الدین بنوری کی والدہ ہیں (۱۶) ۔

مولوی محمد خاں کی تحقیقی جائزہ کی روشنی میں جناب راز امتیاز صاحب سابق ایڈیٹر ادبی ایڈیشن روزنامہ " سالار " بنگلور کا وہ بیان جو انھوں نے پروفیسر میر محمود حسین میسوری کے مضمون " مولانا میر حیاتؒ میسوری " پر بہ طور نوٹ تحریر فرمایا تھا ناقابلِ التفات ٹھہرتا ہے۔راز صاحب نے لکھا:

" پروفیسر میر محمود حسین اپنے اس مضمون میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا میر حیاتؒ میسور کی " زندگی کے حالات اس سے زیادہ نہیں ملتے۔" اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ مولانا میر حیاتؒ کے اہل خاندان مدراس ہجرت کر گئے۔ان کے پوتے مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد (صدر شعبہ ، اردو ، عربی و فارسی ، آرٹس کالج مدراس) کا ابھی چند سال پہلے مدراس میں انتقال ہوا۔موصوف عربی ، فارسی اور اردو کے شاعر نغز گو تھے ، مولانا آزاد مرحوم کے ایک فرزند جناب رشید احمد فاروقی مدراس کے مشہور اڈوکیٹ ہیں۔ممکن ہے کہ ان سے مولانا میر حیاتؒ کے بارے میں مزید تفصیلات حاصل ہو سکیں یا ان کی خاندانی لائبریری سے کچھ مواد مل جائے " (۱۷) ۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ دعویٰ واضح ہوتا ہے کہ مولانا رحیم احمد فاروقی کے دادا حضرت میر حیات ہیں اور وہ میر حیاتؒ کے پوتے ہیں، خدا جانے راز امیاز صاحب کو کس طرح غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ دراصل مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا مولوی محمد قدرت حلیم صاحب فاروقی ہیں اور مولانا حلیم فاروقی کے والدِ بزرگوار یعنی رحیم احمد فاروقی صاحب کے جدِ امجد حضرت مولانا رسول فاروقی ہیں جیسا کہ مولانا قدرت حلیم صاحب نے ایک رسالہ "احکام الھلال والصیام" میں تحریر فرمایا ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:

> "اما بعد عاصی پر معاصی محمد قدرت حلیم حنفی مدراسی بن محمد قدرت رسول فاروقی ناصری بن محمد قدرت کریم گوپاموی بخاری عفراللہ لھم ولوالدھم ولاسلافھم نے اس رسالہ میں حنفی اور شافعی مذہب کے مفتی بہ مسائل روزہ کو معتبر کتب سے اخذ کر کے جمع کیا" (۱۸)۔

بہ ہر حال حضرت میر حیات ایک جید عالم، صاحب دل صوفی، طبیبِ حاذق، ماہر خطاط، باکمال خوش نویس ہونے کے علاوہ مصلحِ قوم شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے، آپ کے اولین تذکرہ نگار صوفی احمد علی احمد میسوری لکھتے ہیں:

> علوم عقلی و نقلی اور تصوف میں دخلِ تمام رکھتے تھے، کسب و ریاضت سے درجہ شہود پایا تھا، اکثر لوگوں کو تالیف و تدریس سے فیض پہنچا، ان کا مجموعہ تالیفات بمبئی میں چھپ کر کئی بار شائع ہوا ہے، اس ملک میں کوئی قریہ نہیں جس میں یہ کتاب موجود نہیں، اس میں ایک رسالہ منظومہ مسمی بہ "آبِ حیات" تصوف میں محققانہ لکھا ہے۔۔۔۔" (۱۹)۔

حضرت میر حیات تقریباً بیس (۲۰) سال تک درس و تدریس اور طباعت و کتابت کی ذمہ داریوں میں مصروف رہے۔ تصنیف و تالیف کی طرف اس عرصے میں آپ کی توجہ منعطف نہیں ہوئی، مگر آپ نے جب دیکھا کہ شہادت سلطان (۱۲۱۳ھ

مطابق ۱۷۹۹ء) کے بعد سری رنگ پٹن کی انگریزوں نے اینٹ سے اینٹ بجادی، مسلمانوں کے دلوں میں خوف و ہراس اور ناامیدی و یاس کے جذبات پیدا ہوگئے، ایسے میں خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسیور مہاراجا کی صورت میں مسلمانوں کو امید کی کرن نظر آئی، اکثر و بیش تر خاندان پٹن سے ہجرت کرکے میسور منتقل ہوگئے وہاں حسب استعداد سبھی کو روزی رزق مہیا ہوئے، مسلمانوں میں خود اعتمادی بحال ہونے لگی، ایک گونہ خوش حالی جگہ پانے لگی، مسلمانوں کی گری ہوئی ساکھ دوبارہ سنبھلتی چلا گئی تو عیش و عشرت کے دروازے خود بہ خود کھلتے چلے گئے، اخلاقی پستی راہ پائی، مسلمان اپنے دین و مذہب سے دور بدعات و خرافات میں مبتلا ہونے لگے تو حضرت میر حیات نے اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے مسلمانوں کو بچانے، انھیں خوابِ غفلت سے جگانے اور ان کے دلوں میں اسلام کے صحیح عقائد کو جاگزیں کرنے کے لیے قلم کے ذریعے اصلاحِ امت کا بیڑا اٹھایا، چناں چہ آپ نے ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں اپنی اولین مثنوی "مفتاح الایمان" عقائد کے بیان میں لکھی، آپ کی یہی ایک مثنوی ہے جس میں آپ نے اس کی تصنیف کا سال تحریر کیا ہے، چناں چہ آپ کا ارشاد ہے:

بحمداللہ کہ یہ مفتاح الایماں ہوئی آخر بہ حق شاہِ عرفاں
سنِ ہجری اتھا اس وقت اے یار ہزار و دو صد و چالیس پر چار ۱۲۴۴ھ

"مفتاح الایمان" تقریباً نو سو چھہتر ۹۷۶ اشعار پر مشتمل طویل مثنوی ہے، تصنیف کی غرض و غایت تقاضاءِ وقت کے تحت مسلمانوں کے اس طبقہ کی اصلاح و رہنمائی ہے جو عموماً ناخواندہ دین سے دور، شرعی اوامر و نواہی سے بے پروا آپ اپنی دنیا میں مست و الست رہتے ہیں۔ ان کے آگے جو بات بھی کہی جائے انھیں کی آسان اور قابل فہم زبان میں ہو۔ یہی حکمت و دانائی کا تقاضا ہے ورنہ مقصد فوت ہوجائے گا۔ ان ہی اسباب کے مدِ نظر حیات نے اپنی اس مثنوی بلکہ تمام تصنیفات کی زبان سادہ و شستہ اختیار کی۔ علاوہ ازیں اس دور میں میسور و اطراف میسور میں رائج دکنی زبان

بھی تقریباً وہی تھی جس کی بازگشت آپ کے اشعار میں سنائی دیتی ہے۔ مفتاح اللمان کے اختتام پر بہ عنوان تتمہ ز حسب حال گوید" آپ رقم طراز ہیں:

نہ مجھ کو لفظ و معنی کی خبر ہے	ردیف و قافیہ پر نا نظر ہے
کبھی یک بیت دکھنی میں لکھانیں	ضرورت اس کے تیں دکھنی کیا میں
عوام الناس کی میں گفتگو پر	لکھاہوں صاف اس کو اے برادر
تکلف نیں کیا ہوں دیکھ منظوم	کہ تاہر اک کو ہووے صاف معلوم

(۲۱)

" مفتاح اللمان " کی تکمیل کے دو ہی سال بعد ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ھ میں انگریزوں نے میسور کے مہاراج " کرشن راج وڈیر سوم " کو تاج و تخت سے بے دخل کرتے ہوئے ریاست پر اپنا راست اقتدار سنبھال لیا، جو نصف صدی یعنی ۱۸۸۱ء تک باقی رہا، اس دوران مسلمانوں کا دینی شعور پختہ ہونے کے بجائے حالت اور ابتر ہونے لگی، ایک طرف مغرب کی اندھی تقلید اور دوسری طرف عقائد و اعمال کی تغلیط نے مسلم معاشرے میں نت نئے فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔ حضرت حیات نے اس کے سنگین نتائج و عواقب کا پیشگی اندازہ لگالیا۔ آپ کا قلم اصلاحی مقاصد کو لے کر بڑی سرعت سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آپ نے دم آخر تک لکھنا نہ چھوڑا۔ آپ نے سینتیس سال کے عرصے میں تقریباً پچاس رسائل نظم و نثر میں تحریر کیے۔ جن میں سے تیس اردو مثنویاں، ایک قصیدہ بردہ کا ترجمہ، منظوم پندرہ اردو نثری رسالے اور چار فارسی کے رسالے ہیں۔ اردو ادبیات کی تعداد ساڑھے چھے ہزار سے زائد اور فارسی ابیات تقریباً اکسٹھ بتائی جاتی ہے (۲۲)۔ آپ کے اکثر رسالے آپ کی زندگی ہی میں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے تھے۔ ان میں سے بعض اس قدر مقبول ہوئے کہ تاحال اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کے رسائل کے دو مجموعے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلا مجموعہ جس کو قبولیت عام اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔ " مصباح الحیات " ہے۔ اس میں بائیس رسالے شامل ہیں، انھیں تین ابواب میں شامل کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا نام " عشرۂ مبشرہ " رکھا گیا۔ اس میں دس رسالے ہیں۔

دوسرا باب حضرات خمسہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں جملہ رسائل پانچ ہیں، آخر میں آپ کی اولین مثنوی "مفتاح الایمان" میں داخل کر دی گئی ہے۔ تیسرا باب "کشف کبریٰ" ہے جو جملہ چھے رسالوں پر مشتمل ہے۔ ان میں پہلا رسالہ "آب حیات" ہے، یہ دراصل حضرت حیات کی معرکہ آرا، طویل مثنوی ہے۔ اس کا موضوع تصوف و سلوک ہے۔ اس مثنوی کو آپ نے مثنوی مولانا رومؒ کے طرز پر لکھا ہے جس میں حکایتوں اور تمثیلوں کے ذریعہ مسائل تصوف کی تشریح و توضیح کی گئی۔ اس مثنوی میں حضرت حیات نے حضرت بندہ نواز، شاہ عبد العزیز دہلوی، شاہ کمال، حضرت بحر العلوم، حضرت شہمیر کڈپوی وغیرہ اکابر بزرگان دین کے حکایات و اقوال زرین بیان کیے ہیں۔ اس مجموعہ کے باقی پانچ رسالے نثر میں ہیں۔ تصوف، عقائد، مسائل، فضائل اور شرک و کفر کے بیان پر مشتمل ہیں۔ آپ کا یہ مجموعہ یعنی مصباح الحیات آپ کے حین حیات مدراس، بنگلور اور بمبئی سے چھپا، بعد ازاں اس کی شہرت شمالی ہند میں بھی ہوئی چناں چہ کان پور اور لکھنؤ سے بھی "مصباح الحیات" کی طباعت ہونے لگی اس کی افادیت اس قدر مسلم ہو گئی کہ بہ قول مولوی محمد خاں "اس کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی ایک واقعہ ہو سکتا ہے کہ محترم مولوی سید مرتضی صاحب حیدر آبادی نے یہ کتاب ریاست بڑودہ میں بہ طور نصاب تعلیم اپنے بچپن میں پڑھی ہے" (۲۳)۔

چوں کہ یہ مجموعہ رسائل (مصباح الحیات) عقائد، فقہ، اخلاق، تصوف، لسانیات، حقوق وغیرہ ہمہ قسم کے افادی مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بیان میں سادگی اور اختصار کا کافی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے بچے بڑے، مرد اور خواتین کے یکساں طور پر افادہ کا باعث ہے۔ مثال کے لیے یہاں اس مجموعہ کے ایک رسالہ "آداب سعادت" کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے، ملاحظہ ہو: در بیان آداب تہنیت

تہنیت

تہنیت کے ہیں یہ آداب اے پسر   تو سیہ جامے کو مت جا پہن کر

دوپہر کو جانہ کو اور وقتِ شام
کر خوشی کا اس کے آگے تو کلام

پہن جامہ پاک یا رنگین لباس
بھی نکو رکھ دل کے تیئں ہرگز اداس

ذکر غم کا کر نکو اے نیک دین
ہونکو ہرگز وہاں چیں بر جبیں

بول اس کو یہ مبارک تجھ کو ہو
حق میں اس کے کر دعا اے نیک خو(۲۴)

دربیانِ آدابِ عیادتِ مریض:۔

مصطفیٰ ایسا کہے اے خوب رو
جن تسلی جادیا بیمار کو

ہے وہ میرا دوست مقبولِ خدا
نا رہے جنت میں میرے سے جدا

یہ ہے آدابِ عیادت نیک خو
دوست ہو یا آشنا بیمار ہو

وقت فرصت پاک جامہ پہن کر
دے خوشی سے اس کو صحت کی خبر

اس کے آگے مختصر ایسا کہے
خرمی جس بات سے اس کو رہے

لاغری اور رنج کامت کر بیان
اور غمگین ہونکو ہرگز وہاں

کر دوا میں اس کے کوشش نیک ذات
بھی دعا کر حق میں اس کے دل کے سات

کچھ خطا بیمار سے ہووے اگر
دل سے اپنے اس خطا سے درگزر(۲۵)

"مصباح الحیات" کی مانگ ہندوستان بھر میں ہونے لگی تو شمال کے مطبعوں نے نہ صرف اس کی طباعت سے خوب مالی منفعت حاصل کی بلکہ بعض دکنی الفاظ بدل کر فاضل مصنف پر یہ الزام عائد کیا کہ ان کے اشعار غیر موزوں اور بے قافیہ تھے۔ راقم الحروف کے پاس مطبعِ رزاقی کان پور میں ۱۳۲۶ھ میں شائع شدہ "مصباح الحیات" کا ایک نسخہ موجود ہے جس کے آخر صفحے پر مرقوم مہتمم مطبع کا اعلان قابلِ توجہ بھی ہے اور قابل عبرت بھی، ملاحظہ فرمائیں:

"خاتمتہ الطبع بہ عونِ عنایت بے غایت حضرت قاضی الحاجات یہ مجموعہ "مصباح الحیات" مشتمل بر بیست (۲۲) و دو رسائلِ مسائل فقہیہ و عقائد و طریقت ماہ جمادی الاول ۱۳۲۶ ھجری کو مطبع رزاقی واقع کان پور میں حسب لِماءِ جناب حاجی محمد سعید صاحب تاجر کتب کلکتہ۔ خلاصی ٹولہ نمبر ۸۵ و مالک رزاقی و مجیدی و غیرھما باہتمام عاجز غنی احمد غفرلہ اللہ الاحد مطبوع ہو کر مرغوب طبع اہلِ اسلام ہوا۔

اعلان یہ مجموعہ "مصباح الحیات" زبانِ قدیم مدراسی میں تھا، اکثر اشعار اس کے غیر موزوں، بے قافیہ، خلاف محاورۂ اردو تھے، پس عوام اردو فہم کو پسند نہ تھا اس لیے حتی الوسع اس کی اصلاح و ترمیم کر کے چھپوایا ہے۔ گویا یہ نسخہ جدید ہو گیا ہے، حقِ اصلاح و ترمیم اس کا محفوظ ہے، کوئی صاحب نقل بعینہٖ اس کی بغیر اجازت عاجز کے طبع نہ فرماویں۔ فقط

المعلن محمد غنی احمد
مہتمم مطبعِ رزاقی، واقع کان پور (۲۶)

حضرت میر حیات کا دوسرا مجموعہ "سراج الحیات" ہے۔ اس میں منظوم و منثور چوبیس رسائل موجود ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۲۷۱ھ میں بمبئی سے شائع ہوا (۲۷)۔ راقم کی نظر سے "سراج الحیات" کا وہ نسخہ گزرا ہے جو ۱۳۲۱ھ میں مطبع احمدیہ بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے جملہ صفحات ۲۳۲ ہیں۔ "سراج الحیات" کے چوبیس رسالوں میں حضرت امام بوصیری رحمت اللہ علیہ کے مشہور زمانہ نعتیہ قصیدہ معروف بہ "بردہ شریف" کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ اس ترجمہ کے تعلق سے پروفیسر میر محمد حسین میسوری کی رائے ہے کہ یہ قصیدۂ بردہ کا پہلا منظوم اردو ترجمہ ہے (۲۸) حالاں کہ حاکم کڈپہ خان بہادر نواب عبدالنبی خاں میانہ کے درباری شاعر محمد ابنِ رضا نے ۱۱۲۰ھ میں قصیدۂ بردہ کا منظوم دکنی ترجمہ کیا تھا جس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں اور دوسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لنڈن (۲۹) میں موجود ہے۔

"سراج الحیات" کے ان ہی رسالوں میں فنِ خطاطی و خوشنویسی کے اصول و قواعد پر مشتمل ایک رسالہ "حسنِ خط" بھی ہے، اس منظوم رسالہ میں ایک سو بیس ابیات ہیں۔ جن میں خوش خطی کی فضیلت سے لے کر، کاغذ، قلم اور روشنائی بنانے کی ترکیب تک کا ذکر موجود ہے، حضرت میر حیات "ریاستِ میسور" کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اس فن پر اردو زبان میں کتاب لکھی، اس کتاب کے منتخب اشعار

ملاحظہ ہوں:

حسنِ خط حمدِ خدائے ذولکرم ہے گواہ اس بات پر لوح و قلم
حرفِ کن سے دو جہاں پیدا کیا ہے خبر جف القلم کی او دیا
نعتِ احمد حسنِ خط اوس پر علم سب کے اول رب کیا پیدا قلم
حسنِ خط سے تسمیہ لکھنا ثواب جس لکھے جنت میں جاوے بے حساب
حسنِ خط ہے اہلِ دولت کو جمال حسنِ خط غربا کے تئیں جاہ و جلال
اس رسالے بیچ ہیں تعلیم دو ایک نستعلیق دوسرا نسخ ہو
ہے مربع خط کیتیں نقطہ ہے فام قد الف کا تین نقطے ہو تمام(۳۰)

حضرت میر حیات کا ایک معرکہ، آرا نثری رسالہ "خمسہ، حیات" ہے۔ اس میں علم تصوف کے پانچ اہم اصطلاحات کی توضیح سوال و جواب کے نہج پر بیان کی گئی ہے۔ ابتدا میں حمد و صلواۃ اور موضوع کا بیان مختصر نظم کی صورت میں ہے، ملاحظہ ہو:

اسم اللہ ہے مسمیٰ سو وجود اس سے پیدا علم اور نور و شہود
ہو گئی جب موجزن دریائے نور ہو گیا ممکن سے واجب کا ظہور
نیں سو یہ اور ہے سو وہ نورِ قدیم ظاہر و باطن ہے رحمن و رحیم
موجِ اول ہے محمدؐ اس کا نام ہے سو وہ نورِ مجرد والسلام
اس پہ ہو ہر دم درو داں بے حصر آل پر اور اس کے ہو اصحاب پر
پانچ مسئلے معرفت کی جان ہے وہ پچھانے جس کے تئیں عرفان ہے
پانچ مسئلے بسکہ ہیں دشوار تر پہلے ہے توحید اور جبر و قدر
بھی تجدد اور معیت اور وصال حسبِ خواہش میں لکھا یہ پانچ حال

میں رکھا حضرات خمسہ اس کا نام
بولتے خمسہ حیات. اس کو تمام

حضرت میر حیات کے نثر کا نمونہ اسی رسالہ، "خمسہ، حیات" سے پیش کیا جارہا ہے:

"اے عزیز۔ نفس رحمانی باعتبار ظہور بطون کے موصوف تمامی اسما

اور صفات کا ہے اور اعیانِ خارج پر محیط ہے اور موجود ہے۔ یعنی مفہوم یافت کو وجود کہتے ہیں اور ہستی نام رکھتے ہیں کہ بالذات ہے اور خارج میں موجود ہے اور تمامی موجودات عارض اس کے ہیں اور قائم اس سے ہیں۔ اگر مفہوم یافت کا اندیشہ میں ہووے اس کو وجود ذہنی کہتے ہیں، اور خارج اندیشہ کے بودے اس کو وجود خارجی کہتے ہیں۔ یہ ہردو کے معنیٰ ایک ہے اور موجودات اشیاء کی عبارت ہے جو انھوں کو حضرت وجود کے ساتھ تعلقِ خاص ہے۔ نسبت تعین ہے اس واسطے حضرتِ وجود سے ان کو اثر پہونچتا ہے اور ہر آن تازہ تازہ پہونچتا ہے" (۳۱)۔۔۔۔۔

مندرجہ بالا نثری نمونہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ حضرت حیات نے موضوع کی مناسبت سے خالص علمی نثر استعمال کی۔ قاری جب تک منطقی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوگا تب تک اس نثر کے معنیٰ اور مفہوم کو ذہن کی گرفت میں لے آنا تقریباً ناممکن ہوجائے گا، آپ کی اس علمی پرشکوہ نثر کے برخلاف "مصباح الحیات" میں شامل رسالوں کی نثر سہل اور رواں ہے، یہ اس لیے کہ اول الذکر نثر اہلِ علم تصوف کے شائقین کے لیے ہے اور مؤخرالذکر نثر عوام الناس کی بنیادی دینی تعلیم کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ رسالہ "دستور الایمان" کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"اے عزیز بیان نماز کا یہ ہے، فرض اور واجب فرمان خدا کا ہے، سنت اور مستحب فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کا ہے۔ بنائے مسلمانی کے پانچ فرض ہیں، کلمہ پڑھنا، نماز کرنا، روزہ رکھنا، زکواۃ دینا، حج کرنا، وضو واسطے نماز کے فرض ہے۔ وضو میں چار فرض ہیں۔ منہ دھونا، ہاتھ کہنیوں تک دھونا، پاؤ سر کا مسح کرنا اور پاؤں ٹخنے تک دھونا، اے عزیز! غسل میں تین فرض ہیں۔ غرغرہ

کرنا، ناک میں پانی لینا، تمام بدن کو تر کرنا ہے" (۳۲)۔

رسالہ " خمسہ ٔ حیات " پہلی بار ۱۲۷۸ھ میں " مطبع مسلمانی ویلور " اور " مطبع حیدری بمبئی " سے ایک ساتھ شائع ہوا (۳۳)

حضرت حیات کی فارسی تصانیف میں " شمعِ محفل " قابل ذکر ہے جس میں مختلف موضوعات پر اساتذۂ فارسی کے اشعار درج کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی حضرت حیات نے اپنے اشعار بھی رقم کیے ہیں۔ کتاب کے آخر میں عربی اور فارسی کے محاورات اور ضرب الامثال پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں آپ کا بسوط مقدمہ خاصے کی چیز ہے۔ یہ کتاب بھی ۱۲۷۸ھ میں " مطبع مسلمانی ویلور " سے شائع ہو چکی ہے۔

حضرت حیات کے دو غیر مطبوعہ فارسی رسائل بہ نام " مجمع لارشاد " و سفینتہ النجات " اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، جامعہ میسور میں موجود " کلیات حیات " کے نادر نسخے میں شامل ہیں (۳۴)۔

آخر میں حضرت میر حیات کے رسائل سے منتخب اشعار پیش کیے جا رہیں تاکہ آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ایک عکسِ جمیل ذہن کے آئینہ خانے میں جلوہ بار ہو سکے:

ربنا یا ربنا یا ربنا
کیوں زبان سے ہو سکے تیری ثنا

مصطفیٰ پر جان و دل قربان ہے
جب تلک اس تن کے اندر جان ہے

کہوں دم بہ دم حمد سبحان کا
کہ ہے میری قوت دل و جان کا

ہیں برحق محمدؐ رسول خدا
میرا جان و دل ان پہ ہم دم فدا

کروں ابتدا میں بہ حمدِ خدا
عدم سے ہمیں اس نے پیدا کیا

ہیں برحق محمدؐ خدا کے رسول
کرے حکم ان کا دل و جاں قبول

وہ اک کن سے دو عالم کو بنایا
عدم سے کھینچ کر ہستی میں لایا

الٰہی ہے تجھے دو جگ کی شاہی
محبت دے تری اور آشنائی

محمدؐ کے لیے دونوں جہاں ہے
مبارک نام وہ تعویذ جاں ہے

محمدؐ ہے مرادِ جان و ایماں
محمدؐ رمز معنیٰ ، راز قرآں

حکایت:

ایک دن پوچھے نبیؐ سے یوں بتولؓ   بولتے کس کو شریعت اے رسولؐ

بھی طریقت اور حقیقت ہے سو کیا   فاطمہؓ سے یوں کہے جب مصطفیٰؐ

ہے شریعت جو کہا ہوں میں پیام   ہے طریقت جو کیا ہوں میں سو کام

میں جو دیکھا ہوں حقیقت اس کا نام   معرفت ہو اس سے حاصل والسلام

راہ لے دے جو خلافِ مصطفیٰؐ   اوس کو ہرگز نا ملے راہ و صفا(۳۵)

(مثنوی آبِ حیات)

بہ ہر حال حضرت میر حیات قدس سرہ کے علمی و لسانی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

حواشی

(۱) ادبیاتِ میسور ص ۳۷ از میر محمود حسین مرحوم مطبوعہ ۱۹۷۱ء اردو لائبریری سنٹر سٹی مارکٹ بنگلور ۲

(۲) مصباح الحیات (مجموعہ) ص ۵۳

(۳) ایضاً ص ۴۶

(۴) ادبیاتِ میسور ص ۳۶ - نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اول میں اور مولوی محمد خاں نے اپنے مقالہ "میسور میں اردو" میں "میر حیات" کے نام کے ساتھ لفظ "محمد" کا اضافہ کیا ہے۔

(۵) ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما ص ۵۵

(۶) مصباح الحیات ص ۱۷۶

(۷) ادبیاتِ میسور ص ۲۹

(۸) ایضاً ص ۳۸

(۹) رسالہ "اردو" ماہ اپریل ۱۹۳۹ء ص ۲۶۸

(۱۰) شہمیری اولیا ص ۱۱۸ از حکیم سید محمود بخاری مطبوعہ ۱۹۵۸ بزم آستانہ شہمیریہ کڈپہ

(۱۱) سرمہ بصیرت از صوفی احمد علی احمد میسوری مرقومہ ۵ / ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ بہ روز دوشنبہ

(مخطوطہ)

(۱۲) داستان میسور ص ۴۸ از اکرام کاوش مطبوعہ ۱۹۸۸ء میسور

(۱۳) "میسور میں اردو" ص ۷ از مولوی محمد خاں (غیر مطبوعہ)

(۱۴) ادبیات میسور ۳۹

(۱۵) میسور میں اردو ص ۷

(۱۶) ایضاً ص ۷

(۱۷) روزنامہ "سالار" ادبی ایڈیشن مؤرخہ ۵/جون ۱۹۸۹ء ص ۳ مطبوعہ "دفتر سالار" بنگلور

(۱۸) احکام الھلال والصیام ص ۲ از مولانا محمد قدرت حلیم فاروقی مطبوعہ ۱۳۴۵ھ در مطبع نامی مدراس

(۱۹) "سرمہ بصیرت" (مخطوطہ) مخزونہ جناب سلیم تمنائی صاحب مرقومہ ۵/ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ

(۲۰) مصباح الحیات ص ۱۱۰

(۲۱) مصباح الحیات ص ۱۱۰

(۲۲) ادبیات میسور ص ۴۵

(۲۳) میسور میں اردو (قلمی)

(۲۴) مصباح الحیات (آداب سعادت) ص ۳۴

(۲۵) ایضاً ص ۳۴

(۲۶) مصباح الحیات ص ۱۸۰ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ در مطبع رزاقی کان پور

(۲۷) ادبیات میسور ص ۴۵

(۲۸) ایضاً ص ۵۳

(۲۹) کڈپہ میں اردو، راہی فدائی ابوالحسان اکاڈمی کڈپہ ص ۱۸

(۳۰) داستان میسور ص ۱۸۶

(۳۱) خمسہ حیات ص ۵ (مخطوطہ) مخزونہ کتب خانہ آستانہ شہمیریہ، کڈپہ۔ راقم کے پاس اس نایاب نسخے کی نقل موجود ہے۔

(۳۲) مصباح الحیات ص ۱۷۰ (دستور الایمان)

(۳۳) ادبیات میسور ص ۴۵

(۳۴) ایضاً ص ۴۶

(۳۵) مصباح الحیات ص ۱۱۶

حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری ویلوری

آپ کا لقب " محی الدین " ہے اور آپ " قطب ویلور " کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں ۔آپ کے والد ماجد سید شاہ ابوالحسن قادری محوی ویلوری (متوفی ۱۲۴۳ھ) ابن حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوقی ویلوری (متوفی ۱۱۹۴ھ) اور والدۂ ماجدہ حضرت بی بی امتہ المجید صاحب (متوفاۃ ۱۲۸۲ھ) بنت حضرت سید شاہ علی محمد قادری ویلوری (متوفی ۱۲۲۶ھ) ہیں ۔آپ کی ولادت بتاریخ ۱۴/ جمادی الاول ۱۲۰۷ھ بروز دوشنبہ بمقام محلہ سعید آباد ویلور ہوئی (۱) ۔ تعلیم کی ابتدا حسب روایت چار سال کی عمر میں ہوئی ۔ شفیق والد نے اپنی سرپرستی میں فارسی کی تدریس کا آغاز کر دیا ، خداداد صلاحیت اور آپ کے شوق و ذوق نے مہمیز کا کام دیا ، کھیل کود میں بالکل دل نہیں لگتا تھا ، لکھنا پڑھنا ہی مشغلہ ٹہرا ۔آٹھ سال کی عمر میں عربی کے خوش نویس ہوگیے تھے ۔ بچپن ہی سے طبیعت میں اک گونہ استغنا تھا ، والدین پر اپنے اخراجات کا بار ڈالنا گوارا نہیں تھا ، لہذا تین چار دن میں کلام مجید کا ایک سیپارہ خوش خط سے لکھ کر اپنی مسجد کے موذن کے حوالے کر دیتے ۔ موذن اس کے ہدیہ کی رقم آپ کے ہاتھ تھما دیتا تو آپ اپنی والدہ کی خدمت میں ساری رقم پیش کر دیتے تھے (۲) ۔آپ ایک طرف اپنے خاندانی مدرسہ میں ماہر اساتذۂ کرام کے زیر نگرانی علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کر رہے تھے تو دوسری طرف قدرت نے فنون حرب و ضرب سے بھی آپ کو آراستہ کرنے کا انتظام فرما دیا تھا ، ہوا یہ کہ ۱۲۱۳ھ میں جب حضرت ٹیپو سلطانؒ شہید ہوئے تو انگریزوں نے سلطان کے اہل خانہ و افراد خاندان کو سری رنگ پٹن سے لاکر ویلور کے قلعے میں نظربند کر دیا ۔ سلطان کے گھر والوں کو حضرت مکان کے بزرگوں بالخصوص قطب ویلور کے والد حضرت محوی سے بڑی عقیدت تھی ، چناں چہ ایک شہزادے نے حضرت محوی کی خدمت میں یہ عریضہ ارسال کیا کہ حضرت ! میں صاحب زادے (حضرت قطب ویلور) کی تعلیم کی نیت کر چکا ہوں ۔آپ اجازت دیں تو صاحب زادے کے لیے

اتالیق مقرر کر دوں گا، شہزادے کی خواہش پر آپ نے اجازت دے دی۔ اس طرح آپ کو علوم شرعیہ کے علاوہ فنون حرب وغیرہ سیکھنے کا نادر موقعہ مل گیا۔ مصنف "مطلع النور" نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم کیا ہے:

ٹیپو سلطان شہیدِ عالی شان ملک مہسور کا جو تھا سلطان
(میسور)
اس کی رحلت کے بعد لوگ اس کے بیگمات اس کے اور شہزادے
سب تھے محصور قلعہ۔ ویلور معتقد پدرِ شیخ کے مشہور
(حضرت تحوی)(قطب ویلور)
سواسی روز ایک شہزادہ ہو بریں امرِ خیر آمادہ
والدِ شیخ پاس سرعت سے بھیجا پیغام یہ عقیدت سے
کہ میں نیت کیا ہوں اے رہبر شیخ زادے کی تربیت کے اوپر
تین استاد کو میں دیوں قرار تار ہیں تربیت میں لیل و نہار
کہ معلم ہوں علم کے وہ فہیم دیوے یک خط نسخ کی تعلیم (۴)
اسپِ رہوار ایک دو سائیس ایک جابک سوار بھی اے رئیس
ان کے مہوار اور اخراجات ہم ہی پہنچاویں بس خوشی کے سات
اور خوراکی بھی شیخ زادے کی مہہ بمہہ سی روپیہ پہنچیگی
جب ہوا امرِ خیر سے مسؤل والدِ شیخ نے کیا ہے قبول
سہ اتالیق و اسپ اور انفار اور چابک سوار بھی اے یار
ہوئے حاضر مکانِ اقدس پر اور باندھے ہیں تربیت پہ کمر (۳)

حضرت قطب ویلور انیس سال کی عمر ۱۲۲۶ھ میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہوگئے اور ۱۲۲۷ھ سے ۱۲۲۸ھ تک دو سال کے اندر اندر قرآن شریف کا حفظ بھی مکمل کرلیا (۴)۔ بعد ازاں آپ نے تقریباً آٹھ سال تک کتب تفاسیر، احادیث، سیر رجال، ملفوظات بزرگاں، تواریخ گزشت گاں اور کتبِ فرق گمرہاں کا از خود تفصیلی اور گہرا مطالعہ فرمایا، آپ کی علمی تشنگی مطالعہ کے ساتھ بڑھتی ہی گئی تو ۱۲۳۴ھ میں جب کہ آپ کی عمر ستائیس سال تھی مدراس کا قصد کیا، اس وقت شہر مدراس علما و فضلا اور اکابر صوفیاء کا مرجع تھا۔ گو کہ اس وقت تک حضرت علامہ باقر آگاہ (متوفی ۱۲۲۰ھ) اور

حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم (متوفی ۱۲۲۵ھ) جیسی عظیم المرتبت فخر روزگار شخصیتیں پردہ کر چکی تھیں مگر ان کے خوشہ چین اور فیض یافتہ جانشین موجود تھے۔ حضرت قطب ویلور نے ملک العلما مولانا علاؤ الدین احمد شارح فصول اکبری و داماد حضرت بحر العلوم (المتوفی ۱۲۴۲ھ) اور دیگر اساتذۂ مدرسہ کلاں سے مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی، بالخصوص علم ہیئت سیکھنے کے دوران انگریزی کی ضرورت محسوس ہوئی تو شب و روز محنت کرتے ہوئے صرف سترہ دن میں انگریزی زبان لکھنے پڑھنے پر عبور حاصل کر لیا۔ مدراس میں آپ کا قیام پورے آٹھ سال رہا۔ یہاں تک کہ آپ نے ۵ / شعبان ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۳۰ء کو سند فراغت حاصل کی (۵)۔ مؤلف انوارِ اقطاب ویلور تحریر فرماتے ہیں کہ:

> " حسب ارشاد والدہ ماجدہ ۱۲۳۴ھ میں آپ (قطب ویلور) مدراس تشریف لے گئے اور تبرکاً و تیمناً آپ نے دو سبق حضرت مولانا عبد العلی صاحب بحر العلوم المعروف بہ ملک العلما و فاضل عالی جاہ مولانا باقر آگاہ رحمت اللہ علیہما سے پڑھ کر بعد ازاں فاضل متبحر مولانا علاؤ الدین ۔۔۔۔ کی خدمت میں علومِ نقلی و عقلی کی تکمیل کے لیے تشریف لائے " (۶)۔

فاضل مؤلف کا مذکورہ بیان اس لیے صحیح نہیں ہے کہ حضرت قطب ویلور مدراس تشریف لانے تک مذکورہ اول الذکر دونوں کاملین واصل بہ حق ہو چکے تھے جیسا کہ سطور بالا میں راقم لکھ چکا ہے (۷)۔ بہ ہر حال آپ ۱۲۴۲ھ میں مدراس سے ویلور آئے اور اپنے والد کی خدمت میں منازل سلوک طے کرنے لگے، آخر کار آپ کے والد حضرت محویؒ نے اپنے وصال (۱۲۴۳ھ) سے پہلے آپ کو خاندانی روایات کے مطابق ایک سو اکانوے سلسلوں اور چھبیس خانوادوں کی اجازت و خلافت سے بہرہ ور کیا (۸)۔

والدِ ماجد کے ارتحال کے بعد حضرت قطب ویلور سندِ ارشاد پر متمکن ہوئے

تو اس خانقاہی مدرسہ میں گویا نئی روح پڑ گئی۔ایک طرف درس و تدریس کا نظام جو حضرت محوی کے دور میں ذرا سا بے ترتیب ہو گیا تھا، دوبارہ پورے آب و تاب کے ساتھ جاری ہو گیا۔دوسری طرف تزکیہ و احسان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ اس قدر پھیل گیا کہ دور دراز سے لوگ اپنی روحانی تشنگی بجھانے آجاتے۔خانقاہ میں قیام پذیر ہوتے، پھر چند دن کی تربیت ہی سے فیض یاب ہو کر چلا جاتے۔آپ کی جامع ذات والا صفات مجمع البحرین تھی جس کی وجہ سے عقیدتمند کشاں کشاں آپ کے آستانے کی طرف چلے آتے تھے۔آپ کی علمی و روحانی شخصیت سے کما حقہ، استفادہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔عرب و عجم میں تقریباً سات لاکھ اشخاص نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور نعمت باطنی سے مالا مال ہوئے۔ان میں سے تقریباً چار سو بزرگوں نے خرقہ خلافت زیب تن کیا اور اجازتِ دعوت و ہدایت سے سرفراز کیے گئے جن کی بدولت ہر شہر میں بلکہ قریہ قریہ میں شمع ایمان و عرفان روشن ہوتی گئی، کفر و جہالت کی تاریکی دم توڑنے لگی، افراد سازی کی یہ عظیم و بے لوث خدمت حضرت قطب ویلور کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے، جس کا اعتراف آپ کے معاصرین اور آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔چناں چہ مشہور عالمِ دین و مفکرِ اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی کے والدِ محترم حضرت مولانا سید شاہ عبدالحی حسنی نے اپنی معرکہ، آرا تالیف "نزھۃ الخواطر" میں اور حضرت مولانا شاہ محمد ولی اللہ قادری تلمیذِ علامہ مفتی ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ لکھنوی فرنگی محلی نے اپنی لاجواب تصنیف "جوہر العرفان" (۹) میں حضرت قطب ویلور کی خدمات جلیلہ کو نہ صرف کھلے دل سے سراہا بلکہ مؤخر الذکر نے آپ کے مریدوں اور خلفا کی تعداد بھی وہی بتلائی جس کا ذکر سطور بالا میں گزر چکا ہے۔حضرت قطب ویلورؒ نے رشد و ہدایت کا کام اس وسیع پیمانے پر جاری کر رکھا تھا کہ ہندوستان کے طول عرض میں واقع رجواڑوں کے راجاؤں کو دنیا بھر کے عیسائی رہنماؤں اور حکام کو یہاں تک کہ ملکۂ انگلستان وکٹوریہ (Queen Victoria) کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، ملکۂ وکٹوریہ نے آپ کے خط کا

جواب دیتے ہوئے برملا اعتراف کیا کہ مذہب اسلام دین برحق ہے مگر چند وجوہ کی بنا پر وہ اسلام قبول کرنے سے قاصر ہے (۱۰)۔ آپ ہر سہ شنبہ خواتین میں اور ہر جمعہ مردوں میں وعظ و تقریر فرماتے تھے۔ آپ کی شہرت و مقبولیت ملک و بیرون ملک سمندر پار پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے بعض ناعاقبت اندیش، شرپسندوں نے ۱۲۵۵ھ میں انگریز حکام کے سامنے یہ جھوٹی گواہی دی کہ حضرت قطب ویلور اپنے وعظ و بیان کے ذریعہ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دے رہے ہیں، یہ سنتے ہی حکام بے چین ہو گئے کیوں کہ ایک تو آپ کی شخصیت مرجع خلائق اور مقدس مانی جاتی تھی۔ دوسرا تین دہائی پیش تر ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں اسی شہر ویلور میں انگریزوں کے خلاف ایک زبردست بغاوت ہو چکی تھی جس سے ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں تھیں (۱۱)۔ لہذا افسروں نے حکام بالا سے مشورہ کر کے آپ کو حراست میں لے لیا اور چتور کے صدر حوالات میں نظر بند کر دیا، جیل میں آپ سے کرامات سرزد ہوئے جسے دیکھ کر جیل کے ذمہ دار آپ کی عزت کرنے لگے اور آپ کو ہر طرح کی سہولت فراہم کر دی گئی۔ آپ کے پورے پچاس دن حوالات میں گزرے، جب مقدمہ شروع ہوا تفتیش ہوئی اور گواہوں پر جرح و قدح کی گئی۔ بالآخر آپ کو تمام الزامات سے بری ٹھہراتے ہوئے با عزت و احترام رہا کر دیا گیا، جج نے آپ کو ان شرپسندوں کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ دائر کرنے کی اجازت دیدی تھی مگر آپ نے ان کے توقعات کے برعکس تمام مخالفین کو معاف فرمادیا۔ اس وسعت قلبی اور احسان مندی کو دیکھ کر دوست دشمن سب کے سب حیران و ششدر رہ گئے اور آپ کی بے حد تعظیم و توقیر کرنے لگے۔ آپ نے دوبار حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، آپ کا پہلا حج ۱۲۶۰ھ م ۱۸۴۴ء میں ہوا آپ ۲/ شعبان ۱۲۶۰ھ کو ویلور سے روانہ ہوئے، تقریباً دو سال ارض مقدس میں قیام فرمایا جہاں سینکڑوں عقیدت مندوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا (۱۲)۔ ۱۲۶۱ھ میں شہر طائف کی زیارت کی اور بتاریخ ۹/ ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء شہر ویلور پہنچ گئے۔ قیام مکہ مکرمہ کے دوران آپ نے حضرت مولانا شاہ اسحاق دہلوی مہاجر مکی سے ماہ جمادی

الاولیٰ ۱۲۶۲ھ میں تبرکاً سندِ حدیث حاصل کی (۱۳)۔ حضرت قطب ویلور کے خلیفہ شاہ عبدالحیٔ احقر نے ان تاریخوں کی تفصیل اپنے اشعار میں بیان کی ہے:

سن تھا بارا سے ساٹھواں ہجری   اور دوسری تھی ماہ شعبان کی
نکلا از بہرِ حجِ بیت اللہ   تھا بڑا قافلہ بھی یک ہم راہ

کیا چندے وہاں اقامت وہ   پس کیا سوئے ہند رجعت وہ
سن تھا بارہ سے ساٹھ پر دوم   ماہ ذی الحجہ کی تھی یقین نہم
۱۲۶۲ھ   ۹/ ذی الحجہ
ہوا بالخیر واردِ ویلور   ہوا ویلور اس سے مطلع نور (۱۴)

ضمیمہ۔ جواہر السلوک میں لکھا ہے کہ "و بدویم شعبان ۱۲۶۰ھ بحجاز رفت و از حج و زیارت مشرف گشت و بنہم ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ بوطنِ خود مراجعت فرمود" (۱۵)

مذکورۃ الصدر شواہد کی روشنی میں مؤلف انوارِ اقطاب ویلور (۱۶) اور مؤلف قطب ویلورؒ کا یہ دعویٰ کہ "۱۲۶۵ھ میں حضرت قطب ویلور حجاز مقدس تشریف لے گئے اور وہاں تین سال مقیم رہے" (۱۷)۔ ناقابل قبول ہے۔

حضرت قطب ویلور نے دوسرا حج ۱۲۸۸ھ میں فرمایا۔ مناسکِ حج سے فارغ ہوکر مدینتہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوچ کیا۔ ۶/ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ کو روضتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور پانچ دن بعد مورخہ ۱۱/ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ بروز پنجشنبہ بوقت عصر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ جنت البقیع میں حضرت امام حسنؓ کے پائین تدفین عمل میں آئی۔

حضرت قطب ویلور کا پہلا نکاح آپ کے پھوپھا سید غوث صاحب قادری ویلوری کی دخترِ نیک اختر سیدہ عائشہ بی بی صاحبہ سے ہوا جن کے بطن سے ایک صاحب زادی امتہ الصمد تولد ہوئی۔ حضرت قطب ویلور نے پہلے سفرِ حج سے واپسی کے بعد جب کہ آپ کی اہلیہ محترمہ کا وصال ہوچکا تھا، دوسرا نکاح محترمہ عفت النساء

بی بی صاحبہ سے ۱۲۶۷ھ میں کیا، جن سے سید شاہ رکن الدین محمد قادری ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آگے چل کر شاہ رکن الدین حضرت قطب ویلور کے صحیح جانشین اور خلف صالح ثابت ہوئے۔

حضرت قطب ویلورؒ کی شخصیت مرجع انام تھی۔ آپ کے مسترشدین میں عوام کے علاوہ خواص علماء، وفضلاء اور ادبا و شعرا کی متعدبہ تعداد تھی۔ جیسے مولانا قلندر حسین اطہر بنگلوری (متوفی ۱۲۹۲ھ) مولانا شاہ عبدالحی واعظ احقر بنگلوری (متوفی ۱۳۰۱ھ) مولانا شاہ عبدالقادر علی صوفی بنگلور (متوفی ۱۳۱۴ھ) مولانا سید شاہ شہاب الدین شہاب میسوری (متوفی ۱۳۲۳ھ)، مولانا سید شاہ عبدالغفار بخاری مسکین مدراسی (متوفی ۱۳۲۶ھ) بانیِ باقیات صالحات مولانا شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری (متوفی ۱۳۳۷ھ) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت قطب ویلور جب مدینتہ الرسولؐ میں حضور اکرم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت **یا ولدی لا تحزنْ انت منْ ارضنا** (اے میرے فرزند! گھبراؤ نہیں، تم ہماری سرزمین سے ہو) کے مطابق واصل بہ حق ہوئے تو آپ کے جاں نثاروں میں سے مختلف شعراء نے جن میں حضرت سلیم دہلوی۔ حضرت اطہر بنگلوری اور حضرت ولی وانمباڑی ۔۔ مرثیے لکھے، ان میں سے بعض آج بھی رسالوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ جن سے حضرت قطب ویلور کی نورانی شخصیت کا عکس سامنے آتا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر دو شعرا کے چند بند پیش کیے جارہے ہیں۔

حضرت شہاب الدین سلیم ویلوری (متوفی ۱۳۳۴ھ) جو اپنے وقت کے ماہر خوشنویس اور باکمال شاعر تھے، اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہیں:

وہ کون؟ عارفِ آگاہ دل و حید زماں — شہہ سریرِ ہدیٰ صوفیِ جرید زماں
خدیو مصرِ غنا، فاضلِ سعید زماں — جنید وقت کا اپنے، وہ بایزیدِ زماں
گلِ ریاض ولایت، وہ مخزنِ اسرار
مہہ سمانِ کرامت، وہ مطلع انوار
نمونہ تھا وہ خصالِ جنابِ سرورؐ کا — وہی خلیفہء صادق تھا، ابن حیدر کا

خلاصہ ، عزو کمالاتِ آلِ اطہر کا جہاں میں نور تھا اس سے وہ شمع تھا گھر کا
وہ جن کے آل سے تھا ، زندہ ان کا نام کیا
شہید ہو کے مدینہ میں اپنا کام کیا (۱۸)

حضرت مولانا حاجی شاہ ولی اللہ قادری ولی وانم باڑی ابن حاجی شاہ محمد صاحب قادریؒ نے قطبِ زماں کا ان الفاظ میں ماتم کیا ہے: (۱۹)

کیا سبب ہے کہ زرد ہے خورشید اور کیوں ہے سیاہ دل ناہید
صبح داماں دریدہ صبح سفید جگر لالہ داغ و لرزاں بید
یہ شفق تو نہیں فلک پہ مگر
آگ دریا میں لگ. گئی کیوں کر

یک زمانہ ہے منقلب یا رب ہوش پراں ہیں کیا ہے اس کا سبب
چرخ کھاتا ہے چرخ روز و شب تہہ و بالا ہیں اہلِ عالم سب
بحر مواج فیض ربانی نخلبندِ ریاضِ رحمانی
مرجعِ طالبانِ سبحانی رشک افزاءِ آدمِ ثانی
بے عدد ہیں مریدِ قطب زماں
منحصر سات لاکھ ہیں ہی کہاں

ہیں مرید اوس کے ہر کہیں مسرور سنیہ ہر ایک کا رشد سے معمور
مطلع شمسِ فیض ہے ویلور جس کے پر تو سے ہے جہاں پر نور
فیض ہے ایک دائرہ بضرور
قطب اوس دائرے کا ہے ویلور

اس طرح بہت سارے معروف و غیر معروف (۲۰) شعرا نے آپ کی خدمات کو سراہا اور آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بہ ہر حال آپ کی پہلو دار شخصیت سے خلقِ خدا کو بے حد فائدہ پہنچا۔ آپ کی ذاتِ گرامی گمرہوں کے لیے مینارۂ نور تھی۔ آپ نے نہ صرف اپنے عہد کے مخاطبین و شائقین کے لیے علم و عرفان کی محفلیں سجائیں بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ حکمت و معرفت کے

خزانے محفوظ کر دے۔ مختلف مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کے لیے آپ کس طرح وقت نکالتے تھے؟ اس سوال کا جواب آپ کے خلیفہ، خاص حضرت شاہ مسکین مدراسی اس طرح دیتے ہیں کہ نصف شب پیدا ہوجانے کے بعد ذکر الٰہیٰ اور مدرسہ کی ذمہ داریوں کو ادا فرماتے اور دوپہر کے کھانے کے بعد تالیف و تصنیف اور مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ اگر فتاویٰ ہوتے تو ان کے جواب تحریر فرمادیتے اور ظہر کے بعد مریدوں اور مسترشدوں کی تعلیم و تفہیم میں مصروف رہا کرتے اور بعد عصر تا مغرب وظائف میں مشغول رہتے اور مغرب اور عشا میں نماز کے سوائے کوئی اور کام نہ کرتے، بعد عشا تناول ما حضر" (۲۱)۔

حضرت قطب ویلورؒ نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا تھا۔ چناں چہ آپ کی عربی تصانیف میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۴۸ھ) کی بے نظیر تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" (فارسی) کا عربی زبان میں ترجمہ ہے جو کہ رد شیعیت میں تحریر کی گئی تھی۔ آپ نے یہ ترجمہ اپنے قیام مکہ مکرمہ (۱۲۶۰ھ تا ۱۲۶۲) کے دوران سلطان روم کے لیے شریف مکہ کی فرمائش پر کیا تھا۔ آپ کی عربیت سے سلطان بہت متاثر ہوا تھا۔ فی الحال یہ کتاب نایاب ہے (۲۲)۔

(۲) صراط المؤمنین: یہ کتاب بھی مکہ، مکرمہ کے قیام کے دنوں میں تصنیف کی گئی تھی۔ اس کتاب کا ذکر حضرت احقر بنگلوری نے اس طرح کیا ہے:

پہلے مکہ میں وہ صراط لکھا   اس میں مجمل بیاں ہے ایماں کا
اس بیاں کو دلیل عقلی سے   ہے مدلل کیا ہے دیکھ اسے (۲۳)

(۳) رسالہ الف مقام: یہ رسالہ ۱۲۶۱ھ میں بہ مقام طائف (حجاز) تصنیف کیا گیا تھا۔ اس رسالہ میں ایسے ایک ہزار مقامات کی نشان دہی کی گئی جس کا طے کرنا سالک کے لیے ضروری ہے۔ مصنف "مطلع النور" اس تعلق سے فرماتے ہیں:

اور طائف میں وہ کیا ارقام   اک رسالہ بذکر الف مقام
کیا تفصیل اس کی با لیجاز   عربی میں ہے وہ نکو انداز (۲۴)

آپ کی فارسی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) جواہر الحقائق: یہ کتاب فل اسکیپ کے ۱۸۱ صفحات پر محیط ہے۔ ہر صفحہ پر ۲۱ سطر ہیں۔ سال تصنیف ۱۲۷۳ھ ہے۔ یہ کتاب ۱۲۷۴ھ میں مطلع مظہر العجائب مدراس سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا موضوع تصوف و معرفت ہے۔ آپ کی معرکہ آراء کتابوں میں سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں روح اور اس کے اقسام، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود کی حقیقت عقل کل، نفس کل یعنی لوح محفوظ، فلک اور اس کی قسمیں، کرہ اور اس کی اقسام، موجودات کے انواع، انسان وغیرہ کے تعلق سے عقل و نقل کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ محققین علم تصوف کے لیے بہت ہی کارآمد کتاب ہے۔

(۲) فصل الخطاب فی الفرق بین الخطا والصواب: یہ کتاب بھی فل اسکیپ کے ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر تیئس ۲۳ سطریں ہیں سال تصنیف ۱۲۷۷ھ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۴ء میں مطبع قادری ویلور طبع ہوئی ہے۔ اس میں چالیس مختلف فیہ عنوانات کے تحت صوفیا و فقہا کی مستند کتابوں سے دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ ہر عنوان پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ طرفین کے دلائل عمدگی اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مولانا شہاب میسوری مولانا علام ویلوری اور مولانا معمور کے تاریخی قطعات درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب دراصل وقت کی اہم ترین ضرورت کے تحت تحریر کی گئی تھی۔ بارہویں صدی کے اختتام اور تیرھویں صدی کے اوئل میں مدراس، ویلور وغیرہ علمی مراکز میں شیعہ، سنی اختلافات سر اٹھا چکے تھے بلکہ شباب پر تھے۔ حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ (متوفی ۱۱۹۷ھ) حضرت باقر آگاہ (متوفی ۱۲۲۰ھ) حضرت شاہ کمال (متوفی ۱۲۲۴ھ) اکابر اہل سنت کے مباحث شیعیت کے خلاف جا بہ جا ہو رہے تھے۔ کتابیں تصنیف کی جارہی تھیں، نواب عظیم الدولہ ابن امیر الامرا کی تخت نشینی (۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء) تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعد ازاں سرد پڑ گیا۔ ابھی مسلمان اطمینان کا سانس لے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک

اور زبردست فتنہ شمالی ہندوستان سے اہلِ جنوب پر نازل ہوا۔ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید ابنِ شاہ عبدالغنی ابنِ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۲۴۶ - ۱۱۹۳ھ) کی اختلافی ونزاعی کتاب (۲۵) "تقویۃ الایمان" مدراس پہنچی، جس کے مندرجات کے تعلق سے مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے۔ حضرات اہلِ علم کے دوران توسل، استمداد، تعیین اوقات برائے صدقات نذر و نیاز، میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم، زیارت قبور، تعظیم تبرکات انبیا و اولیا، و علم غیب، دوگانہ قادریہ، تکفیر اہلِ قبلہ، ندالغیراللہ، وحدۃ الوجود وغیرہ فروعی مسائل میں سخت ترین اختلاف رونما ہوگیا۔ علماء اور فضلا کی تقریروں اور تحریروں میں انتہائی افراط و تفریط کے جذبات جگہ پاگئے۔ اس سنگین صورت حال کے پیشِ نظر مسلمانوں کے متنازع جتھوں کے درمیان موجود منافرت کی خلیج پاٹنا وقت کا اہم ترین تقاضا تھا۔ اسی داعیہ کے زیرِ اثر حضرت قطب ویلور قدس سرہ نے "فصل الخطاب فی الفرق بین الخطاء والصواب" جیسی لاجواب کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں درحقیقت اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ دکھائی گئی ہے، جوں ہی یہ کتاب منظر عام پر آئی، ہاتھوں ہاتھ لی گئی، اس کا خاطر خواہ اثر بھی مرتب ہوا، علاقہ مدراس اور کرناٹک میں مسلمان کے درمیان آپس کی رسہ کشی اور سر پھٹول بہت حد تک کم ہوگیا۔ مسلمان پھر سے مل جل کر رہنے لگے تھے۔ اب ایک زمانہ دراز کے بعد تاریخ خود کو دہرا رہی ہے پھر اختلافی فروعی مسائل میں الجھ کر مسلمان آپس میں دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ ایسے میں حضرت قطب ویلورؒ کی مذکورہ کتاب "فصل الخطاب" کو از سر نو اردو کے صاف ستھرے ترجمہ کے ساتھ شائع کرنا از حد ضروری ہے۔ خدا کرے کہ راقم کی یہ آواز رنگ لائے اور تمنا بر آئے۔ آمین،

(۳) غایۃ التحقیق: یہ رسالہ تصوف کے بعض مسائل بالخصوص مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق کیے گئے سوالات کا مفصل و مدلل جواب ہے۔ مولوی عبدالقادر صاحب "پیریا کیم" (نزد آمور، شمالی آرکاٹ) نے آپ کی خدمت میں سوالات روانہ کیے تھے۔ جوابات ۵/ رجب المرجب ۱۲۷۹ھ کو مولوی ٹیپو حسین صاحب پرنامبٹ کے

بدست ارسال کیے گئے۔ یہ رسالہ ۱۲۸۰ھ میں مطبع مظہر العجائب ، مدراس سے شائع ہوا۔

(۴) جواہرالسلوک: آپ کی یہ تصنیف بھی جواہر الحقائق کی مانند تصوف و حقائق کے موضوع پر ہے۔ یہ کتاب بھی فل اسکیپ کے ۲۴۳ صفحات پر محیط ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۲۸۱ھ ہے۔ آپ نے اس کتاب کی تصنیف پر کئی سال صرف کیے تھے۔ " فصل الخطاب " میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں۔ یہ علم تصوف پر آپ کی اہم ترین تصنیف ہے۔ اس میں چالیس فوائد مذکور ہیں۔ بعض عناوین اس طرح ہیں۔ " در مراتب طبقات مردم ، در انواع سفر ، در ترقیات سالک ، در بیان انسان ، قرب نوافل و قرب فرائض ، تجلیات حق ، در بیان جہت ، معیت و جہت ، در بیان تبتل ، در مراقبہ وغیرہ۔ یہ کتاب نواب امیر الدولہ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ جواہر السلوک کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری حضرت قطب ویلورؒ نے اپنے خلیفہ خاص بانی مدرسہ باقیات صالحات حضرت مولانا شاہ عبد الوہاب ویلوری ابن مولانا حافظ شاہ عبد القادر آتوری کے سپرد کی تھی۔ حضرت بانی باقیات نے جناب بابا میاں تاجر کو ترغیب دلا کر اس نادر روزگار کتاب کو زیور طباعت سے آراستہ کروایا تھا۔ اس کتاب کے دس فوائد کا اردو ترجمہ علامہ شاکر نائطی مرحوم اور مولانا مصطفیٰ حسین بخاری مدظلہ نے کیا جو کتابی شکل میں مولانا الحاج محمد حسین باقوی کے بسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۸ء م ۱۳۹۸ھ میں دار التصنیف و اشاعت دار العلوم لطیفیہ ویلور سے شائع ہوا۔

(۵) مکتوبات لطیفی: یہ حضرت قطب ویلور کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جس میں اکثر فارسی اور بعض اردو خطوط شامل ہیں۔ یہ مکتوبات آپ نے اپنے معتقدین و سائلین کے خطوط و سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے ہیں۔ ان خطوط کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے کا شرف حضرت قطب ویلور کے ہم شیر زادے اور داماد حضرت مولانا سید شاہ محمد قادری کو حاصل ہے جنھوں نے حضرت قطب ویلور کے حین حیات یہ کارنامہ انجام دیا اور " مکتوبات لطیفی " نام رکھا۔

حضرت قطب ویلور کی اردو تصانیف جملہ سات ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

(۱) خلاصۃ العلوم: حضرت قطب ویلور قدس سرہ نے اس مختصر رسالے میں علوم باطنی کا نچوڑ عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ رسالہ خود شناسی، خدا شناسی، دنیا شناسی اور آخرت شناسی پر مشتمل ہے۔ مثنوی مولانا رومی کے اشعار جا بجا بحث کی تائید میں پیش کیے گئے ہیں۔ چوں کہ عوام کے لیے لکھا گیا ہے اس لیے عوامی زبان (دکنی) کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ رسالہ سب سے پہلے ۱۲۷۳ھ میں مطبع محمدی، کلکتہ سے شائع ہوا (۲۶)۔ پھر ۱۳۰۸ھ میں مطبع احمد قلندر بنگلور سے چھپا، چوں کہ یہ رسالہ نایاب ہو رہا تھا اس لیے دار العلوم لطیفیہ، ویلور نے اپنے سال نامہ اللطیف ۱۳۹۲ھ میں افادۂ عام کی خاطر مکمل رسالہ کو حواشی کے ساتھ شائع فرمایا، بعد ازاں اس رسالہ "خلاصۃ العلوم" کا تعارف و تبصرہ عصری لب و لہجہ میں مولانا عبد المجید ویلوری فاضل باقیات نے سال نامہ "صفیر" (۲۷) ویلور ۱۳۹۹ھ میں پیش کیا۔ یہاں اس "رسالہ خلاصۃ العلوم" کا کہ جس کو "اصل العلوم" بھی کہا جاتا ہے اقتباس بہ طور نمونہ پیش کیا جارہا ہے:

"اما بعد جان اے بھائی، اصول سعادت کے یعنی جڑاں نیک بختی کے چار چیز ہیں۔ ایک خود شناسی ہے یعنی اپنے کو پہچاننا۔ یہ دو چیز ہے، ایک اپنا ظاہر ہے، اس کو تن اور عالم جسم اور عالم شہادت بولتے ہیں۔ اس اپنے ظاہر میں پھر دو قسم ہے۔ قسم اول۔ جب تک جان "تن" کے ظاہر میں تصرف کرتا ہے اس کو "بیداری" کہتے ہیں۔ قسم دوم۔ جب تک "تن" کے باطن میں عمل کرتا ہے، اس کو "خواب" بولتے ہیں۔ دوسرا باطن ہے، اس کو جان اور دل اور نفس بولتے ہیں اور عالم ملکوت بھی بولتے ہیں۔ اول یعنی اپنا ظاہر آنکھ سو (بہ معنی سے) دستا (بہ معنی نظر آنا) ہے۔ دوسرا یعنی اپنا باطن آنکھ سو نہیں دستا بلکہ بصیرت سو یعنی دل کو پہچانت کی معلوم ہوتا ہے۔ اسی خود

حضرت قطب ویلور کی اردو تصانیف جملہ سات ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

(۱) خلاصۃ العلوم: حضرت قطب ویلور قدس سرہ نے اس مختصر رسالے میں علوم باطنی کا نچوڑ عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ رسالہ خود شناسی، خدا شناسی، دنیا شناسی اور آخرت شناسی پر مشتمل ہے۔ مثنوی مولانا روی کے اشعار جا بجا بحث کی تائید میں پیش کیے گئے ہیں۔ چوں کہ عوام کے لیے لکھا گیا ہے اس لیے عوامی زبان (دکنی) کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ رسالہ سب سے پہلے ۱۲۷۳ھ میں مطبع محمدی، کلکتہ سے شائع ہوا (۲۶)۔ پھر ۱۳۰۸ھ میں مطبع احمد قلندر بنگلور سے چھپا، چوں کہ یہ رسالہ نایاب ہو رہا تھا اس لیے دار العلوم لطیفیہ، ویلور نے اپنے سال نامہ اللطیف ۱۳۹۲ھ میں افادۂ عام کی خاطر مکمل رسالہ کو حواشی کے ساتھ شائع فرمایا، بعد ازاں اس رسالہ "خلاصۃ العلوم" کا تعارف و تبصرہ عصری لب و لہجہ میں مولانا عبد المجید ویلوری فاضل باقیات نے سال نامہ "صفیر" (۲۷) ویلور ۱۳۹۹ھ میں پیش کیا۔ یہاں اس "رسالہ، خلاصۃ العلوم" کا کہ جس کو "اصل العلوم" بھی کہا جاتا ہے اقتباس بہ طور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے:

> "امابعد جان اے بھائی، اصول سعادت کے یعنی جڑاں نیک بختی کے چار چیز ہیں۔ ایک خود شناسی ہے یعنی اپنے کو پہچاننا۔ یہ دو چیز ہے، ایک اپنا ظاہر ہے، اس کو تن اور عالم جسم اور عالم شہادت بولتے ہیں۔ اس اپنے ظاہر میں پھر دو قسم ہے۔ قسم اول۔ جب تک جان "تن" کے ظاہر میں تصرف کرتا ہے اس کو "بیداری" کہتے ہیں۔ قسم دوم۔ جب تک "تن" کے باطن میں عمل کرتا ہے، اس کو "خواب" بولتے ہیں۔ دوسرا باطن ہے، اس کو جان اور دل اور نفس بولتے ہیں اور عالم ملکوت بھی بولتے ہیں۔ اول یعنی اپنا ظاہر آنکھ سو (بہ معنی سے) دستا (بہ معنی نظر آنا) ہے۔ دوسرا یعنی اپنا باطن آنکھ سو نہیں دستا بلکہ بصیرت سو یعنی دل کو پہچانت کی معلوم ہوتا ہے۔ اسی خود

شناسی میں خدا شناسی ملتی ہے۔ جب کوئی بہ موجب فرمانِ انبیاء کے سلوک کرے، جدی و شیخی رکن الملتہ والدین سید شاہ ابوالحسن قادری قربی قدس سرہ فرمائے ہیں:

جنے جی کو سمجھا سو سمجھا اوسے ولے جی سمجھنے کو آتا کسے

اسی لیے خود شناسی کو کلید خدا شناسی کی کہی ہے اور اسی واسطے خود شناسی کو خدا شناس پر مقدم رکھے ہیں۔ والا واقع میں خدا شناسی خود شناسی پر مقدم ہے" (۲۸)۔

(۲) احیاء السنتہ: سولہ صفحات کا یہ رسالہ سنت کی اشعت اور بدعت کی امانت کے موضوع پر قلمبند کیا گیا ہے۔ اس میں قرآن و حدیث اور اقوالِ صوفیا کی روشنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنے کی اشد ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۷/جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ کو نجط نور رقم "مطبع اسلامیہ" میں طبع ہوا۔ چوں کہ یہ رسالہ بھی عوام کی تفہیم کے لیے لکھا گیا۔ اس لیے اس کا لب و لہجہ بھی کسی قدر دکنی ہے۔ مثال کے طور پر درجِ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"پیغمبر علیہ السلام جو کام فرمائے یا کیے یا کرنے پر کسیکے راضی رہے اس کو حدیث اور سنت اور پیغمبر کی چال کہتے ہیں۔ خواہ وہ سنت واجب ہووے یا مستحب یا مباح۔ سنتِ واجبہ جیسے نماز، وتراور عیدین کی۔ سنتِ مستحبہ جیسی اذان اور قامت ختان اور جماعت، اس کو سنن ہدیٰ بھی کہتے ہیں۔ چھوڑنا ان کا اسات اور کراہت ہے۔ سنتِ مباح جیسی کھانے پینے میں اقتداء حضرت کا کرنا مثلاً گندم، جو کھجور، کدو وغیرہ۔ حضرتؐ کھائے ہیں کرکے کھانا، پھرنے اوڑنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں سیرت پر سرورؐ کے چلنا، ان کو سنن زوائد بھی کہتے ہیں، پیروی اس سنت کی، اگرچہ ثواب ہے پر چھوڑنا اس کا اساءت اور کراہت نہیں" (ص ۲۹)۔

(۳) احیا التوحید: اس رسالہ کا موضوع نام سے ہی ظاہر ہے، یہ رسالہ نایاب ہے اس کا خلاصہ "نور روح قدسی" کے نام سے حضرت قطب ویلوری کے ایک خلیفہ مولانا میر محی الدین ابن سید شاہ امین اللہ قادری ابن حضرت سید شاہ عبد القادر دہلوی نے کیا تھا، جس کے کل صفحات ۵۴ ہیں اور یہ خلاصہ ۱۲۶۹ھ میں مطبع فردوس بنگلور سے طبع ہوا۔ مولانا میر محی الدین کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں "نور صلوٰۃ المؤمنین" اور گلزار "اسرار" ہے۔(۳۰)

(۴) شفاعت بالاذن: یہ رسالہ دراصل ایک استفسار کا جواب ہے۔ "مرواگل" کے قاضی سید مخدوم صاحب نے حضرت قطب ویلورؒ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ کے تعلق سے سوال کیا تھا، شفاعت اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگی یا نہیں؟ آپ نے قرآن و حدیث کے دلائل اور اکابر اہل السنۃ والجماعۃ کی ارشادات سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت باجازت کو ثابت کیا ہے۔ یہ فتویٰ ۱۲۷۳ھ میں مطبع مولوی فیض اللہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ مفید رسالہ نایاب ہو چکا تھا، اس لیے سال نامہ اللطیف ۱۴۰۰ھ میں آیات شریفہ، احادیث مبارکہ اور فارسی عبارتوں کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کر دیا گیا۔ اس رسالہ کی عبارت کا نمونہ پیش ہے:

> اور گلزار ہدایت میں عمدۃ العلما بدر الدولہ قاضی الملک بہادر لکھے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اللہ صاحب سے حکم لینا اور شفاعت کروانا اتنے احادیث سے ثابت ہے کہ جس کے انکار کا مجال نہیں۔ انتہیٰ اور اس کتاب کی صحت پر مولوی ارتضا علی خاں بہادر اور مولوی اسلمی صاحب اور دوسرے علمائے مدراس سب کے مہر اور دستخط ہیں اور سید شاہ کمال الدین صاحب قدس سرہ قصیدۂ خصائص نبوی میں لکھے ہیں، بیت:
>
> کریں گے اذن کی مفتاح سے کہ ایسا حمد

ادا شفاعت مطلق کا فتح مغلق در

) اس اسناد سے معلوم ہوا کہ معنے "مختار" کا برگزیدہ ہے اور باتفاق علماء شفاعت بالاذن ہے" (۳۱)۔

(۵) فتویٰ آثار شریف: آپ کا یہ فتویٰ بہ صورت مکتوب ۱۲۶۸ھ میں مطبع حیدری ویلور سے شائع ہوا۔ ممکن ہے یہ اردو کا پہلا مطبوعہ خط ہو۔ اس کے عنوان ہی سے مندرجات ظاہر ہو رہے ہیں۔

(۶) تنبیہ الجاہلین: یہ رسالہ کا موضوع عوام الناس میں گھر کیے ہوئے بدعات و خرافات کی بیخ کنی ہے۔

(۷) رسالہء فطرہ: (۳۲) یہ رسالہ فطرہ کی مقدار اور اس کی تفصیلات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تمام رسائل نایاب ہیں۔ کتب خانہء دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور میں ان کے نسخے محفوظ ہیں۔

حواشی

(۱) ضمیمہ۔ جواہرالسلوک ص ۲۶۶ از حضرت سید شاہ محمد قادری ہمشیرزادۂ حضرت قطب ویلور مطبوعہ ۱۲۸۳ مطبع مظہرالعجائب مدراس۔

(۲) مثنوی مطلع النور ص ۱۸ از حضرت مولانا شاہ عبدالحی احقر بنگلوری مطبوعہ ۱۲۹۰ مطبع محمدیہ۔ معسکر بنگلور

(۳) مثنوی مطلع النور ص ۱۸

(۴) ضمیمہ۔ جواہرالسلوک ص ۲۶۶

(۵) "حضرات صوفیا کرام میں حضرت قطب ویلور کا علمی مرتبہ" از محمد یوسف کوکن صاحب ص ۱۳۵ مطبوعہ اللطیف ۱۳۸۹ھ دار العلوم لطیفیہ، ویلور

(۶) " انوار اقطاب ویلور " ص ۷۷ از مولوی محمد حبیب الدین اشرفی مونگیری مطبوعہ ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء حضرت مکان ویلور

(۷) حیرت ہے کہ مصنف مطلع النور نے بھی یہی واقعہ نقل کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

بہر تحصیل علم بے وسواس شہر ویلور سے گیا مدراس

اس کی سن شریف ای خوش دھب بیس پرسات برس کی تھی تب
شیخ از بہر یمن اے دانا نزدِ آگاہ و نزدِ مولانا
(حضرت بحرالعلوم)

اولاً دو سبق پڑھا ہے یقین بعد ازاں نزدِ آں علاء الدین

شاید مؤلف "انوار اقطاب ویلور" نے "مطلع النور" سے ہی یہ واقعہ لیا ہو، اب تطبیق کی یہ ہی صورت رہ جاتی ہے کہ حضرت ویلور کا حضرات آگاہ و بحرالعلوم سے تبرکاً درس لینے کا واقعہ اس سے پہلے کہ کسی سفر میں پیش آیا ہو جب کہ مذکورہ بزرگ بہ قیدِ حیات رہے ہوں اور آپ کا قیام صرف ایک آدھ دن کا رہا ہو

(۸) اللطیف ۱۴۰۴ھ ص ۸۰ خصوصی نمبر

(۹) "جواہر العرفان" از شاہ محمد ولی اللہ ابن مولانا شاہ محمد قادریؒ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء مطبع مجاریہ، حیدرآباد

(۱۰) اللطیف ۱۳۸۹ھ ص ۱۳۶

(۱۱) اکتسابِ نظر ص ۷۵ از راہی فدائی مطبوعہ ۱۹۹۱ء مطابق ۱۴۱۲ھ ابوالحسان اکاڈمی، کڈپہ

(۱۲) عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۵۰۳

(۱۳) قطب ویلورؒ ص ۴۰ از مولوی حافظ بشیرالحق مطبوعہ ۱۹۸۹ء جمعیتہ الاصلاح ادھونی (آندھراپردیش)

(۱۴) مثنوی مطلع النور ص ۳۲ اور ص ۳۵

(۱۵) ضمیمہ جواہر السلوک ص ۲۶۷

(۱۶) انوار اقطاب ویلور از مولانا طیب الدین اشرفی ص ۹۸

(۱۷) "قطب ویلور" رحمت اللہ علیہ ص ۳۸

(۱۸) مثنوی مطلع النور ص ۵۳۔ حضرت قطب ویلورؒ فنافی الرسول کے درجہ پر فائض تھے اسی لیے جب آپ روضہ اطہر میں داخل ہونے سے دربانوں کے ذریعہ روکے گیے تو بیتابانہ پکار اٹھے "السلام علیکم یا جدی" تو روضہ انور سے جواب ملا "وعلیک السلام تعال یا ولدی" حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک آواز سننے کی سعادت وہاں کے جملہ حاضرین کو نصیب ہوئی (اللطیف بابت ۱۴۰۴ھ ص ۸۴)

(۱۹) "مرثیہ فغان ویلور" از حضرت سلیم ویلوری بہ حوالہ "بحر بیکراں" مؤلفہ ایچ سید احمد اڈوکیٹ مطبوعہ ۱۹۸۲ء بنگلور

(۲۰) شہر آشوب یوم نشور اعلیٰ وفات نامہ قطب زمان ویلور ص ۳ ص ۴ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ مطبع نظام

المطابع (بنگلور)

(۲۱) "نامہ رحلت ویلور" از شاہ ولی وانم باڑی مطبوعہ ۱۲۹۹ھ مطبع صبح محشر لکھنو۔ حضرت شاہ ولی حضرت شاہ عبدالحیٔ ابوالحسنات لکھنوی، مولانا احمد حسن، علامہ سید احمد دحلان مکی اور پایہ حرمین حضرت مولانا رحمتہ اللہ کیرانوی کے تلمیذ و فیض یافتہ ہیں۔ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہ سے بیعت تھے۔ بعد ازاں حضرت شاہ رکن الدین فرزند حضرت قطب ویلور سے اجازت و خلافت کی نعمت میسر آئی۔ (کذافی جواہرالعرفان مطبوعہ ۱۹۲۷ء حیدرآباد)

(۲۲) راقم الحروف کے پاس شاکر تخلص کے ایک غیر معروف شاعر کا دیوان (مخطوطہ) موجود ہے جس میں شاکر نے خود کو حضرت قطب ویلور سید شاہ محی الدین عبداللطیف قادری ویلوری کا شاگرد مرید بتلاتے ہوئے، بارہا آپ کا نام نامی عقیدت سے لیا ہے۔ تین شعر ملاحظہ ہوں:

شاکر ترے جو شیخ کہ "عبداللطیف" ہیں
امداد پر تیرے ہیں وہ آلِ رسولؐ آج
محی الدین کے فیض قلب پاک سے ہو مستفیض
کردیا ہوں خواہش نفس بشر کو پاش پاش
شاکرا تجھ کو ہوا ہے وصل پاک مصطفیٰ
محی الدین کے فیض سے نورِ خدا کی ہے قسم

شاکر مذکور کے حالات کسی بھی تذکرے میں موجود نہیں ہیں۔ اس مخطوطے کا کاتب "مولانا" ہے بس کتابت درج نہیں ہے۔ ایک اور غیر معروف شاعر نے فارسی قطعہ تاریخ اس طرح نظم کیا ہے:

قطب الاقطاب شاہ محی الدین دائرِ وحدتش بود کثرت
شد و صالش بہ حق قرب نبیؐ مدفنش البقیع کا لجنت
گفت مشتاق فانیاً فی الشیخ غاب قطب القدم سن رحلت

۱۲۸۹ھ

(ماخوذ از کتبہ سنگین در کتب خانہ حضرت مکان ویلور)

(۲۳) "حیات المسکین" از حضرت مولانا شاہ ابو محمد عبدالسلام عینی حیدرآبادی بہ حوالہ سال نامہ اللطیف بابت ۱۴۰۰ھ ص ۵۶-۵۷

(۲۴) سال نامہ اللطیف ۱۴۰۴ھ ص ۱۰۰ پہلی بار مولوی حافظ بشیرالحق قریشی نے مذکورہ ترجمہ کا سراغ لگایا ہے مگر کتاب تاحال دستیاب نہیں ہو سکی۔

(۲۵) مثنوی مطلع النور ص ۲۵ مولوی بشیر الحق نے تذکرۂ اقطاب ویلور مطبوعہ اللطیف ۱۴۰۴ھ میں صراط المؤمنین کے بجائے "صراط مستقیم" لکھا ہے۔

(۲۶) مثنوی مطلع النور ص ۲۵ مولوی بشیر الحق نے تذکرۂ اقطاب ویلور مطبوعہ اللطیف ۱۴۰۴ھ میں صراط المؤمنین کے بجائے "صراط مستقیم" لکھا ہے۔

(۲۷) تقویۃ الایمان "پہلے عربی زبان میں تصنیف کی گئی تھی جس کا نام "ردالاشراک" تھا، بعد ازاں اس کو اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اس کا نام "تقویۃ الایمان" رکھا گیا، بہ قول جناب امتیاز علی عرشی "مؤلف نے دو باب ٹھہرائے تھے، پہلے باب میں بیان توحید کا اور برائی شرک کی اور دوسرے باب میں اتباع سنت کا اور برائی بدعت کی بیان کی تھی، لیکن صرف پہلا باب اردو میں منتقل کیا گیا اور "تقویۃ الایمان" کے نام سے مشہور ہوا، دوسرا باب ایک اور عالم مولانا محمد سلطان خاں نے مرتب کیا جو "تذکیر الاخوان" کے نام سے مشہور ہوا۔(جائزۂ مخطوطات اردو جلد اول ص ۱۲۲ از مشفق خواجہ، مرکزی اردو بورڈ لاہور مطبوعہ ۱۹۷۹ء) اس نزاعی تصنیف "تقویۃ الایمان" کے تعلق سے دارالعلوم دیوبند کے مشہور بزرگ شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی رائے یہ ہے کہ مذکورہ کتاب مولانا اسمعیل شہید کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی اہل حدیث مصنف کی کتاب ہے خواہ مخواہ آپ کی طرف منسوب کردی گئی ہے۔(نقش حیات، مکاتب شیخ الاسلام) راقم کی رائے میں حضرت مدنی کا خیال درست معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ مولانا اسمعیل شہید کی ایک اور معرکہ آراء تصنیف "عبقات" کا جس کا موضوع تصوف ہے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ آپ تمام مراسم تصوف کے حامی اور معرفت آگاہ تھے۔

(۲۸) جواہر السلوک از حضرت قطب ویلورؒ ص ۲۴۶ مطبوعہ ۱۲۸۲ھ مطبع مظہر العجائب مدراس

(۲۹) عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۵۰۶

(۳۰) سال نامہ "صفیر" شمارہ ۹ ناشر ادارۂ صفیر انجمن ترقی اردو مدرسہ باقیات صالحات ویلور، مدیر راہی فدائی

(۳۱) خلاصۃ العلوم ص ۹۵ مطبوعہ اللطیف ۱۳۹۲ھ

(۳۲) احیاء السنۃ ص ۳

(۳۳) مذکورہ دونوں رسالہ کتب خانہ جامعۃ العلوم الثنائیہ کڈپہ (آندھرا) میں محفوظ ہیں

(۳۴) اللطیف ۱۴۰۰ھ ص ۱۳۰

(۳۵) ایضاً ۱۴۰۴ھ ص ۱۰۴

حضرت لامع کڈپوی ثم ویلوری

آپ کا اسمِ گرامی سید علی شاہ تھا تخلص "لامع" فرماتے تھے۔ آپ جنوب کے مشہور و معروف صوفی شاعر حضرت شاہ کمال (ثانی) معروف بہ جامیِ دکن (متوفی ۱۲۲۴ھ) کے دوسرے صاحب زادے تھے شاہ کمال خانوادۂ ساداتِ بخارا کے مقبول بزرگ حضرت سید جلال بخاری معروف بہ "مخدوم جہانیان جہاگشت" رحمتہ اللہ علیہ (متوفی ۷۸۵ھ) کے چشم و چراغ ہیں۔ حضرت لامع کا سلسلۂ نسب چودہ واسطوں سے مخدوم جہانیانِ جہاں گشت سے ملتا ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد حضرت شاہ کمال کی زیرِ سرپرستی ہوئی۔ بچپن ہی سے آپ کو حصولِ علم کا بے حد شوق تھا۔ یہ ہی وجہ ہے تھی کہ آپ مزید تحصیلِ علم کے لیے ویلور تشریف لے گئے جہاں حضرات اقطابِ ویلور کی مشہور خانقاہ "حضرت مکان" کے سجادہ نشین حضرت مولانا سید شاہ ابوالحسن محوی قادری قدس سرہ، (۱۲۴۳ھ - ۱۱۸۶ھ) کی نگرانی و اہتمام میں اعلیٰ تعلیم اور صالح تربیت کے لیے دار العلوم لطیفیہ جاری تھا۔

حضرت لامع علم کی سیرابی اور ذوق کی آسودگی کے لیے اس عظیم درس گاہ میں داخل ہوگئے (۶۵)۔ یہ وہی وقت تھا جب کہ حضرت محوی علیہ الرحمہ کے لختِ جگر و نورِ نظر حضرت مولانا سید شاہ محی الدین عبداللطیف المعروف بہ قطبؒ ویلور اور حضرت لامع، تقریباً ہم عمر تھے لہٰذا قرین قیاس ہے کہ دونوں شریکِ درس بھی رہے ہوں۔ بہ ہر حال حضرت لامع بہت ہی ذکی فہیم اور بلا کے ذہین تھے۔ آپ نے بہت مختصر عرصہ میں علوم و فنون میں مہارتِ تامہ حاصل کرلی تھی۔ آپ کی فراست و زکاوت کا ایک واقعہ آپ کے برادر زادے حضرت سید شاہ علی مراد افضل (متوفی ۱۳۱۰ھ) ابنِ حضرت سید شاہ اکمل قادری (متوفی ۱۲۷۷ھ) نے اپنی تالیف حکایت فارسی میں نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ مؤلف "شہمیری اولیا" نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"سید علی صاحب (لامع کڈپوی) ایک روز سبق لے رہے

تھے دوران سبق ایک مشکل بیان آیا۔ استاذ صاحب نے تامل کیا اور فرمایا آج سبق ملتوی کرو کل دے دوں گا۔ دوسرے دن بھی یہ ہی نوبت آئی۔ شاگرد سید علی صاحب نے اپنی ذہانت سے اس بیان کو غور سے پڑھا اور جب مطلب سمجھ میں آگیا تو اس کو حاشیہ پر تحریر کر دیا۔ تیسرے دن حسب معمول آپ سبق کے لیے تشریف لے گئے۔ استاذ صاحب ابھی تامل ہی میں تھے اور کتاب لے کر مطالعہ کر رہے تھے کہ معاً اس حاشیہ پر نظر پڑھی جس کو آپ نے لکھا تھا۔ استاذ صاحب نے پوچھا یہ حاشیہ کس کا ہے؟ آپ نے سر جھکالیا۔ استاذ صاحب نے پھر پوچھا سچ کہو یہ حاشیہ کس کا ہے؟ آپ نے ادب کے ساتھ جواب دیا بندے نے یہ جرأت کی ہے اور ذہن ناقص میں خیالات آئے لکھ دیے ہیں، یہ سن کر استاذ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا دی **اللھم زد فزد**" (٦٦)

الغرض حضرت لامع علم و ادب کے عاشق و شیدائی تھے۔ علم و عرفان سے انتہائی شغف تھا اور مطالعہ کے ذوق و شوق نے آپ کو اپنی صحت کی طرف سے یک سر لاابالی اور بے پروا کر دیا جس کے سبب دور طالب علمی ہی میں دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوگیے۔ چوں علاج و معالجہ سے مستغنی بندۂ راضی بہ رضا تھے۔ نتیجتہ عنفوان شباب میں جاں بہ حق ہوگیے۔ وفات کے وقت بھی کتاب آپ کے سینے پر تھی (٦٧)۔ گویا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مطالعہ کرتے ہوئے ابھی آنکھ لگی ہے۔ روح میر سے معذرت کے ساتھ یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک پڑھتے پڑھتے سو گیا ہے۔ انتقال کے وقت عمر شریف اٹھارہ سال تھی۔ سال وفات ۱۲۲۷ھ اور مدفن اندرون احاطہ۔ حضرت مکان ویلور روبروئے گنبد حضرت قربیؒ واقع ہے۔ الحاصل آپ نے اس کم عمری میں بڑی لاجواب شاعری کی تھی۔ ذوق شاعری ورثہ میں ملا تھا۔ حالاں کہ زندگی کی اٹھار

بہاریں بھی مکمل نہیں دیکھ پائے مگر آپ کے اشعار سے عرفان و آگہی کی شمعیں روشن نظر آتی ہیں۔ زیادہ مشق و مزاولت نہ ہونے کے باوجود طرزِ ادا میں بالغ نظری و پختگی دکھائی دیتی ہے۔ تاحال آپ کے دو مثنویوں اور ایک مخمس کا پتہ چلا ہے۔ مؤلفِ "شہمیر اولیاء" نے صرف ایک کتاب ترجمہ چہلِ حدیث کا ذکر کیا ہے۔ بہ ہر حال تصنیفات کی تفصیل اس طرح ہے:

مثنوی "حکایت دزد و شہریار" (قلمی) صفحات 31 - یہ مثنوی حضرت لامع نے اپنی وفات سے ایک سال قبل شہر ویلور میں کہی تھی:

ابتداء:۔

اے کہ تو پیدا کیا اکواں کے تیں — علم سے لاعین میں اعیاں کے تیں
آپ نے کی شکل سے ظاہر ہوا — نور خور کا مہہ میں جوں باہر ہوا
اے کہ تو بالذات بیچون و چگوں — نیں ہے تجھ کو شکل و شبہ و نموں
تاکہ ہووے اپنے اسما کا کمال! — تو نے فرمایا ظہور اے ذوالجلال
ورنہ نیں جس چیز کو ہستی کی بو — کس طرح موجود ہو خارج میں وہ
ہوسکے لامع سے کیوں تیری ثنا — مہر کی خفاش کیوں دیکھے سنا

اختتام:۔

ے دلِ لامع زبس غافل نہ ہو — بندگی میں حق کی اب کاہل نہ ہو

یہ قلمی نسخہ مخزونہ کتب خانہ آستانہ شہمیریہ ہے۔

ترجمہ "چہلِ حدیث" (منظوم) نمبر ٢٣٦٣ جدید، سائز (٩×٦) سطور ١٠ تا ١٣ خط نستعلیق۔

آغاز:۔

حمد لکھنے میں جب قلم کو لیا — ایسی تقریر دل سیں میں کیا
یو کہ ذاتِ خدا کی ہے تعریف — حضرت مصطفیٰ کی ہے تعریف
نوراللہ کا ہے نورِ نبیؐ — ہے ظہورِ خدا، ظہورِ نبیؐ

اختتام:۔

السلام اے محمدؐ محمود   السلام اے جہاں کے مسجود
السلام اے وکیل اللہ کے   السلام اے خلیل اللہ کے

یہ مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ کی زینت ہے اور کتب خانہ شہمیریہ میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

اس کے سببِ تصنیف سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آپ کی آخری مثنوی ہے۔

چناں چہ ارشاد فرماتے ہیں:

فکر یک شب کیا میں دل کے بیچ   بالیقیں ہے یہ دنیا ہیچ اور پیچ
اس میں بہتر ہے کچھ ثواب کریں   نہ کر چپ زندگی خراب کریں
پس کہاں میں چہلِ حدیث بیاں   ہندی سے گر کرے تو ہے احساں
جب کہ کھویا ہوں باہوا وہوس   عمر دنیا منے اٹھارہ برس میں

مؤلف "شہمیری اولیا" نے آپ کی ایک مخمس نقل کی ہے جو کہ آپ کے حصولِ تعلیم کے لیے کڈپہ سے ویلور دارالسرور روانگی کے وقت کہی گئی تھی۔ جس کے کل گیارہ بند ہیں چند بند ملاحظہ فرمائیں:

سیر گلشن کے تئیں اہل ہوا جاتے ہیں   کوہ صحرا کی طرف آبلہ پا جاتے ہیں
کوچہء یار میں اربابِ وفا جاتے ہیں   یعنی جس راہ میں مردانِ خدا جاتے ہیں
ہم بھی اے قافلہ سالار صبا جاتے ہیں

کوئی شائق مال اور کوئی مشتاق جمال   کوئی رکھتا ہے تمنائے عیال واطفال
ہے کسے خواہش دولت کوئی چاہے اقبال   ہم کو تقدیر کیا عشق کے پابند خیال
ایسی باتوں سی ہم ہاتھ اٹھا جاتے ہیں

جو منازل نہ کیا طے انور نہ ہوا   کون سا آبلہ پا ہے جو خوش اختر نہ ہوا
غیر فرسودہ قدم صاحب افسر نہ ہوا   گھر سے باہر جو نہ نکلا سو ہنر ور نہ ہوا
دربدر اس لیے ہم مثل گدا جاتے ہیں

حضرت شاہ عبدالحئیؒ احقر بنگلوریؒ

علم و فضل کا بحر ذخار، میدانِ نظم و نثر کا شہہ سوار اور ادبیاتِ اردو کا نورانی مینار جس ذات گرامی سے عبارت ہے، اس کا نام نامی و اسم گرامی شاہ عبدالحئی اور تخلص احقر تھا۔ آپ کے عزیز والدین نے آپ کا نام بربنائے سادگی و نیک فالی مرزا بڈھن بیگ رکھا تھا مگر شفیق استاذ و مرشد مربی حضرت قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) نے شاہ عبدالحئی سے بدل دیا، عوام و خواص میں آپ واعظ بنگلوری کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ بہ یک وقت عالم و فاضل۔ صوفی کامل اور لاجواب شاعر اور بے مثال مقرر تھے، جس طرح آپ کے نوک قلم سے لاکھوں رخشندہ اشعار نکلے جس سے علمی دنیا مالامال ہو گئی اسی طرح زبان سے نکلی ہوئی سینکڑوں تقریریں تشنگانِ علم و عرفان کو سیرآب کر گئیں۔ اسی وجہ سے آپ کے تعلق سے یہ دو ٹوک کہہ دینا مشکل ہے کہ آپ بنیادی طور پر شاعر ہیں یا واعظ، آپ کو نظم و نثر اور تحریر و تقریر دونوں میں حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا۔ آپ کے وعظ کی محفلوں میں ہزاروں افراد شریک ہوتے تھے۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم احباب بھی آپ کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض ہونے کے لیے مجلسِ وعظ و تذکیر میں جوق در جوق حاضر ہوتے اور آپ کی جادو بیانی سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے تھے۔ اس وقت کے بعض معتبر اخبارات و رسائل مثلاً "قاسم الاخبار" اور "منشور محمدی" وغیرہ میں آپ کی محفل وعظ کی خبریں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ سچتاں چہ ۱۸/ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ روز پنجشنبہ کے اخبار "منشورِ محمدی" جلد ۴ میں درج ذیل خبر شائع ہوئی:

"بنگلور ۲۶/ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ کو تین آدمی حضرت ملک العلما مولانا عبدالحئی صاحب مدظلہ العالی میر مجلس انجمنِ اسلام معسکر بنگلور کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور جامع مسجد بنگلور میں ایک شخص تاجر بھی مولانا ممدوح کے دستِ مبارک پر

مسلمان ہوا" (۱)

آپ کے ایک معتقد و ہم جلیس مولانا قلندر حسین اطہر بنگلوری آپ کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وعظ قرآں شروع اگر وہ کرے
ملا اعلیٰ میں درود پڑھے

کیا کہوں کیا وہ منہ سے بولے ہے
درِ مکنوں صدف سے رولے ہے

دمِ تقریر القا ہوئے ہیں اسرارِ غیب ایسے
علی الاعلان پا جاتا ہے اس کو درک انساں کا

وہی جانے وہی بوجھے وہی سمجھے سخن میرا
سنا ہے جو کوئی ان کی زباں سے وعظ قرآں کا

اک سماں بنتا ہے اس جا از زمیں تا آسماں
جس مکاں فرمائے ہے وہ صاحبِ اسرار وعظ

صورتِ مذبوح غلطاں ہے ہر اک فرد و بشر
معرکے میں بزم کے کیا بن گئی تلوار وعظ (۲)

آپ نے ایک طرف وعظ و تقریر میں سارے جنوب میں نام پیدا کیا تو دوسری طرف شعر و سخن اور تصنیف و تالیف میں بھی غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ چناں چہ آپ کے فرزند و جانشین مولانا شاہ محمد عبد القادر علی صوفی (متوفی ۱۳۱۴ھ) رقم طراز ہیں:

میرا والدِ ماجد و قبلہ گاہ
جو ہے مولوی عبدِ حی دیں پناہ

کثیر التصانیف ، فیاضِ دیں
رہے واعظ قدوۃ الواعظیں

جسے فیض بخشی کا ہی کام ہے
زبان و قلم سے سر انجام ہے

قلم اس کا ہے توسن اے خوش خرام
دیا ہے براق جناں تیز گام

زمیں پر اگر وہ قدم یک رکھے
تو دوسرا قدم آسماں پر دھرے

ہے تصنیف کا شہرہ در خاص و عام
ہے تو عیظ و تذکیر کا دھوم دھام (۳)

حضرت احقر کے آباء و اجداد سلطنتِ مغلیہ اور سلطنتِ خداداد میں اعلیٰ و ارفع مناصب پر فائز تھے۔ آپ کے خاندانی حالات پر مشتمل ایک کتاب "آئینۂ حیدری و انشائے صفدری" جو آپ کے مورث اعلیٰ مرزا حیدر علی بیگ کے لماء پر لکھی گئی تھی۔ امتدادِ زمانہ کی نذر ہو کر نایاب ہو گئی تھی مگر خدا خوش رکھے حضرت اطہر بنگلوری کو کہ انھوں نے علامہ احقر کی تصنیف "حدیقۃ الاحباب فی احوال الاصحابؓ" کے فارسی دیباچہ میں "آئینۂ حیدری" کا خلاصہ شامل کر کے اپنے استاذ احقرؒ کی تاریخ کسی حد تک محفوظ کر دی۔

دیباچہء "حدیقتہ الاحباب" سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مرزا حیدر علی بیگ (ثانی) زوالِ سلطنت خداداد کے بعد بھی کچھ عرصہ حیات رہے اور انھوں نے سلطان ٹیپو کی شہادت ۱۲۱۳ھ سے قبل اپنی منصب داری کے ایام میں اپنے متبنیٰ مرزا ابراہیم بیگ کی شادی شاہ یوسف کی دختر سے کی تھی۔ اگر شادی کا سال شہادتِ سلطان سے ایک سال قبل ۱۲۱۲ھ متعین کر لیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ ابراہیم بیگ کی شادی سے تقریباً بائیس سال بعد ۱۲۳۵ھ میں لڑکا پیدا ہوا، آرزؤں اور مرادوں کے بعد اولاد ہونے کی وجہ سے شاید والدین نے اس نو مولود کا نام بہ طور نیک فالی مرزا بڈھن بیگ رکھا ("بڈھن" بوڑھے کی تصغیر ہے جیسا کہ جیون اور رحمن ہے) جس کو بعد میں ان کے اساتذہ نے "عبدالحیٌ" کے مناسب ترین نام سے تبدیل کر دیا (لفظ حی بہ معنیٰ زندہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ اس طرح تفاول کے ساتھ ساتھ تیمن و تبرک بھی شامل ہو جاتے ہیں)

شاہ عبدالحیٌ احقر کی تاریخِ ولادت میں کافی افراتفری پائی جاتی ہے۔ بہ قول پروفیسر ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی میسوری "علامہ احقر کی حیات اور ان کے خاندان جس طرح پردۂ خفا میں تھے اس سے کہیں زیادہ چند فاضل مضمون نگاروں نے علامہ احقر کی تاریخ ولادت کو چیستان بنا کر چھوڑا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے محض اٹکل سے کام لیا ہے (۴)۔

پروفیسر میر محمود حسین فرماتے ہیں کہ "آپ (عبدالحیٌ) نے مختلف کتابوں میں جو عمر پائی اس سے آپ کا سنہ ولادت ۱۲۳۳ھ سے ۱۲۳۷ھ کے درمیان قرار پاتا ہے" (۵)۔

ڈاکٹر حبیب النساء بیگم رقم طراز ہیں:

آپ (شاہ عبدالحیٌ احقر) کے ارشاد کے مطابق ۱۲۹۱ھ م ۱۸۷۴ء میں آپ کی عمر اٹھاون سال تھی اس لحاظ سے آپ کا سنِ ولادت ۱۲۳۳ھ م ۱۸۱۶ء ہے" (۶)۔

پروفیسر یوسف کوکن نے اپنی انگریزی تصنیف میں یہ صراحت کی کہ "آپ (احقر) کی ولادت بنگلور میں ماہ جمادی الاول ۱۲۳۴ھ میں ہوئی" (۷)۔

ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی نے اپنے تحقیقی مقالے میں بڑی بحث و تمحیص کے بعد ۱۲۳۴ھ ہی کو قابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ جناب علیم صبانویدی نے بھی ڈاکٹر صاحب کا اتباع کیا ہے (۸)۔ البتہ سید احمد اڈوکیٹ نے حضرت احقر کا سن ولادت ۱۲۳۵ھ لکھا ہے (۹)۔ مگر کسی بھی فاضل تذکرہ نگار نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کوئی نص صریح پیش نہ کر سکا راقم الحروف کے نقطۂ نظر سے حضرت احقر کا سال ولادت ۱۲۳۵ھ درست ہے۔ یہ اس لیے کہ راقم کے پاس حضرت احقر کے فرزند و جانشین مولانا عبدالقادر علی صوفی کا دستخط شدہ تصدیقی بیان مطبوعہ موجود ہے جس میں مولانا صوفی نے صراحت کے ساتھ لکھا کہ:

> کثیر التصانیف والتولیف صاحب تصرفات وحالات شریف، رئیس الواعظین، کثیر المریدین حاجی و زائر حرمین شریفین، المتوفی بین الحرمین ۲۲ / محرم ۱۳۰۱ھ مترجم بخاری جناب حضرت والد ماجد مولانا مولوی شاہ عبدالحیٔ صاحب واعظ رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ جن سے عمر ۶۶ سالگی میں ۱۲۵ کتاب بحسب احتیاج زماں نظماً ونثراً تصنیف پائیں، فیض رسان عالم ہوئیں۔ پس آپ کی ہر کتاب مطبوع یا غیر مطبوع کوئی بلا اجازت ہمارے نہ چھاپیں کہ سرکار میں رجسٹر یافتہ ہیں۔ ہاں! عند الطلب تا وسع اجازت مل سکے گی وبس دستخط (عبدالقادر علی (۱۰)۔

اس مصدقہ بیان سے یہ بات قطعی صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت احقر کی عمر شریف رحلت کے وقت ۶۶ سال تھی، وفات کا سال ۱۳۰۱ھ میں سے ۶۶ وضع کر دیں تو ۱۲۳۵ھ برآمد ہوتا ہے اور یہ ہی سال ولادت ہوگا۔ چون کہ وفات ماہ محرم میں ہوئی تھی اور یہ اسلامی جنتری کا اولین مہینہ ہے۔ شاید اسی لیے بعض اہلِ قلم نے محرم ۱۳۰۱ھ کا اعتبار

کیے بغیر ۱۳۰۰ھ ہی کا حساب لگایا اور اس میں سے ٦٦ کو وضع کرتے ہوئے سنِ ولادت ۱۲۳۴ھ قرار دے دیا۔ حالاں کہ مصنف علیہ الرحمہ نے خود ہی اپنی تصنیف جنان السیر کے چمن دوم میں بہ طور خاتمہ تحریر کیا کہ یہ کتاب ۱۲۶۵ھ میں ختم ہوئی۔ اس وقت میری عمر ۳۰ سال ہوئی ہے۔ حضرت احقر کے ابیات اس طرح ہیں:

شبہ کی ہجرت سے برس بارہ سے   ساٹھ پر پانچ برس تھے گزرے
(سو)
عمر میری ہوئی گرچہ سی سال   نہ ہوے میرے سے کچھ نیک اعمال (۱۱)
(تیس)

۱۲۶۵ھ سے ۳۰ وضع کر دیں تو ۱۲۳۵ھ کا استخراج بآسانی ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جنان السیر ہی کے چمن ہفتم میں مصنف نے پھر ایک بار لکھا کہ اب ان کی عمر ۵۸ سال ہوئی ہے، چناں چہ ارشاد فرمائے ہیں:

آہ، اب تک مجھے اے میرے خدا   حج نہ گھر کا تیرے نصیب ہوا
اس تمنا میں ہے یہ عمر مری   آہ، پنجاہ و ہشت کو پہونچی (۱۲)
۵۸

اور یہ چمن ہفتم چمن دوم کے اختتامی سال ۱۲۶۵ھ کے ٹھیک ۲۸ سال بعد ۱۲۹۳ھ میں اختتام پذیر ہوا۔ ۱۲۹۳ھ میں سے ۵۸ سال وضع کر کے دیکھا جائے تو بھی سال ولادت ۱۲۳۵ھ ہی برآمد ہوتا ہے۔ مزید براں حضرت احقر نے مثنوی مطلع النور میں احوال مصنف کے تحت لکھا کہ شاہ سجادؒ کی خدمت میں جب وہ پہنچے تو ان کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ مکمل تین سال شاہ سجادؒ سے استفادہ کیا، یہ استفادہ شاہ صاحب کی رحلت ۱۲۵۳ھ تک جاری رہا۔

حضرت احقر کے الفاظ اس طرح ہیں:

شاہ سجاد اس کا نام بمام   لوگ پڑھتے تھے اس سے علم مدام
میرا والد نے بس مجھے بھی لیجا   اس کی خدمت سے بہرہ یاب کیا
تاکردں اس سے طالب علمی   پانزدہ سال کی تھی عمر مری
الغرض تین سال تک مسرور   استفادہ کیا میں اس کے حضور

(۱۳) تب رحلت پایا سجاد شاہ جب ترپن اور سے بارہ تھا سن

شاہ سجاد صاحب کے انتقال کے وقت حضرت احقر کی عمر ۱۸ سال کی تھی لہذا ۱۲۵۳ھ میں سے ۱۸ وضع کر دیں تو ۱۲۳۵ھ کے اعداد ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت احقر کی ابجد خانی شہر بنگلور کے معروف بزرگ حضرت سید شاہ محمد قادری ملکی کے زیرِ سرپرستی ہوئی۔ قرآن شریف ناظرہ کی تکمیل قاری سید باقر اور مولوی محمد غوث کی زیرِ نگرانی عمل میں آئی۔ حضرت احقر نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مولانا قاضی محمد جعفر بنگلوری سے حاصل کی۔ اس کم سنی ہی میں آپ غیر معمولی طور پر اصلاحی جذبہ اور ذوقِ تعلیم پیدا ہو [illegible] لہذا آپ اپنے فارغ اوقات کھیل کود میں ضائع کیے بغیر حضرت علامہ باقر آگاہ کی "ہشت بہشت" اور حضرت خواجہ رحمت اللہ معروف بہ نائب رسول اللہ کی "مثنوی [illegible]یہ النساء" وغیرہ کتابیں خواتین میں پڑھ کر سناتے (۱۴) اور دینی فہم و فراست کے مطابق اس کی تشریح کرتے تھے۔ اس طرح بچپن ہی سے آپ کے ذریعہ اردو کی خدمت ہو رہی تھی۔

چوں کہ آپ کے آباء و اجداد فنونِ سپہ گری کے ماہر اور حرب و ضرب میں کامل تھے اس لیے آپ کے والد مرزا ابراہیم بیگ نے آپ کو دینیات و لسانیات کی تعلیم دلوانے کے ساتھ ساتھ پہلوانی، شہسواری، اور تیر اندازی وغیرہ میں بھی طاق بنادیا تھا۔ اس کام کے لیے کرناٹک کے مشہور استاذ غوث خاں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس طرح آپ کی ذات والاصفات بچپن ہی سے اپنے اجداد پدری کی شجاعت و بسالت اور اجداد مادری کی صداقت و للہیت کی مجمع البحرین بن گئی۔ آپ کے والد نے آپ کی مزید تعلیم و تربیت کے لیے شہر بنگلور کے مشہور مدرس صاحب علم و فضل بزرگ حضرت مولانا سید شاہ سجاد شطاری کی یادگار میں ۱۲۵۰ھ میں پہنچادیا، اس وقت آپ کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ آپ نے وہاں شاہ سجاد صاحب کی وفات ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء) تک پورے تین سال استفادہ کرتے رہے چناں چہ احقر کہتے ہیں:

ان دنوں ایک فاضل مشہور تھا بڑا فیض بخش در بنگلور

از کبارِ مشائخ و سادات عالم و عارفِ جلیل الذات

شاہ سجاد اس کا نام ہمام ۔۔۔ لوگ پڑھتے تھے اس سے علم مدام
میرے والد نے بس مجھے بھی لیجا ۔۔۔ اس کی خدمت سے بہرہ یاب کیا
تا کروں اس سے طالب علمی ۔۔۔ پانزدہ سال کی تھی عمر مری
پس اسی روز وہ شفقت سے ۔۔۔ اپنی شاگردی میں لیا ہے مجھے
بسکہ شاگرد پروری اس کی ۔۔۔ کیا کہوں فیض گستری اس کی
الغرض تین سال تک مسرور ۔۔۔ استفادہ کیا مین اس کے حضور
اور سنتا اسی سے میں ہمہ حال ۔۔۔ شیخ ویلور کا بھی فضل و کمال
سن تھا بارہ سے اور ترپن جب ۔۔۔ شاہ سجاد پایا رحلت تب (۱۵)

حضرت احقر کو اپنے مشفق استاذ و محبوب مربی کی جدائی کا بے حد قلق تھا، شاہ سجادؒ کے بعد زندگی میں ایک طرح کی اداسی اور بے کیفی محسوس ہونے لگی۔ تقریباً ۵ سال اسی بے چینی کی نذر ہوگیے۔ تب ایک رات خواب میں اچانک حضرت قطب ویلور قدس سرہ کا دیدار نصیب ہوا، احقر خواب میں قطب ویلور سے استفادہ کرنے لگے۔ یہ ہی کیفیت دوبارہ رونما ہوئی تو آپ نے اس کو لطیفہ، غیبی سمجھ کر ویلور کا رخ کیا۔ ویلور پہنچ کر دیکھا کہ حضرت سید شاہ عبداللطیف محی الدین قادری. معروف بہ قطب ویلور کا آستانہ علوم ظاہری و علوم باطنی کا خزینہ ہے۔ وہاں ہر شخص اپنی وسعت بھر فیض یاب ہورہا ہے۔ دور دراز سے آئے ہوئے تشنگان علوم و فنون یہاں کے خانقاہی مدرسہ میں داخل ہوکر اس چشمہ، فیض سے سیراب ہورہے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت احقر نے بھی اپنی قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا، مدرسہ مین داخل ہوکر جید و قابل اساتذہ سے درس لینے لگے، بعدازاں آپ نے ۱۲۵۸ھ میں حضرت قطب ویلورؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی، بعد تربیت و سلوک آپ کے شیخ نے آپ کو بہ قول اطہر بنگلوری ۱۲۶۰ھ میں خرقہ، خلافت سے سرفراز کیا اور وعظ و تذکیر کی اجازت بھی مرحمت فرمائی (۱۶)۔ حضرت احقر نے ان ہی واقعات کی طرف درج ذیل اشعار میں اشارہ کیا ہے:

دیکھا یک رات بعد ازاں درخواب ۔۔۔ شیخ ویلور کا رفیع جناب

مستفید اس سے درمنام ہوا　　ہم جلس اور ہم کلام ہوا
بعدازاں عن قریب بار دوم　　پہنچا رویا میں اس سے فیض بہ ہم
جب کہ اس خواب سے ہوا بے دار　　نہ رہا کچھ مرے میں صبر و قرار
پس سفر میں کیا سوئے ویلور　　اور پہنچا وہ رہنما کے حضور
سن تھا بارہ سے اور اٹھاون　　پیر کی رات تھی وہ قطب زمن
قادریہ طریق پیچ بہ ہم　　مجھ سے بیعت لیا بلطف اعم
اور توجہ سے بہرہ مند کیا　　اسی محقر کو سر بلند کیا
مدتِ تیس سال مجھ کو خدا　　زیرِ ظلِ ظلیل اس کے رکھا (۱۷)

حضرت احقر اپنے شیخ و مرشد حضرت قطب ویلور کی رحلت (۱۲۸۹ھ) تک پورے تیس سال آپ ہی کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے۔ آپ کو اس دوران کسی کی طرف التفات کرنے کی نہ ضرورت پڑی اور نہ ہی اس کی حاجت محسوس ہوئی، قطب ویلور کے حین حیات جب بھی آپ کو کوئی علمی اشکال پیدا ہوتا تو آپ اپنے شیخ سے بالمشافہ یا بہ ذریعہ خط و کتابت اس کو حل کر لیتے تھے، چناں چہ "مکاتیب لطیفی" حضرت احقر کے نام تحریر کردہ کئی ایک خطوط موجود ہیں۔ یہاں بہ طور نمونہ ایک فارسی خط کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جس سے ایک طرف حضرت قطب ویلور کا طریقۂ اصلاح و تربیت آشکارا ہوتا ہے تو دوسری طرف حضرت احقر کے ہر حیطۂ عمل میں چاہے وہ تقریر و تذکیر کا ہو یا تصنیف و تحریر کا اس حسن تربیت کا عکس جمیل اور اس برمحل نصیحت کی صدائے بازگشت صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت احقر نے ایک مرتبہ اپنے شیخ سے مسئلۂ روح کے تعلق سے اپنے دلی خلجان کا ذکر کرتے ہوئے عرض کیا کہ کتب عقائد میں روح انسانی کو فانی اور حادث کہا گیا ہے۔ حالاں کہ "کیمیائے سعادت" میں امام غزالیؒ نے روح کو باقی اور قدیم قرار دیا ہے۔ ایسے میں تطبیق کی صورت کیا ہے؟ اور یہ بھی دریافت طلب امر ہے کہ بعض متاخرین صوفیہ دو ذات اور ایک وجود کے قائل ہیں، اس کی توجیہ کیا ہے؟ حضرت شیخ نے مرید کی دلی کیفیت اور احوال باطنی کو سمجھ کر راہِ سلوک و ریاضت

میں آنے والے اس طرح کے اشکالات کا براہِ راست علمی جواب دیے بغیر سالک کو ایسی عمدہ اور کار آمد نصیحت فرمائی کہ جو بھی اس نصیحت کو اپنی گرہ میں باندھ لے گا وہ ضرور منزلِ مقصود کو پالے گا اور کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومے گی۔ حضرت قطب ویلور نے استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"سعید و ارجمند! کام کا وقت ہے، جو لمحہ بھی گزر جاتا ہے عمر کا حصہ کم ہوتا ہے اور موت کا زمانہ قریب آتا ہے۔ یہ ہی بے داری و عمل کا وقت ہے۔ اگر آج کمائی نہ ہوئی تو کل سوائے حسرت و افسوس کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، راہِ سلوک کے طے کرنے میں شریعت کے ظاہر و باطن کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ ہی وقت کوشش و محنت کا ہے۔ عیش و راحت کا وقت جو کہ سعی و عمل کا نتیجہ ہے آگے آنے والا ہے۔ عمل اور جد و جہد کے وقت عیش و آرام میں لگ جانا اور موانع راہ میں الجھ جانا ایسا ہی ہے جیسے اپنی کاشت و فصل کو پختہ و رسیدہ ہونے سے پہلے ہی کاٹ ڈالنا، اور پھل اور پیداوار سے محروم ہو جانا اور پھر حیرانی و بے سروسامانی میں زندگی کے دن کاٹنا۔ خدا کرے آپ شاد کام و بامراد رہیں" (۱۸)۔

حضرت احقر قطب ویلور قدس سرہ کے ارشد خلفا میں سے تھے آپ نے اپنی ہر تصنیف کی تمہید میں اپنے شیخ کی تعریف و توصیف کی ہے، چناں چہ جنان السیر کے چمن اول میں رقم طراز ہیں:

خاص میرا شیخ ہے شیخ الشیوخ	قدوۂ اربابِ وثوق و رسوخ
اوج حقائق کا ہے بدر منیر	ملک کے معارف کا امیر و کبیر
ملت اسلام کا رکن رکین	صاحبِ دل حامیِ دیں، محیِ دیں
عالم فاضل ہے شریعت میں وہ	عارف کامل ہے طریقت میں وہ
شیخ محقق خلفِ بوالحسن	نیرِ اوجِ شرفِ بوالحسن
نام شریف اس کا ہے عبداللطیف	محی دیں ہے عرف و لقب اے شریف

پس ہے مرا شیخ مقدم وہی ، رہبرِ اول ہے ، معظم وہی
اس کی وساطت سے ہے مجھ کو خدا "غوث" کے قدام میں داخل کیا (۱۹)

"چہار گلشن" کی ابتدا میں اپنے شیخ کی اس طرح مدح سرائی کی ہے:

شیخ اشیاخ سید سادات ، ذوالکمالات ، منبعِ برکات
مجمعِ سیرتِ حسینؓ و حسنؓ خلفِ بوالحسن، شہیرِ زمن
علم ظاہر میں فارغ التحصیل علم باطن میں صاحب تکمیل
جامع علمِ ظاہر و باطن معدنِ فیض بارزو کامن
علم ظاہر میں فرد اشہر ہے علم باطن میں شیخ اکبر ہے
ہے شریعت میں عالمِ عامل اور طریقت میں واصل موصل
قطب ویلور سے جو ہے مشہور ذات اس کی ہے ایک منبعِ نور (۲۰)

ایک اور تصنیف "تنویر العقول فی اسلام آباد۔ الرسول" میں اپنی عقیدت کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے:

جس کا ہر نائب ہے فرد بے نظیر خاص کر اس عصر میں میرا ہے پیر
عالمِ دیں ، حافظ قرآن ہے صاحبِ عرفان اور وجدان ہے
درعلوم باطنی و ظاہری اس کو اہلِ عصر پر ہے برتری
شیخ عارف سیدالسدات ہے ذات اس کی منبعِ برکات ہے
نام نامی اس کا ہے عبداللطیف محی دیں سے ہے ملقب وہ شریف (۲۱)

حضرت احقر اپنے شیخ کے پردہ فرمانے کے بعد باطنی نسبت کے مزید فروغ کی خاطر حضرت مولانا سید محمد علیؒ واعظ رامپوری خلیفہ۔ سید احمد شہید قدس اللہ اسرارہم سے وابستہ ہوگئے اور واعظ رامپوریؒ سے سلسلہ۔ نقشبندیہ میں خرقہ۔ خلافت بھی حاصل کیا، یہ بات اہلِ علم کے لیے نئی نہیں ہے کہ حضرت سید احمد شہید حضرت شاہ مولانا عبدالعزیز محدثؒ کے خلیفہ تھے اور شاہ عبدالعزیز اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مجاز و فیض یافتہ تھے اور شاہ ولی اللہ اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم دہلوی کے نہ صرف جانشین تھے بلکہ آستانہ۔ رحیمیہ کے سجادہ نشین بھی تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ـ۱۱۷۶) نے اپنے اور اپنے والد کے مسلک کی وضاحت اپنی

تصنیف " انفاس العارفین " میں کردی ہے ۔ " انفاس العارفین " کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اور آپ کے سلسلہ کے تمام بزرگ میلاد شریف ، اعراس ، توسل و استمداد ، فاتحہ خانی و ثواب رسانی اور تصرفات اولیا جیسے مراسم صوفیہ، صافیہ کے صرف قائل تھے بلکہ عامل بھی تھے (۲۲) ۔ مگر ساتھ ہی بدعات و منکرات کے قامع اور خلاف شرح متین و امور مردود دین کے سخت مخالف بھی تھے ۔ اشاعت علوم و اصلاح رسوم میں مسلک اعتدال پر گامزن تھے ۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے حضرت احقر مذکورہ بزرگوں سے متاثر ہوئے بلکہ معتقد بھی ۔ چناں چہ جنان السیر کے چمن دوم میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو محدث و محقق تھا بڑا ۔۔۔ وقت میں اپنے شہیر و یکتا
یوں لکھا ہے بہ فیوض الحرمین ۔۔۔ اپنا مکشوف بے شبہ و مین
کہ میں جب مکہ میں تھا اے اکمل ۔۔۔ درمہہ پاک ربیع الاول
موضع مولدِ اشرف ہے جہاں ۔۔۔ منعقد محفلِ مولد تھی جہاں
ذکر میلادِ رسول اللہ کا ۔۔۔ تب وہ محفل میں پڑھا جاتا تھا
میں بھی اس محفلِ اقدس میں گیا ۔۔۔ حق تعالیٰ نے مجھے بتلایا
کہ وہ مجلس سے عجائب انوار ۔۔۔ لگے ہونے کو بلند اے ہوشیار (۲۳)

حضرت احقر نے حضرت سید احمد شہید کی توصیف میں ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام فیض روحانی از شیخ ربانی ہے ، حضرت شہید کی شان میں کہے گیے اشعار میں سے بعض ملاحظہ ہوں:

وہ فرد العصر قطب الواصلین ۔۔۔ سید احمد امام العارفین
صاحب سیر و سلوک و جذب و حال ۔۔۔ وارث علم لدنی بے قیل و قال
تیرہویں صدی کا مجدد اور امام ۔۔۔ رکن شرع و ملتِ خیرالانام
جس کے ارشاد وہدایت سے خدا ۔۔۔ ایک عالم کو دیا راہدی
وہ دیا اس طرح سنت کارواج ۔۔۔ کہ ہوا تاراج بس بدعت کا راج
فیض سے جس کے جہاں پر نور ہے ۔۔۔ یہ عرب سے ہند تک مشہور ہے (۲۴)

آپ نے اپنی ایک اور تصنیف " ریاض لازہر فی فضائل سید البشر " کے مقدمے میں

اپنے شیخ اول حضرت قطب ویلور کی مدح و توصیف کے بعد اپنے شیخ ثانی حضرت سید محمد علی واعظ رامپوری کی بھی تعریف کی ہے، چناں چہ احقر رقم طراز ہیں:

مطلع انوار محمد علی مجمعِ اسرار محمد علی
سید احمد ہے یقیں جس کا پیر فوج مجاہد کا امام و امیر (۲۵)

الغرض حضرت احقر نے ان واردان جنوب، بزرگان پاک قلوب کا مخلصانہ بھرپور تعاون کیا۔ ان کی تائید میں کتابیں لکھیں، ان کی مخالفت کا دنداں شکن جواب دیا، بعض اہل علم جنھیں تحریک سید احمد شہید کے تعلق سے سخت غلط فہمی تھی حضرت احقر کی افہام و تفہیم کے نتیجے میں راہ اعتدال پر آگئے۔ آپ نے ان بزرگوں کی پشت پناہی میں مخالفین سے مباحثے اور مناظرے بھی کئے جس سے مخالفین کا زور ٹوٹ گیا، چناں چہ آپ نے بہ بانگ دہل اعلان کیا:

"یہ احقر حضرات مولوی حافظ سید شاہ محی الدین صاحب قادری (قطب ویلور) مولانا سید محمد علی رامپوری واعظ (خلیفۂ سید احمد شہید بریلوی) اور مولانا مولوی نواب خاں عالم خاں مدراسی (خلیفۂ سید محمد علی امپوری) کا بہ دل معتقد ہے۔ اگر ان بزرگوں کے ساتھ کسی کو کچھ کلام ہے تو اس احقر کے ساتھ بحث کریں۔ بعون اللہ جواب دینے حاضر ہوں، یہ بزرگان اکابرین اور پیشوایان اہل سنت و جماعت اور آثار سلف صالحین سے ہیں" (۲۶)۔

یہی اے دوستو مذہب مرا کیا بہ ظاہر کیا بہ باطن ہے مرا

بعض ناعاقبت اندیشوں نے آپ پر وہابیت کا الزام عائد کیا۔ اس سلسلے میں حضرت قطب ویلورؒ کی بارگاہ سے رجوع کیا گیا تو حضرت قطب ویلور نے آپ ہی کے حق میں فیصلہ کیا (۲۷)۔ بہ ہرحال حضرت شاہ عبدالحیَ احقر بنگوری اور آپ کے پیر بھائی حضرت شاہ عبدالوہاب قادری (بانی مدرسۂ باقیات صالحات ویلور) وغیرہ خلفائے حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری معروف بہ قطب ویلورؒ نے تحریک حضرت سید احمد شہید کی حتی الوسع تائید کی تھی اور اس کے مبلغوں اور داعیوں کا سخنے قلمے ہر طرح

بھرپور تعاون کیا تھا۔ اگر ان حضرات کی پشت پناہی نہ ہوتی تو ہرگز یہ تحریک جنوب میں کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ مولانا محمد علی رامپوری ہو یا میر احمد علی دہلوی کسی بھی نووارد کو علاقہ، مدراس میں قدم جمانا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہوجاتا۔ اس دعویٰ کے لیے بہ طور دلیل مذکورہ حقائق کے علاوہ اس وقت تمام کے جرائد و رسائل پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں خبروں (News) اور مضامین کی صورت میں مباحثے اور مناظرے شائع ہوچکے ہیں اور مدراس کے کتب خانوں میں آج بھی محفوظ ہیں مگر افسوس صد افسوس کہ ہمارے بعض اہلِ قلم نے ان بزرگوں کے کارناموں کو نظرانداز کر دیا۔ اس دور کے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید شاہ ابوالحسن علی ندوی نے اپنی معرکہ آرا ضخیم تصنیف "تاریخِ دعوت و عزیمت" میں تحریک سید احمد شہید رائے بریلی" کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اس کے سیاق و سباق میں کہیں بھی حضرت شاہ عبدالحیؒ احقر بنگلوری اور ان کے احباب کا ذکر خیر تک نہیں کیا، اسی طرح مولانا علی میاں ندوی کے والدِ بزرگوار مولانا سید عبدالحیؒ حسنی نے بھی اپنی بسوط قابلِ قدر تصنیف "نزھتہ الخواطر" (تذکرۂ علمائے ہند) میں علمائے جنوب کی علمی و اصلاحی خدمات کا کماحقہ ذکر نہیں کیا بلکہ بہت سارے اہل علم و فضل کو نظرانداز ہی کر دیا حالاں کہ موصوف کے علمی روابط اور ذاتی مراسم اہل جنوب کے ساتھ رہے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی نے "نزھتہ الخواطر" کا بڑی عمدگی کے ساتھ تنقیدی تجزیہ اپنی عربی تصنیف میں کیا ہے۔ صاحبِ کتاب کی فروگزاشتوں کے ضمن میں جنوب کے علما و صلحا کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنے پر کڑی تنقید کی ہے (۲۸)۔

حضرت احقر کی شخصیت واقعی جامع الکمالات تھی۔ آپ نے علومِ اسلامیہ کا معتدبہ حصہ اردو میں منتقل کیا۔ آپ سے پیش تر یہ کارنامہ صرف علامہ باقرآگاہ ویلوریؒ نے سرانجام دیا تھا مگر آگاہ کے پاس واقعات کا تفصیلی جائزہ اور علوم و فنون کا اس قدر تنوع نہیں ملتا جس قدر کہ حضرت احقر بنگلوری کے ہاں پایا جاتا ہے۔ علامہ باقرآگاہ کی خدمات کا کھلا اعتراف حضرت احقر نے اپنی کتاب جنان السیر کے مقدمے

میں کیا ہے، چناں چہ فرماتے ہیں:

عالم علامہ وحیدِ زماں — باقر آگاہ فضیلت نشاں
در سیرِ شاہِ بشیر و نذیر — آٹھ رسالے ہے لکھا بے نظیر
ہشت بہشت اس کا سزاوار نام — دیوے جز اس کو خدائے انام
جانئے اندیشۂ تطویل سے — لایا وہ احوال نہ تفصیل سے
اس لیے بعض احبا مرے — جب کہ بہت شوق و تمنا کیے
باقر آگاہ فضیلت مآب — خوب کیا ہے یہ سخن باصواب (۲۹)

حضرت احقر نے سیرت ِطیبہ کو پہلی بار بسوط طور پر واقعات کے جزئیات کے ساتھ اردو زبان میں نظم کیا اور اس کتاب کا نام "جنان السیر فی احوال سید البشر" رکھا۔ یہ مثنوی تقریباً بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے (۳۰)۔ اس کتاب کے دو دفتر (حصے) ہیں اور ہر دفتر چار چمن (باب) سے سجایا گیا ہے، حضرت احقر نے سات چمن خود ہی لکھے مگر آٹھواں چمن (معجزات ِمحمدی) اپنے لائق فائق فرزند عبدالقادر علی صوفی سے لکھوایا (۳۱)۔ "جنان السیر" مختلف اوزان میں لکھی گئی ہے اور یہ اس قدر مشہور ہوئی کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے لوگ نہ صرف اس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں بلکہ بہ قول مرتب "میسور میں اردو" اپنی بیٹیوں کے جہیز میں (قرآن شریف کے ساتھ "سیر شریف" کو بھی دینا) باعث ِعزت سمجھتے ہیں۔ (میسور میں اردو ص ۲۴ از محمد سعید عبدالخالق مطبوعہ ۱۹۴۲ء اردو درس گاہ، معظم بلڈنگ حیدرآباد دکن) ڈاکٹر حبیب النسا بیگم لکھتی ہیں:

> "اس کتاب (جنان السیر) کو بلاشبہ اردو زبان میں مثنوی ِمولانا روم کا نعم البدل کہا جاسکتا ہے۔ شاید ہی ریاست ِمیسور کا کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں قرآن شریف کے بعد اس کتاب کا پڑھنا اور رکھنا باعث خیر و برکت نہ سمجھا جاتا ہو۔ اور حقیقت بھی یہ ہی ہے کہ سیرت طیبہ اس قدر بسوط اور جامع منظوم کتاب اردو میں شاید ہی ہوگی اور نہ آئندہ لکھی جانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

پروفیسر میر محمود حسین لکھتے ہیں:

شاہ صاحب کی سیر شریف اپنی طرز کی واحد بے نظیر اور بے مثال کتاب ہے ، اس کے مضامین اور مطالب کی صحت میں کوئی شک یا اختلاف نہیں ۔۔۔۔اس کتاب کے قبول ِعام کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ سوا سو برس سے بنگلور کے متعدد مطبع ہر سال اسے ہزاروں کی تعداد میں شائع کرتے رہے نہ اس کی مانگ میں کمی آئی نہ طباعت و اشاعت میں سستی ، اس کا بازار برابر گرم رہا۔ اردو کی بہت کم کتابیں ہو سکتی ہیں جن کی کثرت ِاشاعت اور قبول ِعام کا یہ حال رہا ہو۔ کرناٹک اور جنوبی ہند میں یہ کتاب گھر گھر پہنچی۔ مسلمانوں میں قرآن ِمجید کے بعد اس کی تلاوت سب سے زیادہ رائج ہے ۔۔۔۔۔ہمارے یہاں لڑکی کو جہیز میں قرآن شریف کے ساتھ سیر شریف کا ایک نسخہ بھی ضرور دیا جاتا ہے" (۳۲)۔

حضرت احقر کے نور ِنظر مولانا صوفی اس کتاب کی تعریف و توصیف میں یوں رطب اللسان ہیں:

خصوصاً جنان السیر کے تئیں دیا ایسی شہرت خدائے متیں
کہ دکن سے لے تابہ ہندستاں ہے ہر شہر و قریہ میں اس کا نشاں
حرم بیچ مکے مدینے کے بھی پڑھا کرتے ہیں "ہندیاں" اس کو بھی (۳۳)

مولانا صوفی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں یہ کتاب حرمین شریفین میں بھی اردو داں مہاجرین ِہند کے گھروں میں بہ شوق و ذوق پڑھی جاتی تھی ۔ اس سے "جنان ِالسیر" کی شہرت و مقبولیت کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت احقر کا ایک اور کارنامہ جو تاریخی حیثیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ حدیث ِشریف کی مستند و معتبر کتاب "صحیح بخاری" کا اولین اردو ترجمہ فیض الباری آپ ہی کے رشحات ِقلم کا مرہون ِمنت ہے ۔ یہ ترجمہ دس جلدوں پر محیط ہے ۔ علاوہ ازیں آپ ہی نے سب سے پہلے جمعہ کے عربی خطبات کا اردو میں منظوم ترجمہ پیش کیا جو "خطبات شاہ عبدالحیَ" کے نام سے بے حد مقبول ہوئے ، بہ قول میر محمود حسین "یہ

اردو میں خطبوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے نہ جنوبی ہند میں ایسا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر آیا اور نہ شمالی ہند میں" (۳۴)۔ آپ سے پیش تر کسی نے اس طرح کی جرأت و ہمت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مولانا شبلی نعمانی سے بہت پہلے علامہ احقرؔ نے اسلام کی عبقری شخصیتوں کے سوانح حیات قلم بند کیے تھے۔ بہ قول پروفیسر سید قدرت اللہ باقوی:

"مولانا شبلی نعمانی کی ابھی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی، علامہ احقرؔ نے ہیروز آف شریعت اسلام کا ایک سلسلہ جنوبی ہند میں جاری کر کے کتابیں شائع بھی کر دی تھیں۔ چناں چہ سید البشر نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق "جنان السیر" اور "ریاض الازہر"، خلفائے راشدینؓ سے متعلق "حدیقتہ الاحباب" اہلِ بیت سے متعلق "روضتہ الابرار"۔ امام حسنؓ اور حسینؓ سے متعلق "قرۃ العینین" اور "گلشن غم"۔ حامۂ شریعت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے متعلق "تحفۂ مرغوب" خلفائے اسلام سے متعلق "تاریخ الخلفاء ائمۂ فقہ یعنی امام اعظم، امام شافعی، امام مالک اور امام حنبل سے متعلق "تذکرۃ المجتہدین" حدیث شریف کی تدوین میں جن ائمۂ کبار نے حصہ لیا ان سے متعلق "تذکرۃ المحدثین" اور "تذکرۃ الاولیا" کے دو ضخیم جلدیں نظما کر شریعت اسلامی کے ہیروز پر اردو میں ایک گنجینۂ بے بہا کا اضافہ کر دیا اور دکن کو اس سلسلہ میں بھی اولیت کا شرف بخشا" (۳۵)۔

بعض اہلِ قلم نے ملک العلما حضرت شاہ عبدالحیٔ واعظ احقرؔ بنگلوری کی بعض تصنیفات کو بربنائے مغالطہ منشی عبدالحیٔ سبزواری کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ چناں چہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تالیف "مدراس میں اردو (۳۶) میں اور ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے اپنے مقالہ "غم بنگلوری" (۳۷) میں "مولانا عبدالحیٔ سبزواری مصنف جنان السیر"

لکھا تھا۔

حضرت احقر کے تصانیف کے تعداد کے تعین میں تذکرہ نگاروں نے ظن و تخمین سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر حبیب النسا نے لکھا ہے کہ " ان کی (علامہ احقر کی) تصانیف کوئی سوا سو کے قریب ہیں " (۳۸)۔ میر محمود حسین نے رقم کیا کہ:

شاہ عبدالحیٔ کثیر التصانیف بزرگ تھے، تصانیف کی تعداد عموماً سوا سو کی بتائی جاتی ہے۔ اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تصانیف سو سے کم نہ تھیں " (۳۹)۔

مولانا اطہر بنگلوری نے تحریر کیا کہ:

" بحولہ و قوتہ مترجم (علامہ احقر) کی مصنفات کا عدد ایک سو پانچ تک پہنچتا ہے " (۴۰)

سید احمد اڈوکیٹ نے لکھا ہے کہ:

" آپ (حضرت احقر) کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد کسی نے سوا سو بتلائی ہے تو کسی نے ڈیڑھ سو لیکن آپ کے فرزند مولانا عبدالقادر علی صوفی " معجزاتِ محمدی " میں ان کی صحیح تعداد ایک سو سے زیادہ قرار دی ہے " (۴۱)

ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی نے تعین نہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

" ملک العلما احقر کی جملہ تصانیف کا صحیح طور پر استعاب اب تک ہو نہیں پایا، جن مقالہ نگاروں نے آپ پر خامہ فرسائی کی ہے انھوں نے اپنے عدد کے ساتھ تخمیناً یا تقریباً کا لفظ لکھا ہے۔ خود مصنف کے فرزند مولوی عبدالقادر علی صوفی نے ایک مؤرخ و صحافی ہونے کے باوجود ہمارے مصنف کی ادبی کاوشوں کا صحیح ذکر نہیں کیا ہے " (۴۲)۔

ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا اطلاع کے برخلاف حضرت احقر کے فرزند و جانشین مولانا صوفی قادری نے ایک باقاعدہ اعلان نامے پر اپنے دستخط ثبت کرتے

ہوئے تحریر فرمایا کہ "جناب والد ماجد مولانا مولوی شاہ عبد الحئ صاحب واعظ رحمتہ اللہ علیہ ہیں، جن سے عمر ۶۶ سالگی میں ۱۲۵ کتاب بحسب احتیاج زمان نظماً و نثراً تصنیف پائیں" (۴۳)۔

اس واضح مصدقہ تحریر کے بعد مزید اٹکل سے کام لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ آپ کی جملہ کتابوں کے نام کہیں بھی مذکور نہیں ہیں۔ البتہ تاحال جتنی فہرستیں شائع ہوئی ہیں ان سب میں ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب کی دی ہوئی فہرست زیادہ سے زیادہ کتابوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی فہرست میں ہر کتاب کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے سالِ تصنیف کی ترتیب کو مدِ نظر رکھا ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی فہرست میں سے چند اہم کتابوں کے نام اجمالی تعارف کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ۱۲۵۲ھ: "بواثق الفقہہ" (فارسی زبان میں دینی مسائل پر مشتمل ایک نثری تالیف ہے، حضرت احقر کی یہ پہلی تصنیف ہے جس کو ۱۸ سال کی عمر میں آپ نے لکھا تھا۔ اس کتاب کے علاوہ باقی تمام تصنیفات اردو میں ہیں)

(۲) ۱۲۵۷ھ: شرح کشفی یا گلزار سعادت (حضرت قطب ویلوڑ کے ہمشیر زادے اور داماد مولانا سید محمد قادری ویلوری کی فرمائش پر آدابِ محرم و یوم عاشورہ اور عظمت صحابہ وغیرہ مسائل پر اس ساٹھ صفحات کے رسالہ میں روشنی ڈالی گئی ہے)

(۳) ۱۲۵۸ھ: رسالہ شعب الایمان منظوم

(۴) خلاصتہ السیر (سیرت طیبہ پر نثری رسالہ)

(۵) ۱۲۶۰ھ: فوائد عزیزی (سیرت)

(۶) ۱۲۶۲ھ جنان السیر (چمن اول۔ منظوم بسوط سیرت)

(۷) ۱۲۶۴ھ: تنبیہ العلوم (۱۲۵۰ اشعار پر مشتمل مثنوی جس میں بدعات و خرافات کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے)

(۸) ۱۲۶۵ھ: جنان السیر، دوسرا چمن گلزارِ نبوت (ولادت الرسولؐ سے معراج النبیؐ تک)

(۹) ۱۲۶۶ھ: فیضِ روحانی (حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات و خدمات)

(۱۰) ۱۲۶۷ھ: ریاض الازہر در فضائل سید البشر۔ گلزارِ اول و دوم (۱۷۸۰ اشعار پر مشتمل مثنوی ہے)

(۱۱) ۱۲۲۹ھ: ریاض الازہر، گلزارِ رسوم اطوار نبوت (۱۶۱۱ اشعار) اور گلزارِ چہارم آثار نبوت (۱۳۳۷ اشعار)

(۱۲) ۱۲۷۰ھ: زاد الاخرہ از امام غزالی کا منظوم ترجمہ (عقائد، حقوق اللہ اور حقوق العباد پر مشتمل ہے)

(۱۳) ۱۲۷۱ھ: رسالہ یارؤف یار حیم (اذکار و وظائف کا بیان)

(۱۴) ۱۲۷۳ھ: ذخیرۃ الکونین شرح سرالشہادتین از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (شہادت کے موضوع پر پانچ ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی دکن میں بے حد مشہور ہے اور یہ متعدد مرتبہ طبع ہوئی)

(۱۵) ۱۲۷۴ھ: قرآن السعدین فی حقوق الزوجین (منظوم) اور رسالہ۔ کلمات (نثر) یہ رسالہ ترغیب احکام میں قلم بند کیا گیا تھا۔

(۱۶) ۱۲۷۴ھ: تحفتہ البنات و رسالہ، رد بدعات (منظوم) عورتوں کے لیے لکھی گئی ان دو مثنویوں میں سے پہلی مثنوی ۲۷۵ اشعار پر اور دوسری مثنوی ۱۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ دراصل اپنی کم سن دختر و نورِ نظر امتہ اللہ کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ ان دونوں مثنویوں کی زبان بہت ہی سادہ اور سلیس ہے تاکہ کم پڑھی لکھی خواتین بھی ان اشعار کا مفہوم جلد سمجھ لیں۔ خواتین کی اصلاح کے موضوع پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف "بہشت زیور" کے ذریعے ۱۳۲۰ھ تا ۱۳۳۲ھ کے درمیان قلم اٹھایا تھا اور اس میں فارسی آمیز زبان استعمال کی تھی۔ مگر حضرت احقر نے اسی

موضوع پر حضرت تھانوی سے بہت پہلے مستقل تصانیف سپرد قلم کیا تھا۔

(۱۷) ۱۲۷۵ھ: جنان السیر کے دفتر اول کا آخری چمن یعنی چمن چہارم "اخبار نبوت" کی تکمیل ہوئی جس میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی نظم کی گئی ہے۔

(۱۸) تحفہ، مرغوب شرح محبوب القلوب (حضرت غوث اعظمؒ کے حالات و کرامات پر مشتمل ایک منظوم تصنیف حضرت باقر آگاہ نے "محبوب القلوب" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب کے بعض مجملات پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا۔ حضرت احقر نے ان سب کا جواب تفصیلاً اپنی اس کتاب میں دیا ہے)

(۱۹) ۱۲۷۶ھ: سعادت ابدیہ فی وظائف محمدیہ (یہ کتاب صبح و شام پڑھے جانے والے ادعیہ ماثورہ اور اور اردو وظائف پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو اپنے پیر بھائی فقیہ شہیر معروف بہ دبلے محی الدین صاحب مدراس مدرسہ، لطیفیہ ویلور کی خدمت میں پیش کیا تھا)

(۲۰) ۱۲۷۶ھ: چہار گلشن فی مناقب ائمہ، خیر القرون (ائمہ اربعہ کے احوال و فضائل پر مشتمل ہے)

(۲۱) ۱۲۷۷ھ: رسالہ، مباحثہ۔ مولانا محمد علی رامپوری اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی کی حمایت و تائید میں (حضرت احقر نے منشی غلام احمد طاہر سے بہ مقام معمول پیٹھ بنگلور مناظرہ کیا تھا، اس مباحثہ کو ہو بہو نقل کر کے مطبع عمدیہ مدراس سے آپ کے بعض عقیدت مندوں نے شائع کیا تھا)

(۲۲) ۱۲۷۷ھ تحقیق الشفاعہ: (عبدالحق تحقیق مدیر اخبار "محافظ" و ماہ نامہ "شمع سخن" کے بارہ استفساروں کا جواب اس رسالہ میں موجود ہے)

(۲۳) ۱۲۸۲ھ: تفسیر جواہر منظوم (اردو زبان میں اولین منظوم تفسیر ہے۔ آپ کے بہت بعد شمال میں قرآن شریف کی تفسیر نظم کی گئی)

(۲۴) ۱۲۸۶ھ: خلاصہ، تاریخ الخلفا

(۲۵) حدیقتہ الاحباب فی احوال الاصحاب (ابتدا ۱۲۸۴ھ میں ۱۲۸۶ھ میں اختتام)

(۲۶) ۱۲۸۷ھ: تفسیر سورۂ مزمل

(۲۷) ۱۲۸۸ھ: ریاض الازہر (دوسرا گلشن "آداب نبوت" جس کے جملہ اشعار ۱۹۵۲ء ہیں)

(۲۸) ۱۲۸۹ھ: مطلع النور (حضرات اقطاب ویلور کے احوال و مناقب پر مشتمل منظوم رسالہ)

(۲۹) ۱۲۹۱ھ: جنان السیر (دفتر دوم کا چمن پنجم و ششم)

(۳۰) ۱۲۹۲ھ: فیض الباری ترجمہ تیسیر القاری شرح صحیح بخاری (اردو زبان میں بخاری شریف کا اولین ترجمہ)

(۳۱) ۱۲۹۸ھ: دیوان احقر (یہ کتاب نعتیہ غزلیں، قصائد، مستزاد، قطعات، مسدس وغیرہ اصناف سخن پر مشتمل ہے اور یہ دیوان مطبع محمدی معکسر، بنگلور سے شائع ہو چکا ہے)

(۳۲) ۱۲۹۹ھ: مجموعہ فتاویٰ (حضرت احقر نے مفتی) کی حیثیت سے جو فتاویٰ جاری فرمائے تھے اس کا یہ مجموعہ ہے)

(۳۳) ۱۳۰۰ھ: کلید معرفت (۴۷۳) اشعار پر مشتمل تصوف کی کتاب ہے، حضرت احقر کی یہ ہی آخری تصنیف ہے)

حضرت احقر ایک فعال شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی متحرک شخصیت زاویہ۔ خمول پر پڑے رہنے پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے حضرت احقر نہ صرف علمی و شعری محفلوں میں بہ نفس نفیس شرکت کرتے تھے بلکہ علمی اداروں اور ادبی انجمنوں کی سرپرستی بھی فرمائے تھے (۴۴) سبحتاں چہ ۲۶/ جون ۱۸۷۳ء مطابق ۱۲۹۰ھ میں تحفظ اسلام کے لیے شہر بنگلور میں ایک انجمن قائم کی گئی تھی جس کی سرپرستی آپ کے ذمے میں تھی۔ اسی طرح ریاست کرناٹک کے اولین اخبار مسمیٰ بہ "قاسم الاخبار" (۴۵) کے بانی و مدیر محمد قاسم شاد و غم (متوفی ۱۳۰۹ھ) نے "بزم غم" کے نام سے ایک شعری و

ادبی انجمن قائم کی تھی۔ جس کے ماہانہ نشستیں اور مشاعرے اخبار کے دفتر ہی میں منعقد ہوتے تھے۔ حضرت احقر "بزمِ غم" کے رکن رکین تھے۔ آپ اس دور کے اخبار و رسائل میں کثرت سے شائع ہوچکے ہیں، قاسم الاخبار، منشور محمدی کے علاوہ مولانا عبدالحق تحقیق (متوفی ۱۳۱۸ھ) کے جریدہ "گل دستہ۔ شمع سخن" اور مولانا عبدالحفیظ آرام کے ماہ نامہ رسالہ (۴۶) "ترغیب" میں بھی آپ کی تخلیقات باقاعدہ شائع ہوتی تھیں (۴۷)۔

حضرت احقر قادر الکلام اور پر گو شاعر تھے۔ طبیعت بے حد موزوں پائی تھی، خدائے برتر نے شعر و سخن کا ملکہ آپ کو ودیعت فرمایا تھا۔ آپ نے صوفی شعرا کی طرح شاعری کی تبلیغ و ارشاد اور اصلاح معاشرت کے لیے استعمال کیا تھا مگر دیگر شعرا سے آپ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے شاعری کو نہ صرف اشاعت دین بلکہ علوم و فنون کی ترویج کا ذریعہ بھی بنایا جس کی وجہ سے اردو زبان کا علمی ذخیرہ مختلف علوم سے مالا مال ہوگیا۔ آپ کی منظوم تصنیفات میں جہاں عوام سے خطاب اور اصلاح معاشرہ کی مقصدیت کار فرما ہے وہاں شعریت کم اور سادگی، سلاست و روانی زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس جہاں آپ کی شاعری دلی جذبات کی عکاس اور باطنی کیفیات کا تخلیقی اظہار بن گئی وہاں شعری اسلوب میں نکھار، زبان و بیان میں وقار اور طرز آداب میں متانت کی جلوہ گری محسوس ہوتی ہے۔

آپ کی نعتیہ شاعری کا ایک مجموعہ "قصائد نعتیہ محمدیہ" (۴۸) کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ اس مجموعہ کو برہان علی خاں وفا بنگلوری نے ۱۲۹۹ھ میں مطبع عثمانیہ بنگلور سے چھپوایا تھا، یہ کتاب بڑی تقطیع کے چوبیس صفحات پر مشتمل ہے، ابتدا میں دو مسدس ہیں جن میں بالترتیب اکیس اور چودہ بند ہیں۔ بعد ازاں چودہ نعتیہ غزلیں شامل کیے گئے ہیں جو کم از کم نو شعر اور زیادہ سے زیادہ چالیس شعر پر مشتمل ہیں۔ یہ تقریباً جملہ پانچ سو اشعار کا نعتیہ کلام ہے۔ آخر میں کتاب سلام و دعا پر اختتام پذیر ہوئی ہے۔ نمونہء کلام ملاحظہ ہوں:

خوشتر گل و ریحان سے ہیں خارِ مدینہ
بہتر در و مرجان سے اشجارِ مدینہ

کیوں خضر بھی دیوے نہ گواہی کہ خدا ہیں
صد چشمۂ حیوان بہ آبارِ مدینہ

کرتا نہ طلب چشمۂ حیوان کو سکندر
پاتا تو وہ اگر شربتِ انہارِ مدینہ

خورشید کرے رشک سے رخ زرد ہمیشہ
جب دیکھے یقیں مطلعِ انوارِ مدینہ

یہ پیرِ فلک پشت کیا اپنی خمیدہ
منقاد ہو پیش در سالارِ مدینہ

احقر کو نہیں ظلِ ہما کی ہے تمنا
کر اس کو عطا سایۂ دیوارِ مدینہ

ایک اور نعت شریف کے چند شعر پیش ہیں:

اے مطلعِ جریدۂ دیوانِ انبیا
اے مقطعِ قصیدۂ برہانِ انبیا

گوہر ہے ایک مخزنِ عرفان سے ترے
گنجینۂ جواہرِ عرفانِ انبیا

تیری کتابِ پاک ہوئی ناسخِ کتب
ہے دین تیرا ناسخِ ادیانِ انبیا

بس رتبۂ معیت حق دیکھ کر ترا
حیران ہیں آئنہ سے سب اذہانِ انبیا

حضرت احقر نے اپنی تصنیفات میں متعدد مقامات پر مدینہ منورہ میں وفات پانے کی تمنا ظاہر کی، مثال کے طور پر چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

اور مدینے میں اقامت دے مجھے
اور شہادت کی سعادت دے مجھے

اور وہیں کر دے مری موت و حیات
توشہ ایمان و شہادت کا دے مجھے

مصطفیٰؐ کے ساتھ میرا حشر کر
دے تو اس کے ساتھ جنت میں گزر

اقبال و زر و مال میں چہتا نہیں یا رب
کر مجھ کو مدینہ کی اقامت سے مشرف

دے موت مجھے شہر میں ہی اپنے نبیؐ کے
اور کیجئے مجھے فخرِ شہادت سے مشرف

احقر کی دعا از پئے سالارِ دو عالمؐ
درگاہ میں تیری ہو اجابت سے مشرف

سیدہؓ کیجئے شفاعت پر مری نزد خدا
تا مجھے جلد وہ پہنچادے سوئے حرمین

خاک ریزاں ہو مری خاک مدینہ میں ہی بس
ہو وہی خاکِ مقدس میری کل العین

بس اس احقر کو شہادت سے سرفراز کرے
خاتمہ خیر کرے بہرِ حسنؓ، بحرِ حسینؓ

احقر کو نہیں شوق ہے اقبالِ عجم کا
دے سایۂ آں دولتِ دامانِ مدینہ

دے موت وہیں اور وہیں کیجئے کرم سے   مرقہ مری در مشہد غربائے مدینہ

یا رب یہ دعا ہو مری مقرون اجابت   از بہر نبیؐ و زپئے صلحائے مدینہ

حضرت احقر فنافی الرسول کے مرتبہ پر فائض تھے، لہذا آپ کی دلی مراد رنگ لائی، دعا مقبول بارگاہ ہوئی۔ چناں چہ آپ ۱۳۰۰ھ میں حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین پہنچے، حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینۂ منورہ میں حاضری دی۔ زیارت شریف سے مشرف ہونے کے بعد (۴۹) ۲۳/ محرم الحرام ۱۳۰۱ھ کو اسی سرزمین میں حرمین شریفین کے درمیان واصل بہ حق ہوئے۔ حضرت احقر کے ہاں پانچ نرینہ اولاد محمد عبدالقادر علی، محمد عبدالقیوم، محمد شمس الدین احمد، محمد علی واعظ، محمد ابراہیم اور ایک لڑکی امت اللہ کا پتہ چلتا ہے (۵۰)۔

شاہ محمد عبدالقادر علی صوفی

حضرت صوفی شاہ عبدالحئ احقر بنگلوری کے فرزند کلاں اور جانشین تھے۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں آپ کی شہرت و نیک نامی دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ آپ اپنے والد ماجد کی طرح متبحر عالم اور بلند پایہ شاعر تھے۔ صوفی کی بسم اللہ خوانی شاہ احقر نے اپنے پیر و مرشد حضرت سید شاہ محی الدین عبداللطیف معروف بہ قطب ویلورؒ سے کرائی اور ابتدائی تعلیم و تربیت خود ہی اپنی نگرانی میں جاری رکھی تھی۔ فارسی اور عربی کی مبادیات سے فراغت کے بعد حضرت احقر نے اپنے فرزند ارجمند کو مزید تعلیم و تربیت کے لیے ویلور لے جا کر حضرت قطب ویلورؒ کی خانقاہ میں پہنچا دیا، اسی طرح خانقاہ میں تکمیل علوم ظاہری و تزئین فیوض باطنی سے شاہ صوفی بہرہ مند ہوئے اور اپنے والد کی طرح حضرت قطب ویلور کے دست حق پرست پر بیعت کی اور بعد ازاں خرقۂ خلافت سے سرفراز کیے گئے۔

شاہ صوفی کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ اپنے والد شاہ احقر کی طرح آپ بھی ایک پر گو اور قادر الکلام شاعر تھے، تصنیف و تالیف کا ذوق بھی بچپن ہی سے ودیعت

تھا چتاں چہ صوفی نے اکیس سال کی عمر میں حضرت امام غزالیؒ کی معرکہ، آرا تصنیف "جواہر القران" کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا، اس کے علاوہ آپ نے محدث و فقہیہ امام برگلی قدس سرہ کی کتاب کا بھی اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ آپ نے وجود سموات اور اثبات افلاک میں "ثوابت" نام کا ایک رسالہ لکھا جس میں من جملہ دیگر امور کے قرار زمین و گردش آفتاب کی بوجوہ احسن ثابت کیا ہے۔ مذکورۂ بالا کتب و رسائل کے علاوہ شاہ صوفی نے "تاریخ مصر" اور مالا بد منہ کا اردو میں ترجمہ کیا، آپ کا سب سے اہم کارنامہ اپنے والد بزرگ وار کے حکم پر "جنان السیر" کے چمن ہشتم "معجزات محمدیؐ" کی تصنیف ہے، یہ مثنوی ۱۲۹۰ھ میں اختتام پذیر ہوئی۔ اس کا قطعہ، تاریخ خود حضرت صوفی نے لکھا ہے جس کا آخری شعر اس طرح ہے:

بولا صوفی کرشمہ قدرت کا (۵۱) بالبدیہ اس کا سال بلبلِ دل
۱۲۹۰ھ

شاہ صوفی نے اپنی مثنوی "معجزاتِ محمدی" کی ابتدا میں "منقبت پیر و استاذ تقدس نہاد قدس سرہ، اور "سببِ تنظیم ایں رسالہ، نافعہ و سلالہ، رابعہ" کے تحت اپنی تعلیم، تربیت اور اپنی تصانیف وغیرہ کی تفصیل درج کر دی ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں آپ کا طویل نعتیہ قصیدہ بھی منسلک ہے۔ مشتے نمونہ، از خروارے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھ سا حبیب خالق، داور نہیں کہیں
تیری صفات و ذات میں ہم سر نہیں کہیں

چمکے ستارگان نبوت ہزارہا
لیکن ترے ساماہ منور نہیں کہیں

"والشمس" تیرے مصحف رخ کا ہے نقطہ ایک
ایسا جہاں میں روئے منور نہیں کہیں

مانند تیرے گیسو کے واللیل سے شبیہہ
گیسوئے عنبرین و معطر نہیں کہیں

آدم سے تا مسیح رسل جس کے ہیں ثمر
ایسا شجر جہاں میں مثمر نہیں کوئی

تعبیر تیرے یدکی ید اللہ سے ہوئی
یوں دست حق سے دست معبر نہیں کہیں

منبر ہے قوس قاب عصا خطبہ، انا
ایسا خطیب و خطبہ، و منبر نہیں کہیں

اسفار اربعہ کے عروج و نزول میں
تیرے قدم کے نقش سا رہبر نہیں کہیں

نعلین تیرے عرش کیا اپنے سر کا تاج
ایسے نعال عرش کے افسر نہیں کہیں

محبوبؐ کبریا کا کرے وصف جو تمام — ایسا بشر جہاں میں سخنور نہیں کہیں
کیجئے کرم سے بندۂ صوفی کے دل کو صاف — اے شاہ ، مانند اس کے مکدر نہیں کہیں

شاہ صوفی نے بہ وقت نزع خود اپنی تاریخ وفات کہی تھی " رفت اہل دین فقیہ وصوفی و عالم بگو " اس تاریخی مصرعے سے ۱۳۱۴ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ یہ ہی آپ کا سال وفات ہے۔ آپ کے فرزندوں میں مولانا مولوی ابوالسعود محمد، مولانا محمد عبدالباسط برق اور منشی احمد علی وصفی کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ صوفی کے دوسرے فرزند حضرت برق شعرو ادب اور صحافت کے میدان میں کافی مقبول ہوئے۔ آپ نے شہر بنگلور میں ایک بہترین مطبع " مسلم پریس " کے نام سے جاری کیا تھا، جہاں سے اردو کے سیکڑوں کتابیں طبع ہوئی تھیں، علاوہ ازیں آپ نے " اخبار المسلم " کے نام سے وقیع روزنامہ کی بنیاد رکھی تھی جو کافی مدت تک بلاناغہ جاری رہا، حضرت برق کو شعرو سخن میں مرزا دبیر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کی جودت طبع اور فطری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر حضرت دبیر نے برق کو اپنے ممتاز تلامذہ میں شامل کر رکھا تھا، اسی لیے جب جناب برق نے ۱۹۱۷ء میں مرزا دبیر کی سرپرستی میں ایک علمی و ادبی ماہ نامہ " پیکر خیال " بنگلور سے جاری کیا (۵۲) تو اس کے لیے درج ذیل تاریخی قطعہ دبیر نے بہ ذات خود لکھا:

چھپ گیا " پیکر خیال " دبیر — لوگ کہتے ہیں اس کو رونق بزم
سال اشاعت کا سوچتا کیا ہے — لکھ یہ ہے بے بہا رسالہ ، نظم

۱۳۳۶ھ

اس رسالہ میں حضرت دبیر کے علاوہ دیگر اساتذۂ ہند کا کلام شائع ہوتا تھا، اس کی شہرت شمال اور جنوب میں دور دور تک پھیلی تھی۔

شاہ صوفی کے تیسرے صاحب زادے حضرت وصفی بھی ایک بلند پایہ ادیب و صحافی تھے۔ آپ نے (۵۳) ہفتہ وار " چارج گزٹ " اور " اڈوائزر " جاری کیا تھا۔ " برق سخن " کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ آپ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ بھی اپنے معیاری مشتملات کی وجہ سے دور دراز علاقوں تک مشہور تھا۔

بہ ہر حال حضرت صوفی اور آپ کے فرزندوں نے اردو زبان و ادب کے لیے قابل قدر کارنامے انجام دئے۔ خصوصاً صوبہ کرناٹک میں علوم و فنون اور شعرو ادب کی ترویج و اشاعت میں اس خانوادے کا ناقابلِ فراموش حصہ رہا ہے۔ حضرت صوفی کی علمی شان و شوکت اور ذاتی قدر و منزلت کا برملا اقرار کرتے ہوئے آپ کے معاصر عالم و فاضل شاعر و ادیب عبداللہ مستان ولد (۵۴) قادر خاں بیجاپوری نے اپنی تصنیفات "جواہر الاحکام فی دین لاسلام" (تصنیف شدہ ۱۳۰۷ھ) "جواہر الہدایت" فی احوال خاتم الرسالت" (۱۳۱۲ھ) اور "گلشن رحمانی" (۱۳۱۴ھ) میں آپ کی نہ صرف تعریف و توصیف بیان کی بلکہ مذکورہ کتابوں پر حضرت صوفی سے سندِ تصدیق بھی حاصل کی۔ الغرض شاہ صوفؔ اپنے علمی و دینی بلند مرتبہ کے باوجود اردو کی خدمت زندگی بھر کرتے ہوئے آپ نے اردو کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ:

ہے سرد اس زمانے میں علم و ہنر — ہندی کا بازار گرم تر
بھی قاصر ہے ہمت میں لوگوں کا حال — نہیں عربی فارسی پہ خیال
عروس تصانیف کے تن پہ سب — سجا ہند کا ہے لباس اس سبب

حواشی

(۱) بحر بیکراں ص ۴۶ از ہیچ سید احمد اڈوکیٹ مطبوعہ ۱۹۸۲ء بنگلور

(۲) ایضاً ص ۴۳

(۳) جنان السیر ص ۴۵۵ معجزات محمدی (چمن ہشتم) از صوفی ابن علامہ احقر بنگلوری

(۴) تحقیقی مقالہ "حضرت شاہ عبدالحیٔ احقر بنگلوری حیات اور کارنامے" (غیر مطبوعہ) از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ص ۲۰

(۵) علامہ اقبال میسور میں اور دیگر مضامین (مجموعہ) ص ۵۱ از پروفیسر میر محمود حسین میسوری

(۶) ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما ص ۱۸۱ از ڈاکٹر حبیب النسا بیگم صاحبہ

(۷) Arabic Parsian in Carnatic p 506

By Yusuf Kokan

(۸) جنوب کا شعر و ادب مجموعہ مضامین علیم صبا نویدی) ص ۸۱ مرتب ڈاکٹر محمد علی اثر مطبوعہ ۱۹۹۳ء مدراس

(۹) بحر بیکراں ص ۸ مطبوعہ ۱۹۸۲ء بنگلور

(۱۰) چہار گلشن از علامہ احقر بنگلور مطبوعہ ۱۳۰۳ھ مطبع محمدی معسکر بنگلور

(۱۱) جنان السیر چمن دوم ص ۱۳۰ از حضرت علامہ احقر بنگلوری

(۱۲) ایضاً

(۱۳) مثنوی مطلع النور ص ۶۲ از شاہ عبدالحیٔ احقر مطبوعہ ۱۲۹۰ھ مطبع محمدی معسکر بنگلور

(۱۴) تحقیقی مقالہ از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ص ۳۳

(۱۵) مثنوی مطلع النور ص ۶۴

(۱۶) دیباچہ۔ حدیقتہ الاحباب ص ۷ بہ حوالہ۔ مقالہ تحقیق از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ص ۴۷

(۱۷) مثنوی مطلع النور ص ۶۲

(۱۸) سال نامہ اللطیف ۱۳۸۸ھ ص ۵۵

(۱۹) جنان السیر فی احوال سید البشر ص ۲۷

(۲۰) چہار گلشن ص ۷ مطبوعہ ۱۳۰۳ھ مطبع محمدی بنگلور

(۲۱) تنویر العقول فی اسلام آباء الرسول ص ۳ مطبوعہ مطبع مظہر العجائب، مدراس

(۲۲) "انفاس العارفین" از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مطبوعہ مطبع الفلاح، دیوبند، یوپی

(۲۳) جنان السیر چمن دوم ص ۱۷

(۲۴) جنان السیر ص ۲۱۲ بہ حوالہ۔ مقالہ۔ تحقیق ص ۵۰ از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی

(۲۵) مقدمہ۔ ریاض الازہر بہ حوالہ۔ مقالہ۔ تحقیق ص ۵۲

(۲۶) رسالہ۔ مطبوعہ مطبع محمدیہ مدراس ص ۳۳

(۲۷) مکتوبات لطیفہ (غیر مطبوعہ)

(۲۸) العلامہ السید عبدالحیٔ الحسنی عصرہ، حیاتہ - مؤلفاتہ - از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ص ۲۷۶ مطبوعہ ۱۹۸۳ء دار الشرف، جدہ - سعودی عربیہ

(۲۹) جنان السیر ص ۲۸

(۳۰) جیسا کہ آپ خود رقم طراز ہیں:

میں لکھا ہوں بذکر پیغمبر یک کتاب سیر "جنان سیر"
آٹھ نسخے ہیں اس کے اے دلشاد بتیس بیس الف سے ہیں اس کی زیاد

" بہ حوالہ ۔بحر بیکراں ص ۴۸

(۳۱) حضرت صوفی نے ۱۲۹۰ھ میں اس چمن کی تکمیل کی ، قطعہ ۔ تاریخ کا آخری شعر اس طرح ہے:

بالبدیہ اس کا سال بلبل دل ۔ بولا صوفی کرشمہ قدرت کا

۱۲۹۰ھ

مطبوعہ کتابوں میں "کرشمہ قدرت کا" کے نیچے ۱۲۹۱ھ تحریر کیا گیا ہے جو غلط ہے۔ "جنان السیر" کے آٹھ چمن کے ساتھ موجودہ ناشران کتب نے احقرؔ کی دوسری تصنیف "ریاض الازہر" سے منتخب حصے نقل کر کے مزید دو چمن کا اضافہ کر دیا اس طرح "دس چمن" ہو گئے اس پر سیر حاصل بحث ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی نے اپنے مقالہ میں کی ہے۔ حضرت شمس بریلوی لکھتے ہیں کہ:

"اردو زبان میں "سیرتِ طیبہ" کے موضوع پر سب سے پہلے سیر سید احمد خاں نے مستقلاً تو نہیں البتہ "ولیم میور" کی دیدہ دہنی کے جواب میں ----- قلم اٹھایات" (ماخوذ از سرورِ کونین کی وضاحت مطبوعہ ۱۹۸۸ء دہلی) شمس بریلوی صاحب کا مذکورہ بیان حضرت احقرؔ کی بسوط تصنیف "جنان السیر" سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہے۔

(۳۲) علامہ اقبال میسور میں اور دیگر مضامین ص ۶۱، ص ۶۲

(۳۳) جنان السیر چمن ہشتم ص ۴۵۶ از حضرت مولانا عبد القادر علی قادری صوفی

(۳۴) مقالات محمود ص ۱۱۲

(۳۵) مقالہ ۔ تحقیق ص ۸۷

(۳۶) ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما ص ۱۸۰

(۳۷) نوائے ادب بمبئی شمارہ اکتوبر ۱۹۵۹ء بہ حوالہ ۔ تحقیق از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ص ۸۵

(۳۸) ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما ص ۱۸۰

(۳۹) ادبیات میسور ص ۱۱۱

(۴۰) دیباچہ ۔ فیض الباری ص ۱۱ کا حاشیہ

(۴۱) بحر بیکراں ص ۵۵

(۴۲) مقالہ ۔ تحقیق ص ۸۵

(۴۳) جہار گلشن صفحہ ۔ ابتدائی کا حاشیہ از حضرت عبد القادر علی صوفی

(۴۴) تحقیقی مقالہ از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی

(۴۵) یہ اخبار ۱۸۶۱ء سے ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔

(۴۶) یہ ماہانہ رسالہ خواتین کا پہلا اردو رسالہ تھا

(۴۷) بحر بیکراں از سید احمد اڈوکیٹ ص ۳۱

(۴۸) مقالہ۔ تحقیق از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی

(۴۹) جہار گلشن ج ص ۳۷ کے حاشیہ پر تاریخ وفات اور مقام درج ہے۔

(۵۰) مقالہ۔ تحقیق از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ص ۷۷

(۵۱) جنان السیر چمن ہشتم ص ۴۸۴

(۵۲) بحر بیکراں ص ۳۶

(۵۳) مقالہ۔ تحقیق ص ۸۷ از ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی

(۵۴) ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما ص ۱۷۲ از ڈاکٹر حبیب النساء بیگم

(۵۵) جنان السیر چشم ہشتم ص ۵۶۴ حضرت شاہ صوفی کے مذکورہ اشعار کو مولانا یوسف کوکن مرحوم نے اپنی کتاب "عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک" ص ۵۳۴ میں بربنائے مغالطہ شاہ عبدالحیٰ واعظ احقر بنگلوری کی طرف منسوب کردیا۔

حضرت مسکین بخاری مدراسی

آپ کا اسم گرامی سید عبدالغفار " محی الدین " لقب اور مسکین تخلص تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء بہ مقام بنگلور ہوئی۔ " مخدوم ثانی " آپ کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۵۱ کے عدد مستخرج ہوتے ہیں۔ آپ کے والد سید شاہ زین العابدین جیلانی حیدرآباد (المتوفی ۱۲۸۲ھ) کا سلسلہء نسب سادات بخارا کے چشم و چراغ مشہور و معروف صوفی و عالم حضرت سید محمد شاہ عالم گجراتی (المتوفی ۸۸۰ھ م ۱۴۷۵ء) ابن قطب العالم سید شاہ برہان الدین (متوفی ۸۵۷ھ) قدس اللہ اسرار ھم سے ملتا ہے اور حضرت شاہ عالم گجراتی مشہور عالم بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (متوفی ۸۵۷ھ) کی اولاد سے تھے (۱)۔ حضرت مسکین کی ظاہری تعلیم اور تربیت باطنی اپنے والد کے زیرِ سرپرستی ہوتی رہی۔ جب پورے اٹھائیس سال بعد آپ علوم ظاہری و باطنی سے فارغ ہوگئے تو والد بزرگوار نے آپ کو ۱۲۷۹ھ میں خاندانی خرقہء خلافت سے سرفراز فرمایا، اور ہدایت کی کہ " جب تم سے ممکن ہو حضرت قطب الہند کی قدم بوسی کے لیے ویلور جانا کیوں کہ آج دکن کے وہی قطب ہیں " یہ نہیں بلکہ آپ کے والد نے اپنی وفات کے قریب بھی آپ کو ان الفاظ میں وصیت کی کہ " حضرت قطب ویلور کی خدمت میں حاضری دیتے رہو تاکہ انوارِ ربانی آپ پر منکشف ہوں " (۲)۔ آپ کے والد ملازمت کے سلسلہ میں سکندرآباد چلا گئے تھے اور وہیں آپ نے پردہ فرمایا۔ اس وقت بہ حسن اتفاق حضرت مسکین سکندرآباد ہی میں مقیم تھے۔ حالاں کہ ان دنوں آپ کا قیام مدراس میں تھا اور اسی کو وطن بنالیا تھا۔ آپ نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق ۱۲۸۲ھ میں وہاں سے ویلور دارالسرور کا رخ کیا اور حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری ویلوری الملقب بہ محی الدین المعروف بہ قطب ویلور کی خدمت میں حاضری دی۔

بہ ہرحال حضرت مسکین حضرت قطب ویلور کی خدمت میں تقریباً چار سال

رہے۔ حضرت قطب ویلور ۴/ شوال ۱۲۸۸ھ کو عازم حج بیت اللہ ہو کر ویلور سے نکلے اور بعد فراغت حج ۱۱/ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ (۳) کو مدینہ منورہ میں آپ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ حضرت قطب ویلور وصال سے پہلے اپنے صاحب زادے حضرت سید محمد قادری معروف بہ رکن الدین ویلوری کے بہ دست جو آپ کے رفیقِ سفرِ حج تھے اپنے چہیتے مرید وفدوی کے لیے خرقہ، خلافت ارسال فرمایا۔ حضرت مسکین حصولِ اجازت و خلافت کے بعد ویلور سے مدراس روانہ ہوگئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ مدراس ہی میں بہ تاریخ ۲۴/ صفر المظفر ۱۳۲۶ھ بہ روز شنبہ مطابق ۲۸/ مارچ ۱۹۰۸ء آپ واصل بہ حق ہوئے۔ معاصرین علماء و شعرا نے تاریخی قطعے کہے ہیں۔ مثال کے لیے حضرت محمد نصیر الدین بے خود مدراسی کا قطعہ، تاریخ پیش کیا جارہا ہے:

عبد غفار حضرت مسکین زین سید خانہ شد بعالم نور
فکرِ تاریخ کردم اے بے خود سال وصلش برآمدہ " مغفور "(۴)

(۱۳۲۶ھ)

حضرت مخدوم ساوی کی درگاہ واقع میلاپور مدراس کے روبرو مشرقی سمت آپ آسودۂ خاک ہیں۔ مولانا محمد یوسف کوکن نے لکھا ہے کہ (۵) آپ کی وفات حیدر آباد میں ہوئی، یہ صحیح نہیں ہے۔

حضرت مسکین عربی، فارسی اور اردو کے جید عالم تھے، نظم و نثر میں قدرت کاملہ حاصل تھی۔ جناب مولوی شمس الدین خاں فیضی حیدر آبادی سے مشورہ، سخن کرتے تھے۔ شاعری میں زورِ قلم سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے خوب مشق و مزاولت کی ہے۔ کلام صاف و شستہ ہے اور کلام کا بیش تر حصہ عشقِ حقیقی اور کچھ حصہ مجازی کا حامل ہے۔ آپ کا دیوان جس میں اردو کلام کے ساتھ آخر میں فارسی کلام بھی شامل ہے۔ ۱۳۴۳ھ میں مدراس سے شائع ہوا۔ آپ نے "عیون المظاہر" اور "کہنہ مرغوب" نامی تصوف میں دو رسالے تصنیف کیے یہ دونوں فارسی زبان میں ہیں۔ اور بالترتیب (۶) ۱۳۱۳ھ میں مطبع نامی اور ہگن باتھم کمپنی (Higgin Batham Company) مدراس سے شائع ہوئے ہیں۔ اردو میں آپ کی واحد نثری تصنیف

شرح "من لگن" ہے جو ۱۲۵۳ھ میں مطبع محمدی مدراس سے طبع ہوئی۔ مثنوی "من لگن" دکنی زبان میں تصوف کے موضوع پر بہت مشہور مثنوی ہے جس کے مصنف عارف باللہ قاضی سید محمود بحری (المتوفی ۱۱۳۰ھ) ابن شیخ بحرالدینؒ ہیں۔اس مثنوی کی اولین فارسی شرح حضرت سید شاہ حسین محرم نلوری (۷) (متوفی ۱۲۵۰ھ) نبیرۂ شاہ حسین مجرم نلوریؒ نے لکھی تھی۔اس کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں (بہ حوالہ نمبر ۱۶۶۸) (۸) محفوظ ہے۔حضرت محرم نلوری کے بعد حضرت مسکین نے اس کی شرح دکنی زبان میں اپنے ہم مشرب مولانا سید شاہ افتخار علی وطن حیدرآبادی کی خواہش پر ۱۳۱۶ھ میں کی تھی جو کافی مقبول ہوئی۔یہاں "من لگن" کا ایک شعر شرح پیش کی جارہی ہے تاکہ شرح و حل لغات کی کیفیت واضح ہو۔

شعر من لگن:

اے روپ ترا رتی رتی ہے پربت پربت پتی پتی ہے

مطلب:۔ اے ذات باری تیرا جمال و ظہور ذرہ ذرہ ہے

کوہ کوہ برگ برگ یعنی کاہ کاہ (ہے)

حل لغات:۔ روپ بہ معنیٔ تشبیہ، روپ بہ معنیٔ تنزیہ

(۱) روپ بہ معنیٔ جمال و ظہور و نور و شکل و آثار و طور و صورت و نقش

(۲) رتی رتی بہ معنیٔ ذرہ ذرہ

(۳) پربت۔کوہ، کوہ بہ معنیٔ (ہندی) پہاڑ

(۴) پتی پتی کاہ کاہ یعنی برگ۔ہندی تنکا یعنی پتا اور تھوڑی چیز۔۔۔۔۔

(حل لغات کے حاشیہ میں دیے گئے ہیں)

شعر کی صوفیانہ تشریح اس طرح کی گئی ہے:

"روپ یعنی اے ذات مطلق واجب الوجود یا اے ذات ساذج و یا اے وجود مطلق روپ تیرا یعنی ظہور تیرا رتی یعنی ذرہ ذرہ تیرا ہی ظہور ہے اور تیرا ہی نور ہے۔اب مراد لفظ "اے" سے خطاب بوجود

مطلق ہے۔تعریف وجود کی جاننا چاہیئے کہ "وجود" عربی لفظ ہے۔مراد
وجود سے ذات واجب سبحانہ تعالیٰ ہے اور وجود عین حقیقت وہ
سبحانہ تعالیٰ شانہ کی ہے۔اور مراد وجود سے وہ مصدری معنیٰ نہیں۔
جو مفہوم "بودن" کا ہے کیوں کہ یہ معنیٰ انتزاعی ہے تعالیٰ اللہ تعالیٰ
عن یکون ھذا المعنیٰ ترالت سنہ اور وجود عربی لفظ ہے۔اس کے معنی
لغت میں ہونا اور صوفیائے کرام کے نزدیک وجود ایک حقیقت کو
کہتے ہیں کہ اپنی ذات سے آپ موجود ہو اور ہستی دوسروں کی اسی
ذات سے ہو اور اس کا خارج میں منتفی ہو پس صوفیائے کرام اسی
معنی کی راہ اللہ تعالیٰ کو وجود کہتے ہیں اور غیر حق کو اسی معنی کی راہ
کرتے وجود نہیں۔اس وجود کو نہ شکل ہے اور نہ حد اور نہ نہایت،
باوجود اس کے ظاہر ہوا لباس شکل و حد سے اور متغیر نہیں ہوا اپنے
وصف اصلی اور بے شکلی اور بے حدی اور بے نہایتی سے بلکہ وہ وجود
ابھی ویسا ہی ہے جیسا تھا" (۹)۔

مذکورہ بالا تشریح سے حضرت مسکین کی علمی نثرنگاری کا اسلوب اور صوفیانہ طرز بیان کا پروقار انداز سامنے آتا ہے۔آپ کی ایک متصوفانہ غزل جو غالب کی زمین میں ہے پیش کی جارہی ہے۔

کونین ہے کیا آئنہ خانہ مرے آگے
حیرت یہ ہے کہ میں نظر آیا مرے آگے

ہوں ایک دو عالم ہیں مرے مظہر اسماء
ہر شئی سے عیاں ہے مرا جلوہ مرے آگے

گو عالم پستی میں ہوں، عالم ہے مرا اور
ہے عالم بالا کا تماشا مرے آگے

جس وقت کے مکشوف ہوا سر انا الحق
آیا نہ نظر میں کوئی بندہ مرے آگے

معلوم ہوئے سورۂ اخلاص کے معنی
ہے احمدِ بے میم کا نقشہ مرے آگے

میں ناظر و منظور ہوں، دیدہ ہوں نظر میں
جز میرے نہ مجھ کو کوئی دیکھا مرے آگے

خاکی ہوں ولے مجھ میں سمائی ہے خدائی
ناری ہے وہ جو سر نہ جھکایا مرے آگے

ہوتا نہ وہ مردود ابد عابدِ جاہل
ہیں ایک ہی کعبہ و کلیسا مرے آگے

وہ رندِ سبوکش ہوں کہ تعظیم کو میرے ۔۔۔ گردن ہی جھکا دیتا ہے شیشہ مرے آگے
انساں جسے کہتے ہیں وہ دیدہ ہے خدا کا ۔۔۔ انسان ہی سے مسکیں نہ ہوا بینا مرے آگے(۱۰)

عشق مجازی کا نمونہ ملاحظہ ہو:

رخساروں کو زلفوں میں چھپانا نہیں اچھا ۔۔۔ اسلام پہ کافر کو بڑھانا نہیں اچھا
کسی شمشاد قد پہ جب طبیعت آہی جاتی ہے ۔۔۔ دلِ عاشق پہ اس دم اک قیامت آہی جاتی ہے
ازل سے ہے دل انساں کو عادت عشق بازی کی ۔۔۔ کسی سے آنکھ لڑتے ہی محبت آہی جاتی ہے
دیتا رہا میں ان کو دہائی تمام رات ۔۔۔ منہ پر نہ باتِ وصل کی آئی تمام رات
سانپ زلفوں کے دشمنِ جاں ہیں ۔۔۔ ان کے سرِگان ہیں نیش عقرب کے
آوے چمن میں وہ گلِ خنداں کبھی کبھی ۔۔۔ ولے نہ گل سے بلبلِ شاداں کبھی کبھی
ہرگز چمن میں پھر نہ خزاں منہ دکھائے گی ۔۔۔ لاوے قدم وہ رشکِ گلستاں کبھی کبھی

اس طرح کے اشعار صوفی شعرا منہ کا مزا بدلنے کے لیے کہتے ہیں ورنہ انھیں ذہنی عیاشی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔

حضرت مسکین کے کلام میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ اور طنز کی ملی جلی کیفیت بھی نظر آتی ہے مثلاً:

انقلابِ زمانہ کیا کہیے ۔۔۔ با کمالوں کو در بدر دیکھا
ہے یہ فرمانِ حافظ شیراز ۔۔۔ گردنِ خر میں طوقِ زر دیکھا

رہے گل اشرفی کے پاس جس کے باغ عالم میں
سمجھ لینا کہ بس پوچھے شرافت آہی جاتی ہے

حاسدوں کو تم اپنے اے مسکیں ۔۔۔ مثلِ خوک و شغال و خر دیکھو
کرتے ہیں استخواں فروشی بس ۔۔۔ زادۂ صوفیا ہیں جواب کے
پوچھیں ان سے جو کوئی رمزِ وجود ۔۔۔ کرتے ہیں وہ بیان منصب کے

زبان و بیان اور طرزِ ادا کے اعتبار سے بعض بہترین اشعار ملاحظہ ہوں:

محوِ جمال یار ہو کیا کام غیر سے ۔۔۔ ہرگز نہ اطلاع رہے شر و خیر سے
ہر سمت باغِ دہر میں کثرت کی دھوم ہے ۔۔۔ وحدت ہوئی حصول ہمیں دل کی سیر سے

دولت فخر سے ہیں مالا مال نام مسکین ہے بے نوا ہیں ہم
عبد و رب ظاہر و باطن ہے ترا اے مسکیںؔ گرچہ دو آنکھ ہیں دیدوں کی نظر دونو ایک

حسن کا جب ظہور کرتے ہیں دل عاشق کو طور کرتے ہیں
ہے عرش سے بلند کہیں آستان عشق کہتے ہیں لا مکاں جسے وہ ہے مکان عشق (۱۲)

بہ ہر حال حضرت مسکین اعلیٰ درجہ کے شاعر نہ سہی، مگر اس دور کے شعرا میں آپ کا نام قابل نظرانداز نہیں ہے۔ بالخصوص آپ "شرح من لگن" کی وجہ سے ناقابل فراموش بن گئے ہیں۔ آپ کے تلامذہ اور معتقدین کی تعداد کافی تھی۔ جن میں علما اور شعرا دونوں طبقے داخل تھے۔یہاں آپ کے ایک مرید و شاگرد کا کلام پیش کیا جارہا ہے جن کا نام جناب حاجی غلام محی الدین قہرانی اور تخلص دین تھا۔ دین نے حضرت مسکین سے باقاعدہ اکتساب فن کیا تھا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

یاد آتا ہے مہہ جمال اپنا اب ٹھکانے نہیں خیال اپنا
باغ امید کی ہے دونی بہار آرہا ہے وہ نو نہال اپنا
داور حشر کیوں نہ بخشے گا رنگ لائے گا انفعال اپنا
دین بے مثل عاشقوں میں ہیں ہے جو معشوق بے مثال اپنا (۱۳)

حواشی

(۱) تذکرۂ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ص ۱۴۷ از محمد سخاوت مرزا صاحب مطبوعہ ۱۹۶۲ حیدرآباد

(۲) حیات المسکین مؤلفہ مولانا محمد عبدالسلام حسینی شاہ نظامی حیدرآبادی بہ حوالہ سال نامہ اللطیف ۱۴۰۰ھ ص ۵۳ مقالہ نگار ڈاکٹر سید صفی اللہ

(۳) اللطیف اقطاب ویلور نمبر ص ۸۷ مطبوعہ ۱۴۰۲ھ

(۴) دیوان مسکین ص ۱۶۸ مطبوعہ ۱۳۴۳ھ م ۱۹۲۴ء در شہر مدراس

(۵) عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۵۱۲ مطبوعہ ۱۳۹۴ھ م ۱۹۷۴ء مدراس

(۶) عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۵۱۰ مطبوعہ ۱۳۹۴ھ م ۱۹۷۴ء مدراس

(۷) عارف باللہ قاضی سید محمود بحری قدس سرہ، اور ان کی تصنیفات از جناب سخاوت مرزا ص ۲۵ مطبوعہ نوائے ادب بمبئی بابت جولائی ۱۹۵۵ء۔

حضرت سید شاہ حسین قادری نلوری پیر سید شاہ عبد القادر نلوری کا سلسلہ۔ نسب امام جعفر صادقؓ سے ملتا ہے۔ آپ ۱۲۱۶ھ میں نلور سے مدراس تشریف لائے اور شرف الامراء کے توسط سے نواب عظیم الدولہ کے ملازم ہوگئے۔ تھوڑی ہی مدت میں نواب کی مصاحبت سے اکتاگئے اور عزلت نشینی میں ساری زندگی گزاردی، "تذکرۂ گلزار اعظم" میں آپ کا تذکرہ موجود ہے۔ آپ کے اولاد واحفاد میں مشہور شاعر، ادیب جناب محرم راز امتیاز صاحب اکزی کیوٹیو ایڈیٹر روزنامہ "پاسبان" بنگلور قابل ذکر ہیں۔

(۹) شرح "من لگن" از حضرت مسکین ص ص ا و ص ۳

(۱۰) دیوان مسکین ص ۱۲۸

(۱۱) ایضاً ص ۱۲۸

(۱۲) تمام اشعار مطبوعہ "دیوان مسکین" سے لئے گئے ہیں

(۱۳) ماہ نامہ "عروج خیال" ص ۶ بابت ماہ ڈسمبر ۱۹۱۱ء مدیر محمد احمد محی الدین دلوی شہرت مطبوعہ رزاقیہ پریس مدراس

حضرت مولانا سید شہاب الدین شہاب

حضرت شہاب معروف بہ حسن بادشاہ ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء میں بہ مقام ویلور دارالسرور پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید عبداللہ شاہ صاحب قادری عرف بڈھن صاحبؒ اور جد امجد کا نام نامی حضرت سید محی الدین شاہ صاحب قدس سرہ ہے۔ حضرت شہاب کے مورث اعلیٰ حضرت سید فتح اللہ شاہ قادریؒ ابن سید محی الدین قادری بغدادیؒ اپنے آبائی وطن بغداد شریف سے ہجرت کرکے کاروار (صوبہ۔ کرناٹک کی بندرگاہ انکولہ تشریف لائے جہاں آپ نے رشد و ہدایت کی ایسی شمعیں روشن کیں کہ جن کی ضوفشانی سے اطراف و اکناف کے علاقے بقعہ۔ نور بن گئے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سبھی آپ کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ حضرت فتح اللہ قادریؒ کے دو صاحب زادے تھے۔ بڑے صاحب زادے سید شاہ قاسم قادری انکولہ سے جزائر لکادیپ بہ غرض تبلیغ دین و اشاعت اسلام ہجرت کرگئے۔ بہ قول ڈاکٹر حبیب النساء بیگم "اس وقت وہاں کوئی مسلمان نہ تھا، ان کے فیوض و برکات سے ان چھپے جزائر میں اسلام پھیلا" (۱)۔

حضرت فتح اللہ قادری کے دوسرے فرزند سید شاہ محی الدین قادریؒ نے بھی اپنے بھائی کی طرح انکولہ کو خیرباد کہا اور سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے "کیسر مٹر گو" (علاقہ۔ ٹمکور) پہنچے اور وہیں خدمتِ دین میں لگ گئے۔ وہ زمانہ نواب حیدر علی خاں (متوفی ۱۷۸۲ء) بانیِ سلطنت خداداد کے اقتدار کا زمانہ تھا، جب نواب حیدر علی نے آپ کے تقدس و ولایت کے چرچے سنے تو آپ کی خدمت میں پہنچ کر بصد احترام اپنے پایہ تخت "سری رنگ پٹن" آنے کی دعوت دی۔ حضرت سید محی الدین شاہ قادری نے نواب کی دعوت کو شرف قبولیت بخشا اور پٹن تشریف لے گئے جہاں آپ کو جاگیر اور انعامات سے نوازا گیا، نواب حیدر علی خاں کی وفات ۱۷۸۲ء کے بعد جب حضرت ٹیپو سلطانؒ مسند آرائے تخت شاہی ہوئے تو سلطان نے مع افراد خاندان حضرت سید محی الدین شاہ قادری کے دست حق پرست پر بیعت کی (۲)۔ شہادت سلطان ۱۷۹۹ء کے

بعد پس ماندگانِ شہید کو ویلور روانہ کیا گیا تو انھوں نے اپنے مرشد کو بھی اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ حضرت سید محی الدین شاہ قادری کچھ عرصہ ویلور میں گزار کر ۱۲۴۰ھ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے (۳)۔ آپ کی نرینہ اولاد میں تین کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سب سے بڑے فرزند حضرت سید عبداللہ شاہ قادری معروف بہ بڈھن صاحب کے لختِ جگر و نورِ نظر آگے چل کر حضرت سراج العلما الحاج مولانا سید شاہ شہاب الدین قادری متخلص بہ شہاب ویلوری علاقہ، کرناٹک میں معروف و مشہور ہوئے۔ حضرت شہاب کی ابتدائی کی تعلیم "حضرت مکان ویلور" میں ہوئی۔ علوم متداولہ کی تکمیل کے لیے آپ نے مدراس کا رخ کیا۔ وہاں عالم متبحر، فخر الاماثل حضرت غلام قادر مدراسی (متوفی ۱۲۹۳ھ) ابن محمد فاخر گوپاموی مصنف صراط الاسلام و ضوابط، فرقان و کلمات صوفیہ وغیرہ صحنِ مسجد والاجاہی (ترمل گھڑی Triphiane) مسند درج بچھائے ہوئے تھے۔ تشنگانِ علومِ اسلامیہ دور دراز علاقوں سے حاضر ہو کر اس چشمہ فیض بخش سے سیراب ہوتے تھے۔ چناں چہ حضرت شہاب نے بھی ایک مدت تک اسی باغ علم و فضل سے خوشہ چینی کی۔ بعد ازاں مدراس سے اپنے وطنِ عزیز ویلور دارالسرور لوٹ آئے۔ یہ بات ممکن ہے کہ قیام مدراس کے دوران آپ کے ہم جلیسوں میں شاہ عبدالوہاب قادری بانیِ مدرسہ۔ باقیات صالحات ویلور (۱۲۴۷ - ۱۳۳۷ھ) اور سید شاہ مراد علی عرف علی مراد شاہ بخاری قادری افضل کڈپوی (۱۲۴۹ - ۱۳۱۰ھ) بھی رہے ہوں اس لیے کہ مذکورۃ الصدر دونوں افاضل حضرت علامہ غلام قدر قادری مدراسی قدس سرہ سے اکتساب علم و فضل کیا تھا (۴)۔

بہ ہر حال حضرت شہاب ویلوری علوم ظاہرہ سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ویلور لوٹ آئے تو ان کے باطن کی پیاس سوا ہو گئی تھی۔ علم و عمل سب کچھ ٹھیک تھا مگر مئے دو آتشہ کے لیے ایک آنچ کی کسر باقی تھی۔ آپ نے ضمیر کی آواز کو پہچانا دلی مراد پانے کے لیے اپنی مادر علمی اور خانقاہ اقطاب ویلور میں حاضری دی اور حضرت سید شاہ محی الدین عبداللطیف قادری نقوی ویلوری کے دست حق پرست پر بیعت کی،

بعد ازاں ۱۴/ شعبان ۱۲۸۶ھ کو خرقہ، خلافت و سند اجازت سے مشرف و سرفراز ہوئے (۵)۔

حضرت شہاب الدین ایک مدت تک ویلور میں قیام پذیر ہونے کے بعد اپنے اجداد کی جائیداد اور مکان و مسند کے تحفظ کے لیے سری رنگ پٹن روانہ ہوئے پھر وہاں سے مستقل طور پر شہر میسور منتقل ہوگئے۔ آپ نے دو شادیاں کیں، آپ کی پہلی زوجہ عزت النسا بنت سید شاہ محمد قادر (جو آپ کے حقیقی چچا تھے) سے چھ اولاد ہوئیں۔ ان سب میں معین الوزارت سید شاہ عبدالرزاق قادری معروف بہ تاج پیراں سابق انسپکٹر جنرل آف پولیس ریاست میسور نامور گزرے ہیں۔ حضرت تاج پیراں مرحوم جناب سید صداقت پیراں جنرل سکریٹری الامین ایجوکیشنل ٹرسٹ، بنگلور کے جدِ اعلیٰ ہوتے ہیں۔ حضرت شہاب کی دوسری اہلیہ سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

حضرت شہاب عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مہارت نامہ رکھتے تھے۔ آپ نے فارسی میں "گل دستہ، توحید اربعہ" نامی رسالہ لکھا جو علم تصوف میں تقریباً ۷۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۸۲ھ میں مولانا مولوی حبیب اللہ باقوی ندوی کے ترجمہ و شرح کے ساتھ بنگلور سے شائع ہوا، اس رسالہ کے علاوہ آپ کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چل سکا۔ حضرت شہاب فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری پر قادر تھے۔ موزونیت طبع بلا کی تھی۔ کلام میں سلاست و صفائی پائی جاتی ہے، نکتہ سنجی اور معنیٰ آفرینی کی اچھی مثالیں آپ کے اشعار میں مل جاتی ہیں۔ زبان و بیان اور محاورہ کی پاس داری کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ آپ کے بعض اشعار کو لے کر شہر میسور کے چند ناعاقبت اندیش لوگوں نے بڑا فتنہ مچایا، آپ کے خلاف خوب پراپگنڈا کیا گیا یہاں تک کہ کفر کا فتویٰ بھی صادر ہوا۔ حکومت وقت نے اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے مدرسہ، باقیات صالحات ویلور سے علمائے محققین کا ایک وفد طلب کیا جس کے صدر شیخ المناظرین حضرت مولانا مولوی غلام محی الدین صاحب باقوی تھے اور اراکین میں خاں بہادر مولانا مولوی الحاج ابوالفضل ضیاالدین محمد باقوی خلف

الصدق بانی باقیات صالحات اور شیخ المعقولات شمس العلما حضرت مولانا مولوی الحاج عبد الجبار صاحب باقوی تھے (۶)۔ ماہرین کے اس وفد نے دونوں کے دلائل و شواہد کو بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد حضرت شہاب کو تمام الزامات سے بری قرار دے دیا۔ اس کیس کی تحقیق کرنے والے انگریز مجسٹریٹ مسٹر ویڈرال (Widral) نے ۱۳۱۴ھ میں آپ کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے ملزموں پر فردِ جرم عائد کیا اور ان سے فی شخص ایک سو روپیے سکہ، رائج الوقت بہ طور جرمانہ وصول کیا (۷)۔ اس واقعہ کے بعد مہاراجہ میسور کرشنا راج اوڈیار نے آپ کو سالانہ دسہرا کے دربار جشنِ شاہی میں "سراج العلما" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

آپ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

خوب ہوجائے گا سودا حشر کے بازار کا
جنس عصیاں پر ملی نقدِ بہائے مغفرت

ہست مطلق ہے مقید کے ہے کاشانے میں کون
آپ ہے گرابرِ نیساں میں تو دردانے میں کون
سیر باطن کی اسی نظارۂ ظاہر میں ہے
دل اگر خم خانہ ہے آنکھوں کے پیمانے میں کون
بزمِ کثرت میں ہے وصلِ شاہدِ وحدت شہاب
غیر آبادی میں رہتا ہے تو ویرانے میں کون (۸)

پتہ بتاؤں نشیمن کا کیا میں خانہ خراب
ہے اب تو ہاتھ مرا، میرا آشیاں صیاد (۹)

ہاتھ میرے نہ پہنچی وہ یہ پہنچاتا گوش
ہوا نالے کا گذر زلفِ رسا سے پہلے

مانندِ بید خم ہے نہالِ چمن کی شاخ
پیوند شاید اس سے ہے مجنوں کے بن کی شاخ

مانگی جو مشک زلف، دیا خال گال نے
یہ سوال شام عجب اور جواب صبح

شعر لکھنے سے ضعیفی ہے جوانی میں شہاب
دستگیری ہوئی خامے کی عصا سے پہلے

قدِ جاناں کے تصور کو شہاب ناتوانی میں عصا کرتے ہیں
مل گیا گرفتاری کا بدلہ الٹا کاندھے پہ زخم کی زنجیر لیے پھرتے ہیں
ناتواں مرغِ نظر مژگاں سے بڑھ سکتا نہیں مانع پرواز یہ خارِ سرِ دیوار ہیں

حضرت شہاب نے مساوات اور قومی یکجہتی پر بھی عمدہ اشعار کہے ہیں ۔ جس سے آپ کا صلحِ کل والا صوفیانہ مزاج مترشح ہوتا ہے، مثال ملاحظہ ہوں:

بنی آدم ہیں باہم مرد وزن سب نہیں انسانیت میں فرقِ مذہب
مسلماں ، عیسوی ، ہندو سب اقوام جدا مذہب ہے پر انسان ہے نام(۱۰)

آپ کا وصال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں شہر بنگلور میں ہوا۔ محمود خاں محمود مارسٹن نے لاجواب قطعہ ۔ تاریخ کہا تھا، جس کا آخری شعر یہ ہے:

مضطرب محمود سالِ انتقالش حسبِ حال
" مولوی سید شہاب الدین مکینِ خلد " گفت

حواشی

(۱) ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما ص ۲۲۷
(۲) ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما ص ۲۲۷
(۳) ایضاً
(۴) کڑپہ میں اردو ص ۹۲ از راہی فدائی
(۵) شجرۂ کلمات طیبہ شرح گل دستہ۔ توحید اربعہ ص ۱۴ از مولانا مولوی ابو لکمال محمد حبیب اللہ قادری باقوی ندوی مطبوعہ ۱۳۸۲ھ مطبع کوثر برقی بنگلور
(۶) شجرۂ کلمات طیبہ شرح و ترجمہ گل دستہ۔ توحید اربعہ ص ۲۹
(۷) ایضاً ص ۲۹
(۸) ایضاً ص ۲۳-۲۲ھ ۱۳
(۹) میسور میں اردو ص ۳۴
(۱۰) ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما ص ۲۳۰

مولانا محمد قلندر حسین اطہر

مولانا اطہر بنگلور کے متوطن تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، بعد ازاں آپ نے ویلور کا رخ کیا، حضرت سید شاہ عبد اللطیف معروف بہ قطب ویلور کے خانقاہی مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ علوم متداولہ سے فراغت کے بعد حضرت قطب ویلور قدس سرہ کی اجازت پاکر بنگلور آئے اور یہاں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی، اس مدرسہ کا کوئی خاص نام نہیں رکھا گیا تھا۔ پس جو بھی تشنگان علم و فضل آئے ان کی سیرابی اس چشمہ فیض بخش سے ہوجاتی تھی۔ مولانا اطہر کو حضرت شاہ عبد الحیؒ واعظ احقر بنگلوری سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ حضرت احقر کی بہت ساری کتابوں پر مولانا اطہر کے مقدمے اور تقاریظ ملتے ہیں جن میں احقر کی تصنیفات کے تعارف کے علاوہ مختصر سوانح اور توصیف موجود ہے۔ اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ مولانا اطہر کا تعلق حضرت احقر کے ساتھ بیعت و ارشاد کا بھی رہا ہوگا۔ ہمارے اس قیاس کے لیے بہ طور دلیل مولانا اطہر کے وہ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جو حضرت احقر کی معرکہ آرا تصنیف "جنان السیر" کی تقریظ میں شامل ہیں۔ اطہر کہتے ہیں:

پیر روشن ضمیر عبد الحیؒ ہادیِ دستگیر عبد الحیؒ
سب تفاسیر کا وہ مجمع ہے اور احادیث کا وہ مرجع ہے
وعظ قرآں شروع اگر وہ کرے ملا اعلیٰ درود پڑھنے لگے
جس کو فاروق دیں پناہ لکھا اطہر ان کو پھر تو کیا سمجھا

دیباچہ، فیض الباری شرح بخاری میں اس طرح رقم طراز ہیں:

وہ بہر وعظ جان کرسی نشیں ہو زمیں ان کی سپہر ہفتگیں ہو
یہ اس کو وعظ میں شانِ علیٰ ہے کہ گویا فیض روح القدس کا ہے
اگر روح القدس دنیا میں پیدا جو ہوتا آپ کی صورت میں ہوتا

دیباچہ، جواہر التفسیر از شاہ عبد الحیؒ احقر میں جناب اطہر حضرت احقر کی شان میں یوں رطب اللسان ہیں:

کیا کہوں کیا وہ منہ سے بولے ہے — درِ مکنوں صدف سے رولے ہے
انجمن میں وہ جب کہ در آیا — ایک دو لاکھ میں نظر آیا
صدر ہے یا خزینۂ اسرار — جس سے نکلے ہے لو لو شہوار

مولانا اطہر کا شمار اس وقت کے متبحر علما و جید فضلا میں ہوتا تھا۔ آپ ایک بلند پایہ شاعر ایک قابلِ قدر انشاپرداز تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دفتر "قاسم الاخبار" کے ماہانہ مشاعروں میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔ شاعری میں آپ کو استاذی کا درجہ حاصل تھا۔ مولانا اطہر کے کلام کا مجموعہ "مخمسات و قصائدِ اطہر" کے نام سے ۱۲۹۲ھ میں بنگلور سے طبع ہوا۔ اس مجموعہ پر تقریظ لکھتے ہوئے ایک ہم عصر فاضلِ یگانہ مولانا عبدالحق تحقیق (متوفی ۱۹۰۰ء مطابق ۱۳۱۸ھ) منظوم خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

جب گلستاں میں غزل خوانی کو آتا ہے یہ — تو عنادل سے عنادل کو بھلاتا ہے یہ
جوہر مانی ہے تصویر سخن میں اس کی — آئنہ دارِ معانی، سخن ارا ہے یہ
نغز گوئی میں ہے غالب تو سخن میں سیفی — میر بندش میں ہے مضمون میں سودا ہے یہ
دہنِ یار کو نقطے سے تناسب کیا ہے — شاعرو! پوچھو اسی سے کہ معما ہے یہ
بے شعوروں کے تغافل پہ نہیں مجھ کو گلہ — شعراء جانتے ہیں شاعر یکتا ہے یہ
اس کو تنکر ہے اربابِ دول سے تحقیق — گر نہ تعریف کروں اس کو تو بیجا ہے یہ (۲)

مولانا اطہر کے کلام کی ایک بیاض کتب خانۂ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ اس بیاض میں حضرت قطب ویلوری کے طویل مرثیہ کے علاوہ پندرہ سے زیادہ طویل نظمیں موجود ہیں، بہ قول مرتبِ فہرست ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور:

"وہ اچھے پایہ کے شاعر تھے، زبان پر قدرت تھی اور طبیعت میں روانی افسوس ہے کہ اتنے باکمال شاعر ہونے کے باوجود شہرت نصیب نہ ہوئی اور ہم ان کے حالات اور کلام سے اب تک ناواقف ہیں" (۳)

مولانا اطہر کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو: ۔ نعتیہ غزل

کیا مزہ روئے زیبا ہے رسول اللہ کا — خود خدائے پاک شیدا ہے رسول اللہ کا
کیا نبوت، کیا ولایت، کیا فقیری، خسروی — صدقہ یہ ہر ہر کو پہنچا ہے رسول اللہ کا

کون ہے وہ جو نہ شیدا ہے رسول اللہ کا — رو دیا جن کے تعشق میں ستونِ تکیہ گاہ
بخشوائیں گے بھروسہ ہے رسول اللہ کا — آتشِ دوزخ سے اطہر عاصیوں کو حشر میں

یہ کلام ۲۲/ نومبر ۱۸۷۶ء کے مجلہ "منشورِ محمدی" میں شائع ہوا تھا۔

ایک اور نعتیہ غزل پیش کی جا رہی ہے جو "منشورِ محمدی" شمارہ ۲/ دسمبر ۱۸۷۶ء کی زینت بنی تھی۔

ازل سے بخت ہے یاور ہمارا — محمدؐ ہے جو پیغمبر ہمارا
ہے رخشاں اوج پر اختر ہمارا — کہ نورِ حق ہے پیغمبر ہمارا
نشانِ آتشِ عشقِ نبیؐ ہے — وجود مشت خاکستر ہمارا
لکھا ہے رفع دیوانی کی خاطر — جو شعرِ نعتیہ اطہر ہمارا (۴)

سرو بستانِ اصطفا ہے وہ — ناز پروردۂ خدا ہے وہ
مرسلِ خاصِ کبریا ہے وہ — بندہ ہے نیک با خدا ہے وہ
مومنو! اس کی ناؤ چلتی ہے — بحرِ رحمت میں ناخدا ہے وہ
سر کے بل چاہیئے وہاں جانا — زائرو! تم کو دیکھتا ہے وہ (۵)

ایک مخمس کے چند بند ملاحظہ ہوں:

تم میرے نبیؐ ہو یا محمدؐ — تم مطلبی ہو یا محمدؐ
شاہ عربی ہو یا محمدؐ — امی لقبی ہو یا محمدؐ
عالی نسبی ہو یا محمدؐ — والا حسبی ہو یا محمدؐ
کیا منہ ہے مرا کہ نام لوں میں
کیا تم کو کہوں میں کیا کہوں میں

اس بے سروپا کو آسرا دو — یثرب کی راہ پر لگا دو
جلوہ مجھے آپؐ کا دکھا دو — چہرے سے نقاب کو اٹھا دو
مرجاؤں میں آپؐ پر رضا دو — مدفن کو قدم کے نیچے جا دو
فرمائیں تو دوڑتا میں آؤں
میں آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں

(۶)

آخر میں عشقیہ۔ مخمس کا ایک بند نمونتاً درج کیا جارہا ہے:

صورت میں گرچہ گل سے ہیں پھولے پھلے ہوئے　　معنی میں مثل لالہ کہ ہم دل جلے ہوئے
تاب و نموزِ عشق سے تیغ سا گلے ہوئے　　تج تج کے آب ودانہ قفس میں چلے ہوئے
صیاد سے اجل کے ہیں رہتے ملے ہوئے (۷)

مولانا اطہر کے ایک صاحب زادے مولانا محمد تفضل حسین کا پتہ چلتا ہے، جن سے قاضی خلیل شاگردِ اطہر کے برادرانہ مراسم تھے (۸)۔

مولانا اطہر کے نامور شاگردوں میں محمد علی فاضل، محمد حسین شریف حکمی اور محمد عبداللہ حسین خلیل قابل ذکر ہیں۔

مولانا فاضل بعد میں چلکر عالم با عمل بنے اور ادیب و شاعر کی حیثیت سے بڑا نام کمایا۔ تاحیات تعلیم وتدریس میں مشغول رہے۔

مولانا حکیم حکمی فارسی کے نہ صرف جید عالم ہوئے بلکہ فارسی کے قواعد، اصول اور محاورات کی تحقیق پر مشتمل ایک معرکہ۔ آرا کتاب " دستور نامہ۔ فارسی " لکھی، وہ اس قدر معیاری اور بلند پایہ ہے کہ علامہ شبلی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی خوب تعریف و توصیف فرمائی، مولانا شبلی نے لکھا:

میں نے جناب مولوی حسین شریف صاحب کی کتاب " دستور نامہ۔ فارسی " اکثر جگہ سے بہ غور دیکھی، کوئی شبہہ نہیں کہ یہ کتاب معرکہ آرا کتاب ہے، مصنف نے مشکل اور اہم مسائل کو بڑی بسط اور تنقید سے لکھا ہے۔ بہت سے اصول اور قواعد خود بھی ایجاد کیے ہیں۔ مصنفین سابق سے جا بہ جا اختلاف بھی کیا ہے اور وہاں بہت زور طبع دکھایا ہے۔ اس قدر ہے کہ یہ کتاب بہ وجہ دقت مضامین کے منتہیوں کے قابل ہے۔ تشبیہ کی بحث اس میں اسطراداً موضوع سے خارج آگئی ہے۔ بہ ہرحال یہ کتاب ہر طرح قدردانی کی مستحق ہے"۔

شبلی نعمانی (۹)

۱۷/ فروری ۱۹۰۴ء

حضرت اطہر کے تیسرے نامور شاگرد جو آپ کے قریب بھی تھے اور آپ کو بہت عزیز بھی رکھتے تھے۔ مولانا قاضی محمد عبد اللہ حسین خلیل تھے۔ قاضی شعر و ادب اور تصنیف و تالیف میں علاقہ۔ کرناٹک میں کافی معروف و مقبول ہوئے۔ ۱۲۹۶ھ میں جب مولانا اطہر کا وصال ہوا تو قاضی خلیل نے "طومار غم" ۔ ۱۲۹۲ھ کے نام سے ایک تعزیتی مضمون لکھا، جس میں اکاسی ترکیبیں استعمال کی گئیں (۱۰)۔ ہر ترکیب سے سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ قاضی موصوف نے فن جمل (تاریخ گوئی) اپنے استاذ مولانا اطہر ہی سے سیکھا ہو، یہ اس لیے کہ مولانا اطہر کو شاعری کی طرح تاریخ گوئی میں بھی یہ طولیٰ حاصل تھا، آپ نے دوست واحباب کے لیے عمدہ اور نفیس بامعنی تاریخی مادے برآمد کیے۔ مثال کے لیے حضرت احقر کی گراں قدر تصنیف مثنوی "چہار گلشن" کی طبع اول کا تاریخی قطعہ پیش کیا جارہا ہے جس کو مولانا اطہر نے بڑی عمدگی اور سادگی کے ساتھ زیب قرطاس کیا:

جس دم چہار گلشن تصنیف کر چکا ہے — شاہ جنود علماء استاد علم و ہرفن
کرتے ہیں سیر قدسی جس میں، کہا یہ ہاتف — ہے یہ چہار گلشن، ہے یہ چہار گلشن (۱۱)

۱۲۷۸ھ

حواشی

(۱) نواب مولانا محمد فاروق الملقب بہ خاں عالم خاں مدراسی خلیفہ۔ حضرت مولانا سید محمد علی رامپوریؒ۔ خاں عالم خاں کو حضرت قطبؒ ویلور سے بھی خاص عقیدت تھی اور آپ کی کفش برداری بھی کی۔ خاں موصوف شاہ صاحب کی بڑی قدر کرتے تھے (وفات نامہ۔ قطب زمان ویلور ص ۱۵ از۔ مولانا منشی محمد قلندر حسین اطہر بنگوری مطبوعہ ۱۲۹۰ھ در نظام المطابع)

(۲) نیر اعظم ص ۱۵ از سید احمد اڈوکیٹ بنگلور مطبوعہ ۱۹۸۲ء کرناٹک اردو اکاڈمی (بنگلو

(۳) تذکرہ مخطوطات جلد پنجم ص ۱۹۳ مطبوعہ ۱۹۸۴ء ترقی اردو بیورو۔ دہلی

(۴) ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما ص ۲۰۳ از ڈاکٹر حبیب النساء بیگم

(۵) میسور میں اردو ص ۳۰ از محمد سعید عبد الخالق (عثمانیہ) مطبوعہ ۱۹۴۲ء حیدر آباد

(٦) "میسور میں اردو" ص ۲۵۳ مولوی محمد خاں (مخطوطہ)

(۷) تذکرۂ مخطوطات حصہ پنجم ص ۱۹۳

(۸) نیر اعظم ص ۱٦

(۹) ریاست میسور میں اردو جلد اول حصہ اول و دوم ص ۱۷٦ مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون و مولوی محمد خاں مطبوعہ ۱۹٦۰ء مہارانی کالج میسور

(۱۰) ریاست میسور میں اردو جلد اول حصہ اول و دوم ص ۱۷۵ مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون و مولوی محمد خاں مطبوعہ ۱۹٦۰ء مہارانی کالج میسور

(۱۱) چہار گلشن ص ۲ تقریظ حضرت اطہر بنگلوری

قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل بنگلوری

قاضی خلیل کے والدِ ماجد مولانا قاضی اکبر حسین خلیل اور ان کے والد مولانا محمد عظیم الدین خلیل سلطنتِ خداداد سری رنگ پٹن کے استاذ شہیر تھے، اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ مولانا خلیل اللہ فقیہہ خلف الصدق مولانا داوٗد فقیہہ کو شاہ عالم بادشاہ غازی (۱۷۵۴-۱۸۰۶ء) نے خلیل السلام کا خطاب عطا کیا تھا (۱)۔ بعد کو قاضی خلیل کے جدِ اعلیٰ نے لفظ "فقیہہ" کو ترک کر کے "خطابِ خلیل ہی" کو اپنے نام کا جزء بنا لیا تھا، اسی جزء کو قاضی خلیل نے اپنا تخلص قرار دے دیا (۲)۔ قاضی خلیل کی ولادت ۱۲۷۱ھ بہ مقام مکان حضرت قطب ویلورؒ ہوئی، والد صاحب نے "نیرِ اعظم" ۱۲۷۱ھ سے تاریخِ پیدائش کا استخراج کیا، ابتدائی تعلیم مدرسہ لطیفیہ ویلور میں ہوئی۔ حضرت قطب ویلور کے سایہ عاطفت میں آپ کی تربیت ہوتی رہی۔ خانقاہی ماحول، مدرسہ کے شب و روز اور فضلائے وقت کی صحبت میں قاضی خلیل کی فطری صلاحتیں پروان چڑھیں جودتِ طبع کی وجہ سے آپ بڑی سرعت سے منزلِ علم و فضل کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ مدرسہ لطیفیہ کی تعلیم باقی ہی تھی کہ آپ کے والد ویلور سے بنگلور منتقل ہوگئے تو آپ کو بھی مجبوراً والد کے ہمراہ جانا پڑا، ویلور سے رخصتی کے وقت قطب ویلور نے قاضی خلیل کو تعلیم جاری رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے مدرسہ لطیفیہ ہی کے فیض یافتہ مولانا قلندر حسین اطہر کے حلقہ درس میں داخل ہوے اور ان سے بھرپور استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔ قاضی خلیل نے اپنے بزرگ کے مشورہ دل و جان سے مان کر اس پر عمل کیا۔ آپ اپنے استاذ محترم کے واصل بہ حق ہونے تک نہ صرف علوم متداولہ سے فارغ ہوگئے بلکہ شعر و سخن میں بھی ماہر و کامل بن گئے۔ آپ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ چناں چہ سب سے پہلے ۱۳۰۰ھ میں "بستان خلیل" (۲) کے نام سے فارسی میں پند و نصائح پر مشتمل ایک منظوم رسالہ لکھا جو مطبع نامی نول کشور لکھنو سے شائع ہوا۔ اپنی پہلی تصنیف کے ٹھیک بارہ سال بعد ۱۳۱۲ھ میں

آپ نے اپنی دل چسپ کتاب "لطائف الشعرا" کے نام سے تالیف کی جو تاحال شائع نہ ہوسکی۔ یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔ قاضی خلیل کا اہم کارنامہ میر حسین علی کرمانی حاکم ولد میر عبدالقادر کرمانی میر منشی و مصاحب خاص نواب حیدر علی و ٹیپو سلطانؒ کی شہرۂ آفاق تاریخی کتاب "نشان حیدری" کا فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب کا نام "نزھتہ الاعیان" رکھا جو ۶×۸ کی تقطیع کے ۵۶۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے (۳)۔ اس کے علاوہ آپ نے حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوریؒ (متوفی ۱۱۸۲ھ کی تصنیف رسالہ "میزان العقائد" کا ۱۳۳۱ھ میں ترجمہ کیا، یہ کتاب مطبع شوکت الاسلام معسکر بنگلور سے شائع ہوچکی ہے۔ آپ کا ایک اور کارنامہ "مظہر المحاسن ترجمہ۔ بستان الجن" ہے۔ بستان الجن دراصل "آدکام المرجان فی احکام الجان" عربی کا فارسی ترجمہ ہے۔ "مظہر المحاسن" ۱۳۳۵ھ میں معرض وجود میں آئی (۴) اور تاحال زیور طباعت سے محروم ہے۔ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ "رسالہء منتخب الاعداد (غیر مطبوعہ) رسالہء تحویل اوزان (غیر مطبوعہ)، رسالہء قوۃ الاسلام (مطبوعہ) اور حکایات لطیف (اردو) رسالہء قواعد اردو قابل ذکر ہیں۔

آپ نے اپنی ساری زندگی تعلیم وتدریس میں گزاردی۔ پڑھنے پڑھانے کے بعد جو بھی وقت گزرتا تصنیف و تالیف اور شعر و سخن میں صرف ہوجاتا تھا۔ آپ نے اپنے مکتوب مؤرخہ ۳/ محرم الحرام ۱۳۴۹ھ بہ نام محاسب جنگ بہادر میں لکھا ہے کہ:

> احقر کی عمر کے تقریباً پچاس سال مسلمان اطفال کی تعلیم وتدریس میں صرف ہوئے۔ ازاں جملہ مدرسہء اسلامیہ اور مدرسہء قوۃ الاسلام کی صدر مدرسی پر سینتیس سال مامور رہا، جب ان مدرسوں کی خدمت سے دست بردار ہوچکا تو اپنے غریب خانے پر تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب کچھ عرصے سے بہ وجہ ضعف پیری و عوارض جسمانی خدمت طلباء سے معذور ہوں"

آپ کثیر العیال تھے، آپ کے آٹھ بیٹوں اور ایک بیٹی کی تفصیل سید احمد اڈوکیٹ نے

اپنی کتاب " نیر اعظم میں دی ہے۔آپ کی وفات ۸۱ سال کی عمر میں ۱۸/ جمادی الآخر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو شہر بنگلور میں ہوئی۔
قاضی خلیل صاحب کو شعر و شاعری میں ملکہ حاصل تھا۔آپ کے یارِ غار مولانا حکمی خود اچھے شاعر ہونے کے باوجود آپ سے اصلاح لیتے تھے اور آپ کی ژرف نگاہی کی داد دیتے تھے۔آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔اردو شاعری میں علامہ اقبال اور مولانا حالی کے اثرات نمایاں ہیں، " مسدس حالی " کے طرز پر تحریر کردہ " مسدس قومی " اور تخمیس بر کلام علامہ اقبال مذکورہ دعوے کی دلیل ہیں۔آپ کے نعتیہ اور غزلیہ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

جب کہ وہ ماہِ مدینہ جلوہ گر ہوجائے گا — گوشہء مرقد مرا برجِ قمر ہوجائے گا
لطف خلاقِ دو عالم بھی ادھر ہوجائے گا — آپؐ کا جس سمت محشر میں گزر ہوجائے گا
سر کے بل جاؤں گا میں سوئے مدینہ اے طبیب — بس اسی سے کچھ علاج دردِ سر ہوجائے گا
سرفرازانِ جہاں چومیں گے آکے اس کا پاؤں — آستانے پر ترے خم جس کا سر ہوجائے گا
یاد صحرائے مدینہ آئے گا جب اے خلیل — گلشنِ فردوس گلخن سے بدتر ہوجائے گا

کس کو نہیں ہے آپ کی رنگیں ادا پسند — کیوں کر نہ بلبلوں کو ہو گل کی ہوا پسند
حاضر تھا خونِ عاشقِ جاں باز بھی مگر — قسمت ہماری دیکھیے، آئی حنا پسند
خلخالِ زیبِ پا کیے وہ رشکِ حور بھی — زنجیرِ پا کی میری جو آئی صدا پسند

یہ نہ سمجھا کہ پھنسنے پر نہ نکلنا ہوگا — طائرِ دل نے خمِ زلف کو مسکن سمجھا
دہنِ یار میں ناگاہ جو دیکھا سرِ زلف — خانہء مور میں میں مار کا مسکن سمجھا

چھائی ہوئی ہے سر پر فلاکت کی وہ گھٹا — دریوزہ گر ہیں قوم کے اشراف جا بہ جا
دس بیس کا ہی ذکر ہے کیا سیکڑوں گدا — پیر وجوان و طفل ہیں عوراتِ پارسا
بے امتیاز قوم ، دکان و مکان پر
ذلت سے بھیگ مانگتے پھرتے ہیں در بدر
دعوے تو ہیں شرافتِ آبا کے بے حساب — کہتے ہیں پہنچتا ہے نسب تا بہ بو تراب

سلطاں نواز جنگ یہ دادا کا تھا خطاب   والد تھے عہد ہائے جلیلہ پہ کامیاب
ملتا ہے سلسلہ حسن و بو سعید سے
رشتہ ہے اپنا حیدر و ٹیپو شہید سے
ماں باپ اس جہان سے جب چل بسے تو ہم   بے یار و بے مکان تھے بے نان و بے درم
خویشی کو ترک کردیا خویشوں نے اک قلم   جن پر تھے والدین کے الطاف اور کرم
یاروں نے دوستی کو کیا دور سے سلام
ہم بیکسا نہ رہ گئے بد بخت والسلام

(۵)

حواشی

(۱) ریاست میسور میں اردو ص ۱۷۴ از ڈاکٹر آمنہ خاتون و مولوی محمد خاں

(۲) نیر اعظم ص ۴۰

(۳) ایضاً ص ۴۱

(۴) ریاست میسور میں اردو ص ۱۸۴

(۵) نیر اعظم ص ۲۴

(۶) ایضاً ص ۵۴

سید شاہ درویش پیر قادری درویش

آپ کی کنیت ابوالبرکات اور تخلص درویش تھا۔ حضرت درویش کی ولادت ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔ آبا و اجداد شریف النسب اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ حضرت درویش کے مورث اعلیٰ بیجاپور کے متوطن تھے۔ زوال بیجاپور کے بعد ترک وطن کرکے کرنول (آندھرا) چلے آئے وہیں ایک عرصہ تک سکونت اختیار کی۔ ڈاکٹر حبیب النسا بیگم کا کہنا ہے کہ نظام حیدرآباد نے آپ کے خاندان کے ایک بزرگ سید کریم اللہ قادری کو "سال گندہ" کی جاگیر عطا کی تاکہ سادات کا یہ خاندان اطمینان کی زندگی بسر کرسکے۔ سید شاہ درویش پیر قادری کے پردادا کو نواب حیدر علی خاں بہادر "سال گندہ" سے اپنے ساتھ میسور لائے اور اپنا مصاحب خاص بنالیا۔۔۔۔۔ زوال سلطنت خداداد کے بعد مہاراجہ میسور نے ان کے تایا کو میسور بلوالیا اور ریاست کے سرقاضی اور جامعہ مسجد مسیور کی تولیت پر مامور کردیا، چناں چہ جامع مسجد کی تولیت آج بھی اسی خاندان میں نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے "(۱)۔

حضرت درویش کی ابتدائی تعلیم شہر میسور ہی میں ہوئی، کتب متداولہ کی تکمیل اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر آپ نے مدرسۂ لطیفیہ حضرت مکان ویلور کا رخ کیا، وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد چلاگئے اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا، آپ وہاں کامیاب وکیل ثابت ہوئے مگر اپنے برادر بزرگ سید حسین قادری کی اچانک وفات کی وجہ سے آپ کو وطن عزیز میسور لوٹ آنا پڑا تاکہ خاندانی جاگیر اور تولیت کی ذمہ داری بہ حسن وخوبی نبھاسکیں۔

حضرت درویش اپنے وقت کے جید عالم اور صوفی تھے۔ آپ کو عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، تلگو، کنڑی اور تامل پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ شاعری کا فطری ذوق تھا، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکثر فی البدیہہ اشعار کہا کرتے تھے، حاضر جوابی میں آپ اپنی مثال تھے۔ آپ کے کلام میں طنز

کی کاٹ اور زبان و بیان کا لطف کافی مزہ دے جاتی ۔ زبان بامحاورہ اور الفاظ کی نشست و ارتباط برمحل ہوتی ہے ۔ آپ نے بہت سارے خیر مقدمی اور تہنیتی اشعار بھی کہے ہیں ۔ لوگ آپ سے اشعار لکھا کر بھی لے جاتے تھے ، نمونہ ۔ کلام ملاحظہ ہو:

درد بے درماں کا اے دل تیرے درماں آگیا
خضر لے ہاتھوں میں اپنے آب حیواں ہوگیا

دیکھنا ہے جذب دل میں کیسا جادو کا اثر
کچھ خیال آیا تھا جاناں کا کہ جاناں آگیا

تونے " قدقامت " کہی برپا قیامت ہوگئی
مردے جی اٹھے وضو کو آب حیواں آگیا

بادۂ سرِ خفی ملنے میں اب کیا دیر ہے
قاسم پیمانہ ۔ صہبائے عرفاں آگیا

کانپ اٹھا دل اگر آیا گنہ کا کچھ خیال
تو بھی کیا آیا کہ دل میں خوف یزداں آگیا

رابندر ناتھ ٹیگور کی میسور آمد پر ایک تہنیت نامہ ٹیگور کی خدمت میں پیش کیا گیا جو بڑا دل چسپ تھا اور آپ ہی کے زور قلم کا نتیجہ تھا:

سرہی ٹاگور ہیں یا آپ ہیں ٹیگر غراں
روئے تاباں ہے تمہارا کہ ہے مہر رخشاں

روئے انور پہ نظر آتی ہے یوں ریش سفید
جیسے یک ہالہ ہے گردرخ ماہ تاباں

جسم ہندو پہ لباس عربی کہتا ہے
کہیے قالب کو مسلمان تو ہندو ہے جاں

دیکھ کر فلسفی سب آپ کو حیراں ہے یوں
دیکھ یوسف کو ہوئے جیسے حسینان جہاں

فلسفہ میں ہے کمال آپ کو ایسا حاصل
ہے فلاطوں بھی دبستان کا ترے ابجد خواں

کالیداس ایسا کہاں فلسفی و شاعر تھا
جیسا اس وقت ہے تو باعث فخر انساں

دام الفت ہے ترا ایسا نرالا محکم
گویا ہے رام کا فرمان و لچھمن کی کماں

جلوہ افروز ہوا ہند میں اے جب سے تو
لوگ کہتے ہیں کہ اب ہند بنا ہے یوناں (۲)

حضرت درویش نے ایک مختصر نثری رسالہ " رویت ہلال " کے نام سے لکھا تھا جو 1918ء میں شائع ہوا، اس میں رمضان و عید وغیرہ درج ہیں (۳) ۔ آپ کی ایک تحریر بہ طور نثری نمونے کے پیش کی جارہی ہے ، ملاحظہ ہو:

مغاں کہ دانہ ۔ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

عزیز بھائی! انگور پہنچے ۔ باغ باغ ہوگیا ۔ نگاہ پڑتے ہی حوران جناں ہاتھ میں جام مئے لیے ہوئے نظر آنے لگیں ، اس موسم سرما میں لوگ طبیعت گرمانے کے لیے شراب انگوری پیتے ہیں اور آپ انگور بھیجتے

ہیں۔ رضوان جناں تاک میں ہیں اور ہم حضرت کی چشم مخمور سے
شیشۂ دل کو بچائے پھرتے ہیں ایسے وقت میں آپ انگور بھیجتے ہیں
اور حوروں کے مۓ وصال سے ہمیں مخمور کرنا چاہتے ہیں۔

جس کا پیالہ، عمر لبریز ہو گیا ہو، اس موسم میں انگور کھائے
اور خم خانہ، دنیا سے نکل جائے۔ مجھے کیا نشہ سر چڑھا ہے۔ جو دلق
ہستی کو تن سے اتاروں اور رہین شراب اجل کر دوں۔ مجھے ابھی اس
مۓ خانہ، عالم میں بہت ساری محفلیں آراستہ کرنی ہیں۔ اور خم کے
خم لنڈھانے ہیں۔ ابھی دنیا سے مرا دل جلا نہیں اور کباب بنا نہیں۔
بہ ہر طور آپ کا شکر کرتا ہوں اور جام صحت پیتا ہوں" (۴)۔

حضرت درویش کی نثر میں بلا کی روانی اور بات سے بات پیدا کرنے اور
لفظوں سے معنوی افق کو روشن کرنے کی سعی بلیغ ملتی ہے۔ آپ کا وصال ۱۹۲۳ء میں
ہوا۔ آپ کی جامع کمالات شخصیت اردو کے لیے نابغہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حواشی

(۱) ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما ص ۳۱۳

(۲) ایضاً ص ۳۱۵

(۳) "اذکار میسور" ص ۷۰ از اکرام کاوش مطبوعہ ۱۹۹۲ء تامل ناڈو اردو پبلی کیشنز مونٹ روڈ مدراس-۲

(۴) ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما ص ۳۱۶

سید شاہ حسین قادری المعروف بہ اسد پیراں قادری ابن قاضی سید علی صاحب

آپ "دارالعلوم لطیفیہ ویلور" کے فارغ التحصیل اور شہر "میسور" کے سرقاضی تھے۔ علم و فضل میں ممتاز اور شعروادب میں استاذ ہونے کی وجہ سارا شہر آپ کی عزت و توقیر کرتا تھا۔ صوفی منش بزرگ تھے، صلح کل آپ کا مسلک تھا، ہر مکتبہ۔ فکر کے احباب اور ہر طبقہ کے افراد آپ سے استفادہ کرنے حاضر ہوجاتے تھے۔ ہر جمعہ کی شام بلا ناغہ دوست و احباب اور عقیدت مندوں کی محفل سجتی تھی۔ پروفیسر نذیر احمد مرحوم، پروفیسر کلیم مرحوم اور مولانا سراج الحسن ادیب وغیرہ اہل علم حضرات بھی آپ سے فیضان حاصل کرنے کے لیے ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ بہ قول سلیم تمنائی صاحب "قاضی صاحب علم و ادب کا خزینہ ہیں۔ قرآن و حدیث اور فقہ ان کی نوک زبان پر دنیا جہاں کے مسائل پر گفتگو ہوتی" (۱)۔

آپ کا تخلص اسد تھا، شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا آپ کے حقیقی نانا حضرت سید شاہ درویش پیر قادری کے آپ ہر طرح عکس جمیل تھے۔ شریعت و طریقت، شعر و سخن اور ادب و انشاء ہر میدان میں آپ کی جولانی طبع شاہ صاحب کی یاد تازہ کرتی تھی ۔قاضی اسد صاحب کے اشعار اور مضامین کرناٹک کے معتبر رسائل کی زینت بنتے تھے آپ کا ایک مضمون بہ عنوان "استاذ محترم" ایس۔ایس۔ایل۔سی (S.S.L.C) کے نصاب کی کتاب "انیس ادب" میں شامل ہے جو آپ نے اپنے استاذ حضرت شاہ ابوالحسن صاحب کی یاد میں تحریر کیا تھا۔

۱۹۵۳ء میں شہر میسور میں ایک ادبی مجلس کے زیر اہتمام ایک گل دستہ۔ نعت شائع کیا گیا تھا۔ اس مجلس کے صدر نشین ابوالمکارم مولانا مولوی محمد عبدالسلام صاحب سلیم ہزاروی مدرس ٹریننگ کالج میسور، نائب صدر مولانا مولوی سرقاضی محمد قاسم صاحب قسیم انصاری باقوی، معتمد جناب غلام احمد صاحب زفر اور معاونین

جناب سید غلام جیلانی صاحب عاشق اور جناب عبدالرحمن صاحب برق تھے۔ اس مجلس کے تحت ماہانہ طرحی مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے جس میں قاضی اسد صاحب باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔

مذکورہ گل دستے میں شائع شدہ آپ کی ایک طرحی نعت شریف نموتاً یہاں پیش کی جارہی ہے۔

اے رسول اللہ اے شاہِ رسولاں الغیاث　　بن گیا ہے باغِ عالم محشرستاں الغیاث
بے کسی ہے، بے بسی ہے دل ہے مضطر چشم نم　　قابلِ افشا نہیں ہے دردِ پنہاں الغیاث

واعظوں کے واعظ سے تاثیر اب جاتی رہی　　صرف کھانے کو قسم رکھا ہے قرآں الغیاث
کفر باسامان ہے، ہم بے سروسامان ہیں　　ہم کو اہلِ بدر کا مل جائے ایماں الغیاث
باعثِ تخلیق عالم سائرِ عرشِ بریں　　شافعِ روزِ جزا، محبوبِ سبحاں الغیاث
روضۂ سرور پہ چل کر ہم کہیں گے الاماں　　شاہِ ذیشاں الغیاث اے شاہ شاہاں الغیاث

اے اسد فریاد نیکر، سن چکے شاہِ امم
یوں کہے جاتا ہے کیوں ہر وقت ہر آں الغیاث　　(۲)

آپ کا کلام رواں دواں، شستہ اور شائستہ ہے۔ زبان و بیان کی خوبیوں سے آراستہ اور لطافتِ شعری سے پیراستہ ہے۔ آپ کی نثر بھی تقریباً ان ہی اوصاف کی حامل ہے۔ آپ کے ایک مضمون کا اقتباس بہ طورِ نمونہ پیش کیا جارہا ہے:

"ان کی شخصیت میں ایک ایسا جادو تھا جو ان سے ملنے والوں کے دلوں پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ ان کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ ان کی گفتگو میں ایک ایسا سحر تھا جو میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ وہ سرکاری ملازمت میں منسلک ہونے کے باوجود مختلف مقامی انجمنوں کے صدر اور ان کے روحِ رواں بنے ہوئے تھے، سید صاحب کو قدرت نے ایک غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا۔ ان کا مطالعہ بھی کافی وسیع تھا مگر سرکاری ملازمت سے منسلک ہونے کی وجہ سے

وہ شعر و ادب کی ایسی خدمت نہ کر سکے جیسی کہ ان سے توقع کی جاتی تھی۔

پھر بھی جو بھی نظمیں یا غزلیں یا ادبی مضامین ان کے قلم سے نکلے ہیں وہ ادب اردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سید صاحب محترم کو غریق رحمت فرمائے" آمین (۳)۔

قاضی اسد صاحب کو تاریخ گوئی میں بھی کافی ملکہ حاصل تھا، چناں چہ آپ نے اپنے دوست پروفیسر سید نذیر احمد صاحب کی رحلت کے موقعہ پر مرد قابل نذیر احمد آہ (۹۶ ھ ۱۳) سے سال وفات کا استخراج کیا تھا۔ بہرحال حضرت قاضی اسد شہر میسور میں خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ میسور کے علمی و ادبی ماحول کو بنانے میں آپ کی خدمات بجا طور پر قابل رشک ہیں۔ آپ کی وفات ۱۴۱۰ھ میں شہر میسور میں ہوئی۔

حواشی

(۱) ایک ہستی ایک انجمن ص ۳۸ از سلیم تمنائی صاحب مطبوعہ ۱۹۷۶ء انجمن اشاعت اردو میسور ۱۔

(۲) گل دستہ نعت ص ۳۹ مرتبہ مولانا سلیم ہزاروی صاحب مطبوعہ ۱۹۵۳ء میسور

(۳) ایک ہستی ایک انجمن ص ۷، ص ۸ مرتبہ جناب سلیم تمنائی صاحب

شمس العلما حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری ویلوریؒ

آپ حضرت محی الدین شاہ عبداللطیف نقوی قادری ویلوری (متوفی ۱۲۸۹ھ) کے فرزند ارجمند ہیں۔آپ کی ولادت ۲۲/ شوال المکرم ۱۲۶۹ھ میں ہوئی۔ حضرت رکن الدین سید شاہ محمد قادری کے جدِ اعلیٰ ذوقی ویلوریؒ (متوفی ۱۱۹۴ھ) نے آپ کی ولادت سے متعلق چھیاسی سال پیش تر ہی بشارت دے دی تھی۔جیسا کہ حضرت قطب ویلور نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:

"جدی و شیخی حضرت عبداللطیف المعروف بہ محی الدین ذوقی پیش از ہشتاد و شش سال در مراقباتِ خود از پسریکہ موصوف بہ علوِ مراتب و عمر دراز بود و مسمیٰ بہ "سید محمد" باشد، بشارت دادہ اند، وجدی و شیخی رکن الدین حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی بران مراقبہ تہنیت نوشتہ اند، قدس اللہ روحھما وافاض علینا فتوحھما"(۱)

یعنی میرے داوا اور میرے مرشد حضرت عبداللطیف معروف بہ محی الدین ذوقی نے چھیاسی سال پیش تر ہی اپنے مراقبات کے ذریعہ ایسے فرزند کی خوش خبری سنائی تھی جو بلند مراتب سے سرفراز اور عمر دراز ہوگا۔اور اس کا نام "سید محمد" ہوگا۔بنابراس مراقبہ کے میرے جدِ اعلیٰ اور شیخ طریقت حضرت رکن الدین سید شاہ ابوالحسن قربیؒ نے تہنیت لکھی ہے۔"

علاوہ اس بشارت کے حضرت قطب ویلور جب پہلی مرتبہ ۱۲۶۵ھ میں عازم بیت اللہ ہوئے اور مکہ مکرمہ پہنچے تو ایک روز خواب دیکھا کہ حرم شریف میں ایک پودا رونما ہوا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرلی اور اس کی شاخیں کعبتہ اللہ پر سایہ فگن ہوگئی ہیں۔ حضرت قطب ویلور نے اپنے اس خواب کا ذکر حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی سے کیا تو شاہ صاحب بہت

خوش ہوئے اور فرمایا کہ آپ کے ایک فرزند صالح پیدا ہوگا اس سے اور اس کی اولاد امجاد سے تشنہ گانِ علم کو خوب فیض پہنچے گا (۲)۔

حضرت رکن الدین کی ابتدائی تعلیم اپنے والدِ ماجد حضرت قطب ویلورؒ کی زیر نگرانی ہوئی۔ بعد ازاں حضرت قطب ویلور نے اپنے خلیفۂ خاص اور شاگردِ رشید حضرت مولانا محمد حنیف صاحب قادری بنگلوری کو صاحب زادے کی مزید تعلیم کے لیے مدرسہ ہی میں مقرر کیا، حضرت رکن الدین بلا کے ذہن اور نہایت ذکی تھے۔ اس لیے قلیل عرصے ہی میں علوم متداولہ سے فارغ ہوگئے۔ اس کے بعد حضرت قطب ویلور نے بہ نفسِ نفیس خود ہی فرزندِ دل بند کی اعلیٰ تعلیم و تربیت اور سلوک و ریاضت کی منزلیں طے کرائیں جس سے آپ شریعت و طریقت میں کامل اور علومِ ظاہر و باطن کے متبحر بن گئے۔ بیس سال کی عمر میں جب آپ اپنے والد کے ساتھ حج و زیارت کے لیے ۴/ شوال المکرم ۱۲۸۸ھ کو ویلور سے روانہ ہوئے اور حج سے فراغت کے بعد مدینۂ منور حاضر ہوئے (۳) تو ۷/ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ کو والدِ ماجد حضرت قطب ویلور نے اپنے وصال سے صرف چار دن پیش تر آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا اور عمدہ نصیحتیں کرتے ہوئے دعائے خیر کی۔ مصنف "مثنوی مطلع النور" نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی:

اور خلافت کا خرقۂ والا ۔۔۔ عن بہ عن جو کہ اس کو پہنچا تھا
خلف الصدق کو وہ اپنے دیا ۔۔۔ وہ محرم کی ساتویں تھی بہ جا
اور وصایا کیا ہے چند اسے ۔۔۔ کئی باتوں سے بہرہ مند کیا
ہے ازا نجملہ یہ وصیت بھی ۔۔۔ کہ توکل تو کر خدا پہ ہی

اے پسر جادۂ شریعت پر ۔۔۔ رہ سدا مستقیم شام و سحر
بے کسوں کی سدا اعانت کر ۔۔۔ اور مساکیں پہ شفقت کر
بھوکوں ننگوں کو دے لباس و طعام ۔۔۔ بہرِ خوشنودیِ خدائے انام
اور جب آوے مسافر و مہماں ۔۔۔ رکھیے اس کو عزیزتر از جاں (۴)

حضرت رکن الدین اپنے وقت کے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ مؤلف انوارِ

اقطاب ویلور کے (۵) بیان کے مطابق حضرت قطب ویلور کے وصال کے بعد حضرت سیدنا حضرت خضر علیہ السلام نے بہ نفسِ نفیس آپ سے ملاقات کر کے والدِ ماجد کی رحلت پر تعزیت ادا کی۔ اس طرح ایک صاحبِ دل نے خواب میں جنوبی ہند کے مشہور صوفی، ولیِ کامل حضرت شاہ عبدالحمید ناگوری قدس سرہ (المتوفی ۹۷۸ھ) کو اس حالت میں دیکھا کہ آپ بے قراری کے عالم میں سر کو نیچے اوپر حرکت دے رہے ہیں اور زبان سے کچھ ارشاد فرما رہے ہیں، اس بزرگ نے ادباً عرض کیا کہ حضور! آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں۔؟ حضرت شاہ الحمید ناگوری نے فرمایا کہ آج مدینۂ منورہ میں قطب ویلور جاں بہ حق ہوگئے ہیں جن کے دمِ قدم سے عالم میں فیوض و برکات پھیلے ہوئے تھے۔ قطب ویلور کے فرزند مدینۂ منورہ سے ویلور تین چار ماہ کے بعد لوٹ آئیں گے لہٰذا تم جاکر ان سے تعزیت ادا کرو، چناں چہ حضرت رکن الدین کی ویلور واپسی کے بعد مذکورہ بزرگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تعزیت ادا کرتے ہوئے اپنے خواب کا واقعہ مفصل بیان کیا۔

حج سے واپسی کے چند دن بعد ۳ / جمادی الاخر بہ روز پنجشنبہ ۱۲۸۹ھ کو خاندانی روایات کے مطابق حضرت سید شاہ رکن الدین کی رسم سجادگی ادائی بروے کار لائی گئی۔

اس مبارک و مسعود جلسۂ تہنیت میں اکابر علما، اہلِ دل صوفیہ اور باکمال شعراء نے شرکت کی اور اپنے دلی تاثرات نظم و نثر میں پیش کیے۔ شرکائے جلسہ میں حضرت مولانا عبدالقادر علی صوفی بنگلوری ولد حضرت مولانا شاہ عبدالحیٔ احقر بنگلور بھی تھے۔ موصوف نے ۶۷ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم تبریک پیش کی جس کے ابتدائی اور اختتامی اشعار اس طرح ہیں:

ابتدائی   الحمد   لحضرت   الجلالۃ

والنعت   لخاتم   الرسالہ

صاحبِ   زادہ   گرامی   گوہر

جس   سے   کرے   فخر   ہے   سیادت

سید شہ رکن دیں محمدؒ
چومے جس کے قدم سعادت
پھولا گل زارِ نوجوانی
با رنگ و بہار و بانضارت

اختتامی: مسند ہوی رشکِ چرخِ اطلس
دی پردۂ چشم کو ندامت
ہیں حاشیہ بوس جس کے تارے
چشم بلبل کی کیا ہے حاجت
ہاتف نے غایتِ عجب سے
بولا زہے مسندِ خلافت

۱۲۸۹ھ

صوفی کا ہے شعر بے تکلف کیا لطف ہو اس میں اور نزاکت
شہہ زادے کی پیش کش ہو کیوں کر گر ہو تو فقط ہے اک جسارت (۲)

حضرت مولانا رکن الدین کو تعلیم و تدریس کا ذوق وراثت میں ملا تھا، آپ نے اپنی ساری زندگی ترویجِ علوم دینیہ و اشاعتِ ثقافتِ اسلامیہ میں صرف کر دی، آپ کا عہد انگریزوں کے عروج کا اور مسلمانوں کے زوال کا زمانہ تھا ساری دنیا میں بالخصوص ہندوستان میں روز بہ روز سلطنتِ برطانیہ کا اقتدار مضبوط ہوتا جارہا تھا، حضرت ٹیپو سلطانؒ کی شہادت ۱۲۱۳ھ کے بعد انگریزوں کے حوصلے بلند اور مسلم حکمرانوں کی ہمتیں پست ہورہی تھیں۔ اس دور ابتلا میں مسلمان عام طور پر اپنا توازن کھو رہے تھے، انھیں سنبھالنے اور سمیٹنے کے لیے مستقل مزاجی، دور اندیشی اور خداترسی کی اشد ضرورت تھی، اہلِ جنوب کی بلکہ اہلِ ہند کی خوش قسمتی ہے کہ اس افراتفری کے زمانے میں مذکورہ صفات کمالیہ کی جامع شخصیت انھیں حضرت رکن الدین سید شاہ محمد قادری ویلوری کی صورت میں مل گئی۔ آپ کی تجدیدی کاوشوں سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رہا، علم و عرفان کی شمع بجھنے سے رہ گئی۔ آپ نے اپنے آبا و اجداد کے خانقاہی مدرسہ کی تشکیل جدید کا بیڑا اٹھایا، عام مسلمانوں کے

تعاون سے آپ نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جس کے اثرات و ثمرات آج تک نمایاں ہیں چناں چہ آپ نے ۱۳۰۲ھ میں دار العلوم لطیفیہ کی توسیع فرمائی، طلبا کی رہائش کے لیے دیدہ زیب وسیع دار الاقامہ اور درس و تدریس کے لیے طویل و عریض ہال تعمیر کیا، علاوہ ازیں آپ نے مدرسہ سے متصل بائیں طرف واقع مسجد کی از سر نو تعمیر ۱۲۹۱ھ میں کروائی اور مسجد کے صحن میں ایک طرف خوب صورت حوض بنوایا، اس پرشوکت و بارونق مسجد کے محراب کے اوپر مسجد کا کتبہ نصب ہے جس کے تاریخی اشعار میں اس کے بانی کا نام بھی ثبت ہے:

قطعہ تاریخ: رکن دیں مقتدائے اہلِ زمن
مسجدے چوں حرم بنا کردہ
بہر اعلام عابداں ہاتف
بانگ قد قامت الصلواہ زدہ

۱۲۹۱ھ

آپ نے مدرسہ کی تشکیل جدید کے بعد حالاتِ حاضرہ کے مطابق درسِ نظامیہ کے نصاب کو جاری فرمایا اور جنوب و شمال کے باکمال اور با اخلاق علما و فضلا کو منصب تدریس پر متمکن کیا۔ آپ کے دور کے اساتذۂ کرام جن کا تعلق جنوب سے ہے حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت مولانا فقیہ محی الدین قادری عرف دبلے محی الدین صاحب (۷) (متوفی ۱۳۱۶ھ) خلیفہ حضرت قطب ویلور قدس سرہ

(۲) حضرت مولانا مولوی محمد نینا صاحب کائل پٹنم

(۳) حضرت مولانا مولوی سید شاہ علیم اللہ بختیاری رائے جوٹی (۸)

(۴) حضرت مولانا سید شاہ فضل اللہ صاحب قادری (متوفی ۱۳۱۱ھ) خواہرزادہ و خلیفہ حضرت قطب ویلور رحمت اللہ علیہ

(۵) حضرت مولانا سید شاہ قاضی حیدر ولی اللہ قادری (متوفی ۱۳۸۳ھ) ابن حضرت مولانا سید شاہ فضل اللہ قادری ویلوری متولی مزارات خانوادۂ

حضرت ٹیپو سلطان شہید (عہد تولیت ۱۳۱۱ تا ۱۳۸۳ھ)

شمالی ہند کے اساتذۂ کرام کے نام یہ ہیں:

(۱) مولانا محمد تقی صاحب لکھنوی (۲) مولانا افہام الدین صاحب لکھنوی (۳) مولانا احمد حسن کانپوری (۴) مولانا حافظ سید عبدالجمیل پشاوری

حضرت رکن الدینؒ کی سرپرستی اور مذکورۂ بالا اساتذہ کی زیرِ تعلیم و تربیت رہ کر ۱۳۱۱ھ میں اور اس کے بعد فارغ ہونے والے بعض ممتاز طلبا کے نام یہ ہیں:

(۱) مولانا الحاج محی الدین حسین انور چیدہ (۹) (۲) مولانا محمد قاسم قاسم حیدرآبادی (۱۰) (۳) مولانا الحاج حافظ قاری سید قاسم صاحب (۱۱) (۴) مولانا ابو السعادات احمد کویاشالیاتی ملباری (۱۲) (۵) مولانا عبدالرحیم صاحب قریشی مدراسی

حضرت رکن الدینؒ کی عظیم علمی خدمات سے متاثر ہوکر وائسرائے ہند اور گورنر جنرل آف انڈیا نے ۱۲۹۴ھ میں آپ کو شمس العلما کا خطاب دیا۔

آپ کا نکاح خاندان ہی میں اپنے پھوپی زاد بھائی حضرت مولانا سید شاہ فضل اللہ قادری کی صاحب زادی سے ہوا جن سے حضرت مولانا محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری عرف مکی حضرت اور حضرت سید شاہ غوث صاحب قادری معروف بہ غوث پیر صاحب اور دیگر چھے لڑکیاں تولد ہوئیں۔

آپ کی مستقل تصنیف کا علم نہ ہوسکا، البتہ آپ کی کئی ایک بیاضیں محفوظ ہیں جن میں مختلف موضوعات اور متفرق واقعات پر آپ کی روشن تحریریں موجود ہیں۔ یہاں آپ کی ایک تاریخی تقریر کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے جو آپ نے بہ تاریخ ۹/ شعبان ۱۳۱۱ھ بہ روز دوشنبہ جلسۂ دستار بندی کے موقعہ پر دار العلوم لطیفیہ میں کی تھی۔ اس اقتباس سے آپ کی زبان و بیان پر دسترس اور آپ کے خیالات و احساسات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے، آپ نے فرمایا:

"اربابِ مجلس! یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام نہایت ٹوٹا پھوٹا اور اس کو

ہر طرح کی تباہی و پریشانی کا سامنا ہے اور یہ وہ دن ہیں کہ اسلام کا وسیع جہاز مخالف ہوا کے جھوکوں سے ڈوبنے کے قریب پہنچا ہے۔ اور آج وہ روز ہے کہ اسلام کا چراغ جس سے ساری (دنیا) روشن تھی شمع سحری کی طرح ٹمٹماتا نظر آرہا ہے۔ اس موقع پر حضرت قطب ویلور قدس سرہ کا فرمان جو کمالِ بے قراری ، ہم دردی سے ارشاد فرماتے تھے یاد آتا ہے "امروز روزیست کہ اسلام بغایت ضعف و شکستگی دارد و عمل قلیل بہ عوض اجر جزیل بہ کمال اعتنا بدرجہ اجابت می رسد"۔

یعنی "آج وہ روز ہے کہ اسلام نہایت ضعف و ٹوٹا پھوٹا ہوا ہے اور تھوڑا عمل عوض میں بڑے ثواب کے نہایت اعتبار کے ساتھ اللہ رب العالمین کے نزدیک درجہ قبولیت کو پہنچا ہے" جب فقیر اسلام کی تباہی پر اپنے مسلمان بھائیوں کے خیالات پر نظر کرتا ہے تو دل بھڑکتا ہے اور سینہ ابل آتا ہے اور دن رات ہر آن و لحظہ اسی بے قراری و فکرِ و سوچ میں گزرتے ہیں کے الہیٰ کونسا ذریعہ ان کے ترقیات کا ظہور میں آئے گا اور کس تدبیر سے ان کی بہتری کے اسباب جمع ہوں گے۔ فقیر اپنی مدت العمر کو اسلام اور اسلامیوں کی [illegible]گزاری میں وقف کیا ہے (۱۳)

حواشی

(۱) مکتوبات لطیفی (مخطوطہ) مخزونہ کتب خانہ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

(۲) اللطیف بابت ۱۳۸۸ھ ص ۳۰

(۳) مؤلف انوار اقطاب ویلور نے عطائے خلافت کی تاریخ ۸ / محرم ۱۲۸۹ھ لکھی (ص ۱۰۶) اور

مؤلف تذکرۂ اقطاب ویلور نے ۶ / محرم الحرام کی نشان دہی کی ہے (اللطیف شمارہ ۱۴۰۴ ھ اقطاب ویلور نمبر ص ۸۶) دونوں تاریخیں "مطلع النور" کی صراحت "وہ محرم کی ساتویں تھی بہ جا" کی روشنی میں صحیح نہیں ہیں۔

(۴) مثنوی مطلع النور ص ۴۰

(۵) انوار اقطاب ویلور ص ۱۱۷

(۶) تکملہ۔ مثنوی مطلع النور حصہ۔ آخر ص ۴ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ مطبع واقع معسکر بنگلور

(۷) حضرت دبلے محی الدین صاحب مفتی بھی تھے اور آپ نے کئی رسائل بہ زبان اردو تحریر کیے ہیں جو دینی موضوعات پر مشتمل ہیں۔

(۸) حضرت علیم اللہ بختیاریؒ بعد میں ویلور سے حیدر آباد چلے گئے، قیام حیدر آباد کے دوران مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بانی۔ جماعت اسلامی نے آپ سے عربی کی تعلیم حاصل کی جس کا اقرار انھوں نے اپنے مکتوب میں کیا ہے اور یہ خط راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ حضرت علیم اللہ بختیاری کے نامور فرزند حضرت مولانا سید شاہ صبغتہ اللہ بختیاری (متوفی ۱۹۹۳ء۔ مدفن رائے چوٹی ضلع کڈپہ ہیں ، راقم کو حضرت بختیاری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ حضرت بختیاری ایک عرصے تک مدرسہ باقیات صالحات ویلور میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

(۹) حضرت چیدہ مدراس کے متوطن تھے۔ مدرسہ لطیفیہ میں استاذ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے کئی رسائل تصنیف کیے جن میں سفرنامہ حرمین ، طب روحانی بسوط قابل ذکر ہیں۔ آپ کو اردو کا صاحب طرز انشاپرواز کہنا بے جا نہ ہوگا، آپ کی وفات ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔

(۱۰) آپ سابق شیخ المنطق جامعہ نظامیہ حیدر آباد اور نواب عثمان علی خاں کے اتالیق تھے۔

(۱۱) آپ سبع و عشرہ کے جید قاری تھے اور شاعر باکمال و استاذ سخن کہلاتے تھے۔ آپ ۱۳۱۱ھ تا ۱۳۲۲ ھ مدرسہ لطیفیہ میں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں آپ نے مسلم ہائی اسکول ویلور میں منشی پھر اورلیس کالج ویلور میں اردو لکچرار کی حیثیت سے کام کیا۔

(۱۲) آپ حضرت رکن الدینؒ کے خلیفہ تھے، عربی کے ماہر ادیب و شاعر تھے، آپ ۱۳۲۲ھ سے ۱۳۳۶ ھ تک لطیفیہ میں مدرس رہے۔

(۱۳) مکمل روئداد دارالعلوم لطیفیہ بابت ۱۳۱۱ھ ص ۲۸، ۲۹ - ۱۱۸ صفحات پر مشتمل یہ روئیداد غالباً مدرسہ لطیفیہ کی پہلی روئیداد ہے۔ اس کا ایک نسخہ امانتی کتب خانہ ، مدرسہ محمدی ، دیوان صاحب باغ مدراس میں محفوظ ہے۔

شمس العلما حضرت مولانا مولوی محی الدین سید شاہ عبداللطیف (رابع) قادری ویلوری المعروف بہ حضرت مکی قدس سرہ

آپ شمس العلما مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری ویلوری) متوفی ۱۳۲۵ھ) کے بڑے صاحب زادے ، خاندان اقطاب ویلور کے ساتویں سجادہ نشین اور صاحب کمال بزرگ ہیں۔ حضرت مکی کی ولادت بہ تاریخ ۲۶ / ربیع الاول ۱۲۹۸ھ بہ روز دوشنبہ بہ وقت سہ پہر بہ مقام ویلور ہوئی۔ آپ کی تعلیم حسب روایات سابقہ مدرسہ لطیفیہ ہی میں اپنے والد ماجد کی زیر سرپرستی ناہر و قابل اساتذۂ کرام کی نگرانی میں ہوئی۔ مدرسہ سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد کے دست نیک سرشست پر بیعت کی اور سلوک و ریاضت کے بعد اجازت و خلافت سے بہرہ مند ہوئے۔ حضرت شاہ رکن الدین کے پردہ فرمانے کے بعد آپ نہ صرف منصب درس و تدریس پر فائز ہوئے بلکہ مسند رشد و ہدایت کو بھی زینت بخشی اس طرح ستائس سال کی عمر میں آپ نے مدرسہ اور خانقاہ دونوں کی باگ ڈور سنبھالی۔ آپ کے دور میں دارالعلوم لطیفیہ کی بڑی شہرت ہوئی۔ آپ نے علوم و فنون کی ترقی و ترویج میں خوب سعیٔ بلیغ فرمائی۔ آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں وائسرائے ہند نے ۱۹۱۶ء (مطابق ۱۳۳۵ھ) میں شمس العلما کا باوقار خطاب پیش کیا۔ ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۸ھ میں مدراس کا گورنر لارڈ ولنگٹن اپنی اہلیہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں نیاز مندانہ طور پر حاضر ہوا اور آپ کی خیریت پرسی کی (۱)۔ آپ کی بے لوث خدمت سے متاثر ہو کر نظام حیدر آباد دکن نے آپ کی خدمت میں ایک خطیر رقم روانہ کی تھی جسے آپ نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا اور فرمایا کہ ہمارا مدرسہ اور علمی کام اللہ رب العزت کے توکل پر چل ہی رہا ہے لہذا اس کی چنداں حاجت نہیں ہے (۲)۔

آپ کی ذات بابرکت سے ظاہری و باطنی فیض پانے والوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ جن میں سے چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:

(۱) آپ کے فرزند کلاں مولانا مولوی الحاج الحافظ ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری ویلوری (۲) مولانا مدیکار محمد قاسم آمبوری (۳) مولانا حکیم غلام غوث شریف قاضی ویلور (۴) مولانا سید شاہ شہاب الدین قادری ترچناپلوی (۵) مولانا مفتی عبدالباسط محمود بندری (۶) مولانا عبدالقادر کلوی (۷) مولانا محمد اکرم صاحب بھٹکلی وغیرہ آپ اپنے والد شاہ رکن الدینؒ کی طرح زہد و تقویٰ، علم و عمل ۔جود و کرم اور عالی ہمت و وسیع النظر واقع ہوئے تھے۔ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر صالح علمی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا، ہر تلسم کے تعصبات و تحفظات کو بالائے طاق رکھ علم و ادب کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو مولانا مولوی سید شاہ ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے اپنے ایک طویل مکتوب میں بائیں الفاظ مذکورہ بزرگوں کی تعریف کی کہ:

" میں ویلور کی حاضری کو حاصل سفر سمجھتا ہوں، مجھے اس وقت جو انشراح و انبساط حاصل ہوا مجھے اس کا سبب معلوم نہ تھا۔ لیکن وہاں سے واپس آکر میں نے آپ کے عنایت فرمائے ہوئے رسائل پر نظر ڈالی اور لکھنو پہنچ کر اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی مشہور عربی تصنیف " نزہتہ الخواطر " کی چھٹی اور ساتویں جلد دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس میں سید شاہ ابوالحسن قادری قربی علیہ الرحمہ اور سید شاہ عبداللطیف قطب ویلور کے حالات دیکھے تو اس تعلق سے قلبی اور انجذاب باطنی کا سبب معلوم ہوا پھر ندوۃ العلما کے اجلاس مدراس ۱۹۰۴ء اور اجلاس مدراس ۱۹۱۷ء کی روداد یں دیکھیں تو مزید تصدیق ہوئی کیونکہ پہلے اجلاس میں مولانا سید شاہ رکن الدین (سید شاہ محمد قادری) صاحب نے جو اس وقت سجادہ نشین تھے، " ندوہ " کی پوری نصرت و حمایت فرمائی خود علالت کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے تو صاحب زادہ والا شان مولانا

سید شاہ عبداللطیف کو قائم مقام بنا کر بھیجا اور انھوں نے ایک جلسہ کی صدارت بھی فرمائی۔ دوسرا اجلاس ۱۹۱۷ء (مطابق ۱۳۳۶ھ) کے موقعہ پر مولانا سید شاہ عبداللطیف صاحب (حضرت مکی قادری) خود سجادہ نشین تھے۔ اور ان دنوں سخت علیل تھے۔ انھوں نے اپنی تائید او خوشنودی کا خط ذمہ داران ندوۃ العلما کو بھیجا اور ندوہ کے اغراض و مقاصد اور جلسہ کے ساتھ پوری دل چسپی و ہم دردی کا اظہار فرمایا یہ وہ زمانہ تھا کہ "ندوہ" کی حمایت کرنا بھی مدراس میں وہابیت کا مترادف سمجھا جاتا تھا (۳)۔

نکاح واولاد: آپ کا نکاح چوبیس سال کی عمر میں ۱۳۲۲ھ میں بہ مقام ویلور ہوا، آپ کے والد نے آپ کے علاوہ آپ کے چھوٹے بھائی سید شاہ غوث صاحب قادری معروف بہ غوث پیر صاحب اور دیگر دو بہنوں کا نکاح ایک ساتھ کرادیا، اس مبارک و مسعود محفل میں علماء و فضلاء اور شعرا دیا بڑی تعداد میں شریک تھے۔ مختلف شعرائے کرام نے اپنی اپنی تہنیتی نظمیں پیش کیں۔ جس کا ایک گل دستہ "گل دان تواریخ" کے نام سے بہ اہتمام جناب محمد عبداللطیف ولد حکیم محمد حسین معروف بہ حکیم بابا میاں مرحوم بنگلوری شائع ہوا۔

حضرت مکی کو حج بیت اللہ شریف کا ازحد شوق دامن گیر تھا، ایک دن خواب میں آپ کے والد شاہ رکن الدین اور دادا حضرت قطب ویلور نے زیارت حرمین شریفین کا مژدہ سنایا اور حرم شریف کی زیارت کا حکم دیا۔ آپ حکم کی تعمیل میں کمربستہ ہوگئے سیچتاں چہ ۳/ شوال ۱۳۳۸ھ بہ روز چہار شنبہ ویلور سے روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ آپ کے بڑے فرزند سید شاہ عبدالقادر سفر میں معاون تھے۔ حج و زیارت سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے صاحب زادے کو حرم شریف میں بلاکر بیعت و خلافت سے نوازا اور انھیں ایک سوا کانوے سلسلوں کی اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ کو اپنی وفات کی اطلاع من جانب اللہ ہو گئی تھی، تمام احباب کو فرداً فرداً نصیحتیں کیں۔

آخرش ۱۹ / ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ کو آپ واصل بہ ہوئے۔ ایک لاکھ سے زائد زائرین نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ ۲۰/ ذی الحجہ کو جنت المعاویٰ (مکہ مکرمہ) میں تدفین عمل میں آئی۔ آپ کا نکاح اپنی خالہ زاد بہن سے ہوا تھا، جس سے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تولد ہوئیں صاحب زادوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں (۱) حضرت ابو الفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبد القادر قادری نقوی (متوفی ۱۳۷۸ھ) (۲) حضرت ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری مدظلہ العالی (۳) حضرت مولانا ابو صالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری معروف بہ میراں پاشا (متوفی ۱۹۸۴ء) (۴) حضرت مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر صاحب معروف بہ حضرت پیرا (متوفی ۱۴۰۷ھ)

حضرت مکیؒ کے بعد آپ کے بڑے صاحب زادے حضرت مولانا مولوی الحاج حافظ سید شاہ عبد القادر قادری نقوی خانقاہِ اقطاب ویلور کے سجادہ نشین اور دار العلوم لطیفیہ کے سرپرست ہوئے۔ حضرت عبد القادر کی ولادت بہ تاریخ ۴/ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ بہ روز یکشنبہ بہ مقام ویلور ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، آپ نے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم اپنے آبائی مدرسہ لطیفیہ میں مولانا الحاج محی الدین حسین چیدہ اور مولانا مولوی حافظ سید قاسم صاحب جیسے قابل اساتذہ سے حاصل کی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ۱۳۳۸ھ میں حضرت مکیؒ کے ہم راہ آپ بھی عازم حج بیت اللہ ہوئے اور ۱۹/ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ بہ روز پنجشنبہ حرم شریف میں آپ کے والدِ ماجد نے آپ کو تمام علما و صوفیا کے روبرو اپنا خلیفہ و مجاز نامزد کیا اور آبائی سلاسل و تبرکات سے سرفراز فرمایا (۴)۔ ارضِ مقدس سے ویلور لوٹ آنے کے بعد یکم ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو دار العلوم لطیفیہ میں رسم سجادگی ادا کی گئی۔ آپ تقریباً چالیس سال تک دار العلوم کے ذریعہ دینی و علمی خدمات انجام دیتے رہے اور خلقِ خدا کی باطنی ضروریات پورے کرتے رہے۔ آپ کے دست مبارک پر کئی ممتاز افراد نے بیعت کی اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ جن میں قاضی شہر ویلور مولانا حکیم محمد غلام غوث شریف صاحب و مولانا مولوی ابو صالح شاہ غضنفر حسین شاکر نائطی اور آپ کے

تینوں بھائی قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۰/ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ بہ روز جمعہ مجلس عطائے خلافت منعقد ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر کئی نام ور شعرا نے تہنیتی نظمیں فارسی اور اردو زبان میں پیش کی تھیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر نقوی صاحب تصرف بزرگ تھے، آپ کی کئی کرامتیں آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ایک واقعہ جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے بیان کیا جارہا ہے۔ سال ۱۳۴۸ھ اور مہینہ ذی الحجہ کا تھا، دھرم پوری (نزد سلیم، تامل ناڈو) کے معزز باشندے مٹھدار غلام محی الدین احمد خاں ناگور شریف (علاقہ جنوبی آرکاٹ، تامل ناڈو) بہ غرض زیارت پہنچے اور حضرت شاہ حمید الدین عبدالقادر ناگوری (متوفی ۹۷۸ھ) قدس سرہ کی بارگاہ میں اپنا یہ معروضہ پیش کیا کہ انھیں کسی شیخ کامل کا پتہ بتایا جائے تاکہ وہ ان سے وابستہ ہوجائیں۔ ایک شب خواب میں حضرت ناگوریؒ نے انھیں اپنے ساتھ حضرت مکان ویلور لے جاکر شاہ عبدالقادر قادری نقویؒ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ میرے ہم نام تمہارے شیخ ہیں۔ خاں صاحب اس بشارت سے بے حد خوش ہوئے اور ویلور پہنچ کر حضرت سید شاہ عبدالقادر نقوی کے حلقہ بہ گوش ہوگئے۔ اس واقعہ کو آپ کے خلیفہ مولانا شاکر نائطی (۵) (متوفی ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء) نے اس طرح نظم کیا تھا۔

ایک خوش بخت سے روایت ہے ۔۔۔ کیا ہی اللہ کی عنایت ہے
تھی تلاش ان کو شیخ کامل کی ۔۔۔ مردِ عارف کی، حق سے واصل کی
شاہ گنج سوائی تک پہنچے ۔۔۔ اور رہے جاکے بارگہ میں کھڑے
عرض و معروض میں زبان کھلی ۔۔۔ اور بڑی عاجزی سے عرض یہ کی
شیخِ کامل مجھے دکھا دیجئے ۔۔۔ پردہ آنکھوں سے اب ہٹا دیجئے
طالبِ حق کی آرزو پاکر ۔۔۔ اور خود اپنے ساتھ لے جاکر
حلیۂ شیخ اسے بتا بھی دیا ۔۔۔ اور حضرت مکاں دکھا بھی دیا
مرا ہم نام ہے یہ شیخ ترا ۔۔۔ مرا ہم گام ہے یہ شیخ ترا (۶)

حضرت سید شاہ عبدالقادر نقوی قادری کا نکاح ۱۳۵۳ھ میں اپنے چچا سید شاہ غوث پیراں

قادریؒ کی بڑی صاحب زادی سے ہوا۔اس محفل انبساط ہی میں آپ کے تیسرے بھائی مولانا الحاج ابو صالح عمادالدین سید شاہ محمد ناصر قادری معروف بہ میراں پاشا صاحب کا نکاح اپنے چچا کی دوسری صاحب زادی سے اور آپ کی ہم شیرہ صاحبہ کا عقد عم محترم کے بڑے فرزند مولانا رکن الدین سید محمد قادری عرف مرشد پاشا سے ہوا(۷)۔آپ کا وصال ۱۲/ محرم الحرام ۱۳۷۸ھ بہ روز چہار شنبہ بہ وقت صبح سات بجے ہوا جس کی پیش گوئی آپ نے پہلے ہی کر دی تھی۔آپ اپنے خاندانی گنبد ہی میں اپنے جدِ اعلیٰ حضرت ذوقیؒ کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔مولانا شاکر نائطی نے آپ کے وصال پر ایک مرثیہ لکھا تھا جس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

شاہ بوالفتح سید السادات ذات تھی جن کی پاک و نیک صفات
یعنی سلطان محی دینِ متیں عبدِ قادر ولی ذی تمکیں
چل بسے بارہویں محرم کو داغ فرقت وہ دے گئے ہم کو
ایسے کیا انتقال کرتے ہیں مرنے والے بھی ساتھ مرتے ہیں
مرگ تنہا نہیں، یہ وہ غم ہے موت عالم کی موتِ عالم ہے
ہفت ساعت تھی اور بدھ کا دن دن نکلتے ہی جب کہ ڈوبا دن
نکلا سورج بھی تھرتھراتا ہوا منظرِ غم میں تلملاتا ہوا
اللہ اللہ کیا وہ ہستی تھی زندگی جس کی حق پرستی تھی
موت، غم ہم کو دینے آئی تھی مغفرت ان کو لینے آئی تھی (۸)

حواشی

(۱) اللطیف شمارہ خصوصی نمبر ۱۴۰۴ ص ۱۱۸

(۲) ایضاً ص ۱۱۷

(۳) اللطیف ۱۴۰۴ ص ۱۱۰ اور ص ۱۱۸ مذکورہ خط حضرت مولانا ابوالحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری (متوفی ۱۴۰۷ھ) ناظم دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور کے نام پر حضرت سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے دورۂ جنوبی ہند سے واپسی کے بعد بہ تاریخ ۹ اگسٹ ۱۹۷۰ء روانہ

کیاتھا۔ آپ ۲ / اگست ۱۹۷۰ء کو دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور تشریف لائے تھے، جہاں آپ کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی جلسہ منعقد کیا گیا۔ حضرت علی میاں نے اس جلسہ سے خطاب کیا تھا۔ اس کاروائی کی تفصیل اللطیف (سال نامہ) بابت ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

(۴) آپ کا تفصیلی تذکرہ بعد میں آئے گا۔

(۵) حضرت ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا لقب۔

(۶) اللطیف بابتہ ۱۴۰۴ ص ۱۳۰

(۷) ایضاً ص ۱۳۰

(۸) ایضاً ص ۶۴، ص ۶۵

علامہ شاکر نائطی

آپ کا نام محمد غضنفر حسین، کنیت "ابو صالح" اور تخلص شاکر تھا، آپ کے والد محمد علی شاکر "شمالی آرکاٹ" کے مشہور تاریخی شہر جنجی کے قصبہ ینمبور کے باشندے تھے۔ پیشہ زراعت اور خاندان نوائط تھا۔ لفظ "نوایط" "نائط" کی جمع ہے جو اقوامِ عرب میں سے ایک ہے۔ بہ قول علامہ باقر آگاہؔ (۱) (متوفی ۱۲۲۰ھ) "نائط" جدِ قبیلہ کا نام ہے اور وہ حضورِ اکرم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مورث اعلیٰ حضرت نضر ابن کنانہ کے فرزند تھے۔ مصنف تاریخ النوائط نے بھی حضرت آگاہ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " قوم نایط کا نسبی شجرہ صاحبانِ تصانیف معتبرہ کی تحقیق کی رو سے تین شاخوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں شاخوں کی اصل نضر ابنِ کنانہ جدِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں" (۲)۔ بہ ہر حال اس قبیلہ نائط کے خاندانوں میں سے ایک معروف خاندان "شاکر" کے نام سے ملقب ہے جن کے جدِ اعلیٰ شاکر علی خاں گوپاموی تھے (۳)۔ اسی خاندانِ شاکر کے چشم و چراغ علامہ شاکر نائطی ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ والدہ کا نام حبیب النساء تھا۔ ابتدائی تعلیم وطن عزیز ینمبور (Menambur) ہی میں ہوئی۔ استاذ کا نام مولانا سید عالم حیدر آبادی بتایا جاتا ہے (۴)۔ جنھوں نے اس زمانہ میں اپنے وطن حیدر آباد کو خیرباد کہہ کر ینمبور میں نہ صرف سکونت اختیار کر لی بلکہ وہیں نکاح بھی کر لیا تھا۔ استاذ اپنے شاگردِ رشید کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر تھے۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد استاذ نے والد سے اعلیٰ تعلیم کی سفارش کی، والد ماجد نے اپنے بڑے فرزند عبد الخالق شاکر کو تو اپنے ساتھ کاشت کاری میں معاون بنا لیا مگر اپنے دوسرے ہونہار صاحب زادے کو فارسی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم دلوانے کی خاطر تقریباً ۱۹۱۳ء میں دار العلوم لطیفیہ ویلور لے جا کر درس میں داخل کرا دیا۔ حضرت شاکر نائطی نو سال تک وہاں مختلف اساتذہ کرام سے عربی اور فارسی کی تکمیل کرتے رہے۔ اس دوران آپ نے علمِ تصوف میں بھی خوب فیض حاصل کیا۔ حضرت غوث

گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ) کی کتاب "جواہر خمسہ" اور حضرت قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ ھ) کی تصنیفات "جواہرالسلوک" اور "جواہرالحقائق" ہمیشہ زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ حضرت شاکر نائطی اگرچہ شمس العلما حضرت مولانا مولوی محی الدین سید شاہ عبداللطیف معروف بہ حضرت مکی (۱۲۸۹ھ - ۱۳۳۸ھ) (۱۸۸۱ء - ۱۹۱۹ء) کے دورِ سرپرستی میں مدرسہ لطیفیہ میں داخل ہوئے تھے۔ مگر حضرت مکیؒ سے براہِ راست استفادہ کرنے کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ البتہ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا مولوی ابوالسعادات احمد کویاشالیاتی ملیباریؒ شیخ الادب دارالعلوم لطیفیہ اور حضرت الحاج مولانا مولوی حافظ قاری سید محمد قاسم صاحبؒ ویلوری کے اسمائے گرامی کا پتہ چلتاہے۔ حضرت شاکر نائطی علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوگئے۔ چناں چہ آپ نے حضرت مکیؒ کے فرزند و خلفِ صادق حضرت مولانا مولوی حافظ الحاج ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری ویلوریؒ (۱۳۲۴ھ - ۱۳۷۸ھ) کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور سلوک و ریاضت کے منازل طے کرتے ہوئے خلافت و اجازت سے فیض یاب ہوئے۔ مدرسہ لطیفیہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ "گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول ویلور" میں بہ حیثیت اردو مدرس داخل ہوگئے۔ یہ ملازمت تقریباً ڈھائی سال تک جاری رہی۔ اس زمانے میں شہر ویلور کے مشہور کالج اورہیس کالج (Voohrees College) میں اردو اور فارسی کا شعبہ قائم تھا، جس میں آپ کے استاذ حضرت مولانا حافظ قاری سید محمد قاسم صاحب (سابق استاذ لطیفیہ) لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے تھے (۵)۔

جناب استاذ محترم عازم بیت اللہ ہوئے تو آپ نے اپنی جگہ اپنے لائق و فائق شاگرد کو مقرر کیا۔ حضرت شاکر نائطی مذکورہ کالج میں اپنے استاذ کے حرمین شریفین سے واپسی تک لکچرار کی حیثیت سے نہ صرف کام کرتے رہے بلکہ اس ملازمت کی پوری تنخواہ استاذ کے گھر پہنچاتے رہے۔ آپ کی اس سعادت مندی و بلند کرداری کی مثال آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ آج تلامذہ اپنے اساتذہ سے حق تلفی کی شکایت کرتے نظر آتے

ہیں۔

جب جمادی الاول ۱۳۴۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۴ء میں شمالی آرکاٹ کے ملک التجار جناب کاکا محمد عمر صاحب مالکِ روشن کمپنی نے عمر آباد (نزدِ آمبور) میں ایک عظیم تعلیمی ادارہ و دینی مدرسہ "دارالسلام" کے نام سے قائم کیا تو شمالی ہند سے مولانا شفیع بہاری اور جنوب سے مولانا شاکر نائطی کو تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے عمر آباد آنے کی دعوت دی (۶)۔ حضرت شاکر نائطی چوں کہ مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھے اور جناب کاکا عمر صاحب اہلِ حدیث اور غیر مقلد تھے۔ اس لیے آپ شش و پنج میں پڑ گئے، ادھر داعی نے اصرار کرنا شروع کر دیا تو آپ نے اپنے شیخ حضرت سید عبدالقادر قادری سے مشورہ طلب کیا، شیخ نے فرمایا کہ "آپ اللہ کا نام لے کر چلے جاہیے، آپ کے مسلک کو کوئی دھکا نہیں لگے گا" (۷)۔ اس کے بعد آپ ۱۹۲۵ھ کے اوائل میں عمر آباد منتقل ہو گئے اور تدریسی خدمات میں منہمک ہو گئے۔ آپ کے ذمہ اس وقت فارسی اور عربی ادب کی کتابیں دی گئی تھیں جس سے آپ کو فطری ذوق تھا۔ آپ کی تفہیم عمدہ اور طرزِ بیان صاف و شستہ تھا۔ اسی لیے طلبا میں کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے جامعہ "دارالسلام" کے اولین ناظم (Principal) مولانا محمد فضل اللہ صاحب کا وصال دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہوا تو حضرت شاکر نائطی کو مرحوم کے مقام پر ناظم مقرر کیا گیا۔ آپ اس منصب جلیل پر اپنی علالت تک یعنی ۱۹۵۱ء تک فائز رہے، بعد ازاں آپ عہدۂ نظامت سے تو سبکدوش ہو گئے مگر تدریسی میں مشاغل اور تعلیمی خدمات سے تاحیات دست بردار نہیں ہوئے۔

حضرت شاکر نائطی عہد طفلی ہی سے اردو کے شائق تھے۔ شاید یہ شوق آپ کے اولین استاذ مولانا سید عالم حیدر آبادی کا عطیہ تھا، قیام ویلور کے دوران یہ جذبہ خوب پروان چڑھتا گیا۔ اساتذۂ لطیفیہ جن میں شمال و جنوب کے فاضلین شامل تھے۔ آپ کے ادبی ذوق کی آب یاری کرتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ پودا نہ صرف تناور درخت بن گیا بلکہ بار آور بھی ہونے لگا۔ چناں چہ آپ نے چھبیس سال کی عمر میں شعر گوئی کی

ابتدا کر دی۔ پہلے پہل غضنفر تخلص اختیار کیا جو کہ خود آپ کے نام کا جز تھا۔ مگر بہ قول آپ کے فرزند مولانا کاظم نائطی صاحب "بعد ازاں اپنے مشفق استاذ حضرت مولانا مولوی سید محمد قاسم صاحب کے حکم پر شاکر اختیار فرمایا (جو کہ خاندانی نام تھا) اور اسی سے معروف ہوئے" (۸)۔ آپ دورِ طالب علمی ہی سے اردو کے معیاری و مستند رسائل و جرائد کے خریدار تھے۔ جن میں سید علی قادری بہار کا ماہانہ "جلوۂ سخن" نیاز فتح پوری کا رسالہ "نگار" اور مولانا ابو الکلام آزاد کے مجلے "الہلال" اور "البلاغ" قابل ذکر ہیں۔ آپ نے جامعہ دار السلام عمر آباد کے طلباء میں عربی و فارسی کے علاوہ اردو ادب کا اعلیٰ ذوق پیدا کر دیا تھا۔ آپ کے زیرِ نگرانی ادبی مباحث اور مشاعرے باقاعدہ ہوا کرتے تھے جس میں اطراف و اکناف کے شعرا و ادبا بھی ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ آپ کے معاصرین میں حضرت علامہ ضیاء الدین امانی باقوی (متوفی ۱۳۸۶ھ) حضرت فہیم آمبوری، حضرت آسی ترپاتوری وغیرہ احباب سے دوستانہ مراسم تھے۔ مذکورہ حضرات سے گھنٹوں ادبی و علمی گفتگو فرمائے تھے۔ آپ سے سیکڑوں شعرا نے مشورۂ سخن کیا تھا۔ آپ کی صحبتوں کی وجہ سے متعدد نا پختہ ذہنوں کو بالیدگی عطا ہوئی تھی۔ آپ سے اکتساب فیض کرنے والوں میں حضرات دانش فرازی مرحوم کاکا عظیم آمبوری، کاوش بدری، سالک نائطی راز میاز صاحب مولانا اسمعیل رفیعی، مولانا عبد الوہاب ظہوری، مولانا عبد الرحمن تشنہ، سید حمزہ حسین کیفی، طاہر آمبوری راغب آمبوری، مولانا حبیب خاں سروش، مولانا سید مصطفیٰ حسین بخاری اور مولانا ابو البیان حماد صاحب ممتاز ہیں۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ طبع رسا میں جدت و ندرت تھی۔ تصوف کے مسائل کو نظم کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ وحدۃ الوجود کے قائل تھے، ہزار رنگ سے اس مسئلہ کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا۔ معنوی عمق اور گہرائی و گیرائی آپ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ آپ کا اردو دیوان تاحال زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے، آپ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

جب تک مرا وجود اسیرِ قیود تھا
میں جاہلِ حقیقت و سرِ وجود تھا

کچھ صبر کر کے دیکھ تو لینا تھا اے کلیم
جلوؤں کو ان کے آپ ہی شوقِ نمود تھا

آئینہ کہہ کے رکھ نہ سکا ان کے سامنے
حسرت کی چٹکیوں سے مرا دل کبود تھا

شاکر سے شرطا بندگیٔ بت ادا ہوئی
مردِ خداوہ دیر میں وقفِ سجود تھا

ہم نے کی اس کی جستجو دل میں
مل گئی دل کی آرزو دل میں

ایسی صورت ہے ہو بہ ہو دل میں
جیسے بیٹھا ہوا ہے تو دل میں

اف رے یہ عشق کی بلا نوشی
نام کو بھی نہیں لہو دل میں

عشق رسوا مزاج ہے شاکر
تابہ کے ذوقِ آبرو دل میں (۹)

اے جنوں خاک اڑانے سے بگڑ جائے نہ بات
خاک ہو جائے نہ یہ رنگ گلستان مجھ سے

تھا وہ شیرازۂ ہستی جسے توڑا تو نے
ہو گیا عالمِ ایجاد پریشان مجھ سے

سازِ غمِ دل چھیڑ کہ محتاج ہے غافل
جو نشۂ مضراب ہو ایسی نوا ہیچ

چھیڑو اپنی ضرورت کو، ضرورت ہے اس کی
تدبیر بجز شیوۂ تسلیم و رضا ہیچ

ہم جل رہے تھے پہ غابہ نشاں نہ تھا
دل کی لگی وہ آگ تھی جس میں دھواں نہ تھا

روکا تھا مجھ کو میری خودی کے حجاب نے
دیکھا تو ان کے در پہ کوئی پاسباں نہ تھا

تھا اعتبارِ نقص و کمالِ نگاہِ شوق
وہ جلوہ جو عیاں بھی نہیں تھا، نہاں نہ تھا

دل میں اترائے رنگینیِ گلزار بہت
گل کھلانے کو ہے اک آہِ شرر بار بہت

معصیت کیش رہا دعویِ پندار بہت
یعنی ناکردہ گنہ اور گنہ گار بہت

ذرا اب کام لے اے قیس اپنے جذبِ کامل سے
مچل کر خود بہ خود لیلیٰ نکل آئے گی محمل سے

ہمارا کارواں بانگِ جرس میں گم ہوا جاکر
چلا شورِ سلاسل میں، ملا شورِ سلاسل سے

بتاتے ہیں کہ شاکر وہ سماں آنکھوں میں پھرتا ہے
لرزتی ہے نظر قاتل کی اب تک رقصِ بسمل سے

ہے شوق کو ابھی ہوسِ نغمۂ طرب
سازِ دل پہ نشترِ نغمہ زن ابھی

کیوں کر کہوں چڑھی ہوئی تیوری اتر گئی
طرفِ نقاب میں تو وہی ہے شکن ابھی

سویا ہے اس کے سایہ میں فتنوں کو لے کے حشر   بے دار ہے تری نگہہ، پرفتن ابھی
شاکریہ کہیے مرعیٔ خود پسند سے   اہل کمال سے نہیں خالی دکن ابھی

مذکورۂ بالا اشعار میں رعایت لفظی اور برمحل محاروں کا استعمال حضرت شاکر نائطی کے کمال فن اور زبان پر دسترس پر دال ہے۔آپ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل، مثنوی، رباعی، اور قصیدے میں آپ کا وہی استاذانہ کمال نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کے حصول کے لیے نہ صرف فطری صلاحیت کافی ہوتی ہے بلکہ مشق و مزاولت بھی شرط اولین ہے۔آپ کی چند رباعیات پیش کی جارہی ہیں جس کے مطالعہ سے ہمارے دعویٰ کی صحت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے:

ظلمت کدۂ دہر کی رونق ہوجا   ہر مرتبہ، وجود میں برحق ہوجا
نسبت ہے عدم تو پھر لحاظ نہ کر   اسقاطا اضافات میں مطلق ہوجا

ہر رنگ کے قمقمے فروزاں دیکھے   دل چسپ و نظرفریب چراغاں دیکھے
اے منبع برق، توہی لہراتا ہے   تیرے ہی کرشمے یہ نمایاں دیکھے

کیا چیز ہے جانتے ہو برقی قوت   اک لہر ہے منفی اور دیگر مثبت
منفی پہ بھی خطِ نسخ کھینچ جاتا ہے   اور آپ سے ہوجاتی ہے روشن وحدت

آگاہ بشر ہو اپنی اصلیت سے   ہوجائے بلند پستی خلقت سے
اک جرم تو کیا ہزار جرم سہی   آدمیت بھلی ہے انسانیت سے

حضرت شاکر نائطیؒ کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت نامہ حاصل تھی، بڑی برجستہ تاریخیں نکالتے تھے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔اپنے شیخ کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا صدرالدین سید شاہ محمد طاہر قادری کی شادی کے موقعہ پر آپ نے جو سہرا لکھا اس کے آخر کے دو شعر یہ ہیں:

روشنی ہی روشنی پھیلی ہے ان کی ہر طرف   نور سے معمور اک ویلور کیا سارا دکن
کہہ دیا شاکر نے برجستہ یہ سن تقریب کا   جشن صدرالدین سید شہد محمد بوالحسن

۱۳۷۰ھ

حضرت شاہ طاہر قادری کی صاحب زادی "بی بی امتہ الحیٔ عرف بی جانی" کی ولادت کے بعد نام رکھائی کی رسم کے موقعہ پر کہی گئی نظم کے اختتامی شعر اس طرح ہیں:

عمر اس کی خدا دراز کرے عمر بھر ہو یہ ہی دعائے خضر
فکرِ تاریخ ہے اگر شاکر کہہ دو اب جاں نواز تحت جگر

۱۳۷۱ھ

حضرت شاہ طاہر قادری کی ایک اور دختر "محمود النساء عرف بیگم پاشا" کی بسم اللہ خوانی کی تقریب کے موقعہ پر حضرت شاکر نائطی نے ایک فارسی نظم کہی تھی جس کا تاریخی شعر کسی قدر پر معنیٰ ہے ملاحظہ ہو:

بہ سن ہجری چہ خوش تر گفت شاکر اے زہے فکرش کلام پاک اقرا خواند محمود النسا اینجا

۱۳۸۲ھ

حضرت شاکر نائطی نے عمر آباد سے ۱۹۳۵ء میں ماہ نامہ "مصحف" جاری کیا تھا جو تقریباً چھ سال تک اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ "مصحف" کا معیار کافی بلند تھا، چار چھ شماروں کے بعد ہی اس کی ہندوستان گیر شہرت ہو گئی، اس مجلہ میں علامہ سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، اور نصیر الدین ہاشمی جیسے قد آور ادیبوں اور محققوں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ منظوم و منثور حصوں میں خوش گوار توازن ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس کے مدیر حضرت شاکر خود تھے۔ نائب مدیر کی حیثیت سے حضرت (۱۲) مولانا سید شاہ صبغتہ اللہ بختیاریؒ کافی سرگرم عمل تھے۔ حضرت شاکر نائطی نے سیکڑوں علمی اور ادبی مضامین لکھے ہیں، آپ کے رشحاتِ قلم سے افسانے بھی تخلیق پائے ہیں جو "مصحف" کی زینت بنے ہیں۔ ان میں "لذیذ انتقام" نامی افسانہ علمی و ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ آپ کے مضامین کو جمع کریں تو کئی ایک ضخیم مجموعے وجود پذیر ہو سکتے ہیں۔ جس سے علم و ادب کی خاصی خدمت ہو جائے گی تا حال کسی نے اس کام کی طرف توجہ مبذول نہیں کی۔ آپ کی تصانیف میں ذکرِ حبیب" نامی رسالہ۔ تصوف اور "الانابہ الیٰ اشعار الصحابہ" قابلِ ذکر ہیں۔ "الانابہ" آپ کی عربی تصنیف ہے جس میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے اشعار کی نہایت

بلیغ اور عمدہ شرح کی گئی ہے۔یہ کتاب جامعہ دار السلام عمر آباد کے نصاب میں شامل ہے۔آپ نے حضرت بحری قدس سرہ کی معرکہ آرا دکنی مثنوی کی شرح بھی لکھی تھی مگر آج تک منظر عام پر نہیں آسکی۔ پتہ نہیں اب کہاں اور کن ہاتھوں میں ہے۔آپ کے اردو دیوان کو خود آپ نے ترتیب دیا تھا۔اس کا حشر بھی اول الذکر سے مختلف نہیں ہے۔آپ نے شیخ کے پردہ فرمانے کے بعد "چد مبرم" کے ایک مشہور صحافی بزرگ حضرت خواجہ شاہ حبیب اللہ قادری چشتی (متوفی ۱۹۷۱ء) سے طالب ہوگئے تاکہ حصول برکت کے مزید مواقع حاصل کریں۔حضرت شاکر نائطی نے راہ تصوف کی طرح میدان شعر و ادب میں بھی یہی طریقہ اپنایا، یعنی خود ہی بلند پایہ شاعر، ادیب، نقاد اور استاذ فن ہونے کے باوجود صرف اہل زبان سے نسبت کی خاطر حضرت ناطق گلاوٹھوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔جس کا احساس استاذ محترم کو خوب تھا۔ حضرت ناطق آپ کی بڑی قدر و منزلت کرتے اور آپ کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے تھے (۱۳)۔"بزم احسن" ناگپور کی طرف سے ۱۹۴۹ء میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں شرکت کی دعوت حضرت شاکر نائطی کو دی گئی۔آپ ناگپور میں حضرت ناطق کے مہمان رہے، ناگپور میں آپ کا قیام تقریباً پانچ دن رہا، اس دوران آپ نے حضرت ناطق کا ایک طویل خط دیکھا جو "عالمگیر" کے مدیر شبلی کے نام تحریر کیا گیا تھا اور اس خط میں مولانا حالی اور ان کے ہم نواؤں پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ آپ نے اس خط کو اپنے گراں قدر اور عمدہ تعارف کے ساتھ رسالہ کی شکل دے کر "کلیل میں غلیل" کے عنوان کے ساتھ شہر بنگلور سے شائع فرمایا (۱۴)۔آپ کے علمی کارناموں میں سب سے اہم اور مستند حضرت قطب ویلور قدس سرہ کی بلند پایہ تصنیف "جواہر السلوک" کے حصہ اول کا ترجمہ ہے۔جس کو آپ کے وصال کے بعد "دار التصنیف والاشاعت" مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہ العزیز نے ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۸ء میں شائع کیا تھا۔اس ترجمہ پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے پروفیسر مولانا محمد حسین باقوی نے اپنے مقدمہ میں رقم کیا کہ:

ترجمہ کی عمدگی کی بابت یہ کہنا کافی ہے کہ مترجم نہ صرف یہ کہ [illegible]
و تصوف سے وابستہ تھے اور اس فن کو اہلِ فن سے حاصل کیا تھا [illegible]
کا ذوقِ ادب اور ترجمانی معارف و حقائق میں مہارت ترجمہ کی صحت
کی ضمانت دیتی ہے" (۱۵)۔

ذیل میں حضرت شاکر نائطی کے اردو ترجمہ سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے تاکہ
اہلِ علم و اصحاب ذوق علمی و ادبی زبان کی لذت سے محفوظ ہوں۔

"اختلاف درجات کا لحاظ کرتے ہوئے طبقات انسانی کے مراتب تین
ہیں۔ پہلا واصلین و کاملین کا مرتبہ ہے، یہ بلند طبقہ ہے۔
دوسرا طریقہ کمال کے سالکین کا مرتبہ یہ درمیانی طبقہ ہے۔
تیسرا ان لوگوں کا مرتبہ ہے جو نقصان کی پستی میں پڑے ہیں اور یہ
ادنیٰ طبقہ ہے۔ واصلین کو بہ لحاظ تقرب اولیت ہے۔ سالکین کا شمار
ابرار و اصحاب یمین میں ہوتا ہے اور نقصان کی پستی میں پڑے ہوئے
لوگ اشرار ہیں جو اصحابِ شمال میں آتے ہیں۔
اہلِ وصول کے تین گروہ ہیں:
پہلا گروہ انبیا کا ہے جن کو حق تعالیٰ نے وصول و کمال کے بعد
ناقصین کی تکمیل کے لیے خلق کی طرف بھیجا۔ اور ان کے وجود کو
غیب و شہادت کا رابطہ قرار دیا ہے۔ وہ خلق کو حق کی طرف دعوت
دیتے ہیں اور عالم ناسوت و مثال کو معمور رکھتے ہیں۔ دوسرا گروہ
مشائخ صوفیہ کا ہے جنھوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل
متابعت سے وصول کا مرتبہ پایا ہے۔ اس کے بعد بہ طریق متابعت
دعوت خلق کے لیے مامور کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے
"کہدو (اے پیغمبر) یہ میرا راستہ ہے، میں بصیرت پر اللہ کی طرف
دعوت دیتا ہوں اور وہ بھی جنھوں نے میری اتباع کی" یہ دونوں

گروہ کامل اور مکمل ہیں جن کو فضل اور عنایت ازلی نے جمع و توحید کے سمندر میں ڈبونے کے بعد ماہی فنا کے شکم سے نکال کر تفرقہ کے ساحل اور بقا کے میدان پر لا ڈالا تاکہ خلق کو نجات و درجات کی طرف رہنمائی کرتے رہیں۔

تیسرا گروہ: یہ وہ جماعت ہے جو درجہ، کمال پر پہنچ تو گئی مگر خلق کی دعوت اور تکمیل کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں کی گئی۔ یہ لوگ جمع کے دریا میں غرق رہے او ماہئ فنا کے شکم میں ایسا ناچیز و ہلاک ہوئے کہ ساحل تفرقہ پر نہ ان کی کوئی خبر اور نہ مقام بقا میں ان کا کوئی اثر رہا اور وہ دریائے غیرت و حیرت کے بسنے والوں میں شامل ہوگئے۔ کمال و وصول کے بعد تکمیل خلق کی ولایت ان کے سپرد نہیں کی گئی" (۱۶)۔

(۱۔ شہود حق بلا خلق کو جمع کہتے ہیں۔ ۲۔ ذات حق کو جمع اور فرق کے ساتھ ایک جاننا اور اس میں خود کو گم کرنا اور یگانہ ہونا و بے گانہ رہنے کی توحید کہتے ہیں۔ ۳۔ قلب کو شک میں ڈالنا، صفات و ذات میں فرق کرنا، خلق کو دیکھنا حق تعالیٰ کو نہ دیکھنا اسی کو تفرقہ کہتے ہیں۔ ان کو مجذوب و مستہلک کہتے ہیں)

مذکورہ اقتباس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاکر نائطی کی "شرح من لگن" سے بھی کچھ حصہ پیش کیا جائے۔

شعر من لگن — اس جھاڑ کو جائیں گے جھٹک جب
تب بج کوں پائیں گے سو کیا رب

شرح شاکر — اس جھاڑ کو " یعنی یہ جہان اور یہ عالم مانند درخت کے ہے۔ اس کو جھٹک کر یعنی چھوڑ کر جب جائیں گے تب بج یعنی اس وقت تخم کو یعنی اپنے رب کو پائیں گے جھاڑ سے مراد عالم، بج سے مراد رب یعنی ذات باری جل شانہ ہے بہ مصداق انا الیٰ ربک

المنتھیٰ۔

شعر من لگن: اس جھاڑ کوں تو ہو ویگا بیج
اس بیج میں تیج ہے سو وہ ہی نیج

شرح شاکر: اس جھاڑ کر البتہ ایک بیج ہے۔ "اس بیج میں تیج" یعنی روشنی جلالت عزت و فخر ہوتا ہے
"وہی نیج" یعنی سرو کمال ہے۔ بیج، تیج اور نیج میں تجنیس خط ہے۔ سمجھ گیا اس کو جو سمجھ گیا۔

شعر من لگن: وہ جھاڑ یو جگ جو دیکھ میں آئے
لکھنے منے آئے لیکہ میں آئے

شرح شاکر: وہ درخت یہ جہاں ہے جو دیکھنے میں لکھنے میں اور گرفت میں آتا ہے یعنی باقاعدہ محسوس ہوتا ہے۔

شعر میں لگن: وہ بیج سو نور احمدی حق
وہ بیج میں تیج نور مطلق

شرح شاکر: وہ بیج سے مراد نور احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس بیج میں نور مطلق کا نور ہے" (۱۷)۔

حضرت شاکر نائطی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ آپ کی شخصیت جلوہ گاہ صد رنگ تھی۔ بیسوی صدی کی تیسری دہائی میں آپ کی ہستی کی ضیا پاشی ہی سے تامل ناڈو میں شعر و ادب کے بام و در منور ہوئے۔ آپ کا وصال ۲۸ جنوری ۱۹۶۷ء کو عمر آباد میں ہوا اور عمر آباد سے متصل قصبہ گڈھ آمبور کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

حضرت شاکر نائطی نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی اور بچے خدا کو پیارے ہوگئے تو آپ نے دوسرا عقد کیا جس سے ایک لڑکی (۱۶) اور پانچ لڑکے ہوئے۔ لڑکی وفات پا گئی۔ لڑکے الحمدللہ تمام صاحب علم و عمل اور با اخلاق ہیں، جن میں بالخصوص مولانا سالک نائطی اور مولانا کاظم نائطی بہ حیثیت شاعر، ادیب اور نقاد کے معروف و ممتاز ہیں۔

نفحۃ العنبریہ فی مدح خیر البریہ ص ۱۰ (ضمیمہ کتاب)

(۲) احمد عبد العزیز معروف بہ نواب عزیز جنگ بہادر نلوری مؤلف "تاریخ النوائط" ص ۲۸ مطبوعہ

(۱) ۱۳۲۲ھ در عزیز المطابع عزیز باغ حیدر آباد دکن

(۳) ایضاً ص ۱۹۷

(۴) مولانا محمد یوسف کوکن عمری مضمون مولانا شاکر نائطی اور ان کی ادبی اور صوفیانہ خدمات ماخوذ از "وانیم باڑی اور اس کے نواح میں علم و ادب کی خدمت، ص ۷ مطبوعہ ۱۹۸۷ اسلامیہ کالج وانیم باڑی - اشاعت نمبر ۲ مرتبہ ڈاکٹر جلال عرفان -

(۵) آپ شاعر بھی تھے - قاسم تخلص فرماتے تھے - آپ کا کلام "جلوۂ یار" میرٹھ میں شائع ہوا تھا، تقریباً اسی سال کی عمر میں ۱۹۴۰ء میں آپ کا وصال ہوا تھا - نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

خرام ناز کے فتنے ہزاروں دیکھے ہیں ۔۔۔ نہ ہوگا فتنۂ محشر سے اجتناب مجھے

بڑھاپے میں قاسم جواں ہوگئی ۔۔۔ طبیعت شراب کہن کی طرح

(۶) وانیم باڑی اور اسکے نواح میں علم و ادب کی خدمت - ص ۷

(۷) ایضاً ص ۸

(۸) راقم الحروف کے پاس مولانا کاظم نائطی کی تحریر موجود ہے -

(۹) اللطیف بابتہ ۱۳۸۶ھ ص ۶۴

(۱۰) تامل ناڈو میں اردو از علیم صبا نویدی (مخطوطہ) ص ۱۶۵

(۱۱) سال نامہ اللطیف ۱۳۸۶ھ ص ۶۵

(۱۲) حضرت قبلہ بختیاری صاحب رائے چوٹی ضلع کڈپہ کے متوطن تھے - ابتدائی تعلیم سے اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید شاہ علیم اللہ بختیاری (سابق استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور) سے حاصل کی - بعد ازاں دار العلوم دیوبند چلے گئے، آپ نے وہاں سے فراغت کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید شاہ حسین احمد مدنی کے حلقہ بہ گوش ہوگئے - "دیوبند" سے واپسی کے بعد "جامعہ دار السلام عمر آباد" میں استاذ مقرر کیے گئے - جہاں سے آپ نے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی دعوت پر جماعت اسلامی کے داعی بن گئے اور خوب تبلیغ کی، پھر اپنے شیخ کے حکم پر اس سے قطع تعلق کرلیا اور مدرسہ باقیات صالحات ویلور میں مدرس بنادئے گئے - راقم الحروف کو حضرت والا سے شرف تلمذ حاصل ہے - آپ کا وصال ۱۹۹۳ء میں ہوا، مدفن رائے چوٹی میں ہے -

(۱۳) راقم نے حضرت شاکر نائطی کے بڑے صاحب زادے مولانا سالک سے اس مسئلہ پر گفتگو کی تو انھوں نے راقم کے خیال کی تائید کی۔

(۱۴)) وانیم باڈی اور اس کے نواح میں علم وادب کی خدمت۔ ص ۱۴

(۱۵) "جواہرالسلوک " از حضرت قطب ویلور (اردو ترجمہ) مرتبہ مولانا سید مصطفیٰ حسین بخاری قادری ص ۳۱ پتہ نہیں کس لیے اس کتاب کے سرورق پر مترجم کا نام نہیں دیا گیا حالاں کہ حصہ اول کے دس فائدوں (فصلوں) میں سے تقریباً ساڑھے نو فائدوں کا ترجمہ حضرت شاکر نائطی نے اپنے بزرگوں کے حکم پر کیا تھا لیکن حیات نے وفا نہیں کی، ترجمہ مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ بقیہ ترجمہ یعنی نویں فائدہ کا نصف حصہ اور دسواں فائدہ کا ترجمہ مولانا سید مصطفیٰ حسین بخاری صاحب نے مکمل کردیا۔ اس طرح دس فائدوں پر مشتمل یہ ترجمہ ص ۱۸۴ صفحات کو محیط ہے۔ جواہرالسلوک کا متن فارسی میں ہے جس میں چالیس فائدے شامل ہیں اور یہ حضرت قطب ویلور کی آخری تصنیف ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات پر رقم کردی گئی ہے۔

(۱۶) جواہرالسلوک (ترجمہ) ص ۵، ص ۶ مطبوعہ دارالتصنیف والاشاعت مکان حضرت قطب ویلور ۱۳۹۸ھ م ۱۹۷۸ء۔

(۱۷) ایضاً ص ۵۹ تا ص ۶۰

(۱۸) جن کا نام ثروت صاحب تھا۔ مشہور شاعر ادیب جناب راز امیاز صاحب سے بیاہی گئیں اور بہت جلد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ پانچوں صاحب زادوں کے نام یہ ہیں۔ سالک نائطی، کاظم نائطی، خالد نائطی، ظفر نائطی، اشفاق نائطی۔ الحمدللہ سبھی اپنی اپنی جگہ خوش حال ہیں۔

(۱۷) مولانا مولوی سید شاہ مصطفی حسین بخاری لطیفی کشفی

آپ خاندانِ ساداتِ بخارا کے چشم و چراغ ہیں، آپ کے والد حضرت سید حسن بخاری عرف سید پیر باشا ابن حضرت ابوالحسن سید شاہ عبدالقادر بخاری کا شمار شہر کڈپہ کے باوقار و معزز تاجروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے خاندانی شرافت کے باوصف رزق حلال کے لیے محنت و مشقت سے کبھی جی نہیں چرایا۔ مولانا بخاری صاحب کی ولادت شہر حیدرآباد میں بہ تاریخ ۲۹/ دسمبر ۱۹۳۸ء ہوئی۔ تعلیم کی شروعات گھر پر اپنے والد کی رہنمائی میں اور پھر مدرسہء اسلامیہ جامع مسجد کڈپہ کے ناظر و بانی مشہور عالم دین و مصلح ملت حضرت مولانا مولوی سید شاہ محمد یعقوب صاحب بغدادی باقوی مدظلہ العالی کے زیر سرپرستی ہوئی۔ ابتدائی فارسی و عربی کی تعلیم کے بعد مولانا بخاری صاحب نے ۱۹۵۶ء میں ویلور کا رخ کیا اور دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان میں مولوی کورس میں داخلہ حاصل کر لیا، جہاں آپ نے مولانا محمد طیب الدین اشرفی بہاری، مولانا سید حمید اشرف کچھوچوی اور مولانا مفتی ابوالعالی علوی ملیباری جیسے علما و فضلا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ کی فراغت ۱۹۶۳ء میں درجہء عالمیت سے اور ۱۹۶۵ء میں درجہء فضیلت سے ہوئی۔ چوں کہ آپ ایک ہونہار، محنتی، بااخلاق او باصلاحیت طالب علم تھے اس لیے فراغت کے فوری بعد ۱۹۶۶ء میں آپ کو اپنے مادرِ علمی ہی میں خدمت درس و تدریس پر مامور کر دیا گیا۔ شہر کڈپہ پر جہاں آپ کا بچپن گزرا شعر و شاعری کے خوش گوار ماحول کے لیے دور دور تک مشہور ہے۔ کڈپہ میں سالانہ تین چار عظیم مشاعرے اور وقتاً فوقتاً ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ مولانا بخاری پر ان کا خاصہ اثر پڑا اور آپ جب مدرسہء لطیفیہ پہنچے تو وہاں کا خالص علمی و ادبی ماحول نے سونے پہ سہاگا کا کام دیا، قابل اساتذۂ کرام کی رہنمائی نے آپ کے ذوق کو مہمیز لگائی تو آپ بخاری سے قیصر بن گئے اور میدان شعر و سخن میں شہہ سواری کرنے لگے۔ ان ہی دنوں میں حضرت علامہ شاکر نائطی سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔ حضرت شاکر نائطی اپنے بزرگوں سے

عمر آباد سے حضرت مکان حاصل کرنے ویلور کثرت سے آیا جایا کرتے تھے۔ مولانا بخاری نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر آپ سے خوب اکتساب فیض کیا جس کی بدولت مولانا بخاری کا ادبی ذوق کافی حد تک جلایا گیا۔ حضرت شاکر نائطی نے اپنے شاگرد رشید کا تخلص قیصر نکال کر کشفی رکھا۔ بہ قول مولانا بخاری حضرت شاکر نائطی نے فرمایا کہ "مولوی صاحب! قوم کے خادم قیصر تخلص زیب نہیں دیتا۔ آپ اپنے بزرگوں کے نام پر کشفی رکھ لیجئے۔" مولانا کشفی بخاری کی ایک نعت شریف کے چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں جو ۱۹۶۱ء کے آس پاس کہی گئی تھی۔

یوں ہم بے خودی میں سمائے ہوئے ہیں — مئے عشق میں ڈگ مگائے ہوئے ہیں
تمنائے جنت پھر اس دل میں کیسے — کہ جس میں محمدؐ سمائے ہوئے ہیں
مدینہ کا ہر ذرۂ خاک چومیں — یہ ہی اک تصور بسائے ہوئے ہیں
ملائک ہو یا حور، یا جن و انساں — یہاں سب خودی کو مٹائے ہوئے ہیں
لیے ہم بھی کشفی نیاز عقیدت — محمدؐ کے روضے پہ آئے ہوئے ہیں (۱)

حضرت شاکر نائطی نے اپنی علالت کی وجہ سے ویلور آنا جانا ترک کردیا تو مولانا بخاری نے بھی اپنی شاعری ترک کردی۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے آپ کے استاذ مولانا طیب الدین اشرفی صاحب نے آپ کی توجہ مضمون نویسی اور نثر نگاری کی طرف مبذول کرادی۔ مولانا طیب الدین اشرفی چوں کہ اہل زبان تھے۔ اس لیے انھوں نے آپ کے مضامین کی خود اصلاح کی اور زبان و بیان کے اعتبار سے آپ کو پختہ و شستہ کردیا۔ اس کے بعد آپ نے کئی علمی و ادبی مضامین سپرد قلم کیے جو دارالعلوم کے آرگن سال نامہ "اللطیف" کی زینت بنے۔ مولانا بخاری ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۸ء "اللطیف" کے مدیر رہے۔ آپ نے طلبۃ العلوم میں ادب و انشا کا اعلیٰ ذوق پیدا کیا، مدرسہ میں ہر ہفتہ یعنی ہر شب جمعہ بیت بازی کی محفلیں سجتی تھیں اور ادبی مذاکرے ہوئے تھے۔ ان سب کے پس پشت آپ کی ادبی شخصیت کار فرما رہی تھی۔ آپ کا علمی و ادبی قابل ذکر کارنامہ "جواہر السلوک" کا ترجمہ ہے۔ بہ قول آپ کے:

"اس عظیم الشان کتاب کے ترجمے کی سعادت میرے لیے کسی بھی

نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ جس وقت یہ ناچیز بزرگان ِمکان
حضرت قطب ویلور قدس سرہ کی سرپرستی میں علامہ شاکر نائطی علیہ
الرحمہ کے ترجمہ کو متن کے ساتھ ترتیب دے رہا تھا۔ یہ خواہش
دامن گیر ہوئی کہ کم از کم دس فائدوں کو مکمل کر دیا جائے لہذا اللہ کا
نام لے کر نویں فائدے کے تقریباً نصف حصہ کی اس عبارت " نیز
باید دانست کہ اقوال و افعال الخ سے ترجمہ کرنا شروع کر دیا،
الحمد اللہ دس فائدے مکمل ہوگئے۔ مزید ۲۴ فائدوں کا ترجمہ بھی ہو گیا۔
اس وقت بقیہ چھپے فائدوں کے ترجمے کا کام جاری ہے۔ انشاء اللہ
تعالیٰ وہ بھی عن قریب ہو جائے گا" (۲)۔

آپ نے اسی خاندان اقطاب ویلور کے چشم و چراغ اور آستانہ، حضرت قطب ویلور کے سجادہ نشین اعلیٰ حضرت سید شاہ محمد باقر قادری مدظلہ کے دست ِمبارک پر بیعت کی فرقہ ۔ خلافت سے بہرہ ور ہوئے۔ مولانا بخاری صاحب یکم مارچ ۱۹۷۹ء کو مدراس یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ (Sindicate) کے رکن منتخب کیے گئے۔ اس منصب بلند پر چند ماہ فائز رہنے کے بعد بعض ناگزیر حالات کی بنا پر دار العلوم لطیفیہ کی خدمت تدریس سے ۱۹۷۹ء کے اواخر میں مستعفی ہوگئے اور اپنے وطن ِمالوف کڑپہ لوٹ آئے۔ یہاں آپ ایک طرف آبائی تجارت " گھڑی سازی " کے فروغ دینے میں جٹ گئے ہیں۔ تو دوسری طرف علم و ادب کی خدمت بھی پورے انہماک کے ساتھ کر رہے ہیں۔ چناں چہ آپ کا قائم کردہ ادارہ " ہدیٰ انگلش میڈیم ہائی اسکول " جو عن قریب کالج کی صورت اختیار کرنے والا ہے ترقی پر روز افزوں گامزن ہے۔ علاوہ ازیں آپ انجمن ترقی اردو کڈپہ کے ضلعی صدر ہیں۔ آل انڈیا ملی کونسل کے ریاستی رکن بھی۔ آپ سے بہت سارے افراد نے استفادہ کیا جن میں مولوی حافظ بشیر الحق لطیفی ادھونی مولوی محمد شاکر اللہ شاکر لطیفی مدن پلی، مولوی محمد حنیف غازی لطیفی اور مولوی مصطفیٰ کمال لطیفی میسوری قابل ذکر ہیں۔ مولانا بخاری صاحب اپنے خاندانی آستانہ،

بخاریہ کے موجودہ سجادہ نشین ہیں۔

حواشی

سال نامہ اللطیف "پہلا شمارہ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۲ء ص ۳۶

"جواہرالسلوک" ص ۲

مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قریشی

آپ امتیاز گڈھ (ادھونی، ضلع کرنول صوبہ۔ آندھرا) کے ایک عظیم و قدیم و علمی دینی گھرانے میں ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت مولانا محمد نور قریشی اشرفی شاہی جامعہ مسجد کے امام اور مسجد کارواں کے خطیب تھے۔ آپ کا خاندان کئی پشت سے امامت، خطابت اور قضاوت کی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ آپ کے جد امجد مولانا مولوی عبدالصمد قریشی نہ صرف خطیب و قاضی تھے بلکہ صاحب قلم بھی تھے۔ موصوف کا خانگی کتب خانہ عوام و خواص کے استفادہ کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ آج بھی اس چمن علم کے خوشہ چیں شہر ادھونی اور اطراف و اکناف کے علاقوں میں موجود ہیں۔

مولوی بشیر الحق صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ۔ تحفظ القرآن شاہی جامعہ مسجد ادھونی میں ہوئی۔ آپ نے مولانا حافظ ریاست علی خاں نظامی سے حفظ قرآن مجید کی تکمیل کی۔ بعد ازاں دار العلوم لطیفیہ ویلور حاضر ہوئے آپ کا داخلہ "مولوی کورس" میں ہوا۔ آپ نے تقریباً آٹھ سال تک فارسی، عربی اور تصوف کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا ابوالمعالی علوی صاحب، مولانا مولوی سید حمید اشرف۔ کچھوچھوی اور مولانا مولوی عبدالواحد جونپوری، مولانا مولوی سید مصطفیٰ بخاری کڈپوی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے آپ کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ ذہن و دل کی گرہیں کھولیں اور علم و ادب کی لازوال لذتوں سے روشناس کیا۔ آپ نے ۱۹۷۶ء میں دار العلوم کے درجہ۔ فضلیت سے امتیازی کامیابی حاصل کی۔ آپ ابتدا سے ذہین و فطین اور باوقار و باکردار طالب علم تھے۔ آپ کی دیانت و ذہانت اور آپ کے بلند اخلاق و مرنجا مرنج طبیعت سے خوش ہو کر دار العلوم کے ذمہ داروں نے فراغت کے بعد فوری تدریسی خدمات کی پیش کش کی جسے آپ نے اپنے بزرگوں کا حکم سمجھ کر بے چوں وچرا قبول کر لیا اور تاحال اسی منصب تدریس پر فائز ہیں۔ دوران طالب العلمی آپ نے مدراس یونیورسٹی سے افضل العلماء، منشی فاضل اور ادیب فاضل کی سندیں

حاصل کیں جس سے آپ کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔ شعر و شاعری کے لیے طبیعت موزوں نہیں پائی البتہ نثر و انشا کی طرف افتاد طبع کو متوجہ دیکھ کر اس میں مشق شروع کر دی۔ مولانا سید مصطفیٰ حسین بخاری و دیگر اساتذہ کی ہمت افزائی و رہنمائی کی وجہ سے قلیل مدت میں اچھے خاصے انشاپرداز اور قابل رشک مضمون نگار بن گئے۔ آپ کے نوک قلم سے کئی کتابیں اور مقالے منظر عام آئے جن میں سے اکثر و بیش تر زیور طباعت سے آراستہ بھی ہو گئے۔ آپ کی مطبوعہ کتب و رسائل کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) شراب اور اس کا اسلامی موقف

(۲) توسل نبیؐ کی شرعی حیثیت

(۳) مجدد جنوبی ہند حضرت قطب ویلور قدس سرہ

(۴) رضوان صحابہؓ

(۵) صحابہ کرامؓ کے متعلق اہل سنت و جماعت کے عقائد

(۶) بیعت و ارادت کی شرعی حیثیت

(۷) رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

(۸) آثار الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

(۹) غایۃ التحقیق (فارسی سے اردو میں ترجمہ)

(۱۰) فصل الخطاب (حضرت قطب ویلورؒ معرکہ آرا فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ)

(۱۱) اسلامی قانون سازی کا تاریخی جائزہ (پروفیسر عبدالوہاب خلاف ازہری، ازہر یونیورسٹی مصر کی عربی تصنیف "خلاصۃ تاریخ تشریع اسلام" کا اردو ترجمہ)

مندرجہ بالا رسائل کے علاوہ آپ کے علمی، ادبی اور تحقیقی مقالے سال نامہ لطیف "سال نامہ" "صفیر" ویلور اور سال نامہ "نفیر" ویلور میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ آپ کا ایک طویل مقالہ "تذکرۂ اقطاب ویلور قدس اللہ اسرار ھم جو سال نامہ اللطیف ۱۴۰۴ھ بہ یادگار اقطاب ویلور (خاص نمبر) کی زینت بنا تھا اور جس کو اہل

علم نے کافی سراہا تھا۔ آج مآخذ کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ اس لیے کہ اقطاب ویلور کی تاریخ و خدمات پر اب تک کے تحریر کردہ تذکروں مثلاً مولانا مولوی حافظ محمد زکریا ادیب خاور رائے چوٹی (متوفی ۱۹۷۹ء) سابق استاذ دارالعلوم لطیفیہ ویلور کے رسالے "خانوادۂ اقطاب ویلور" (۱) اور مولانا مولوی محمد طیب الدین اشرف بہاری کی کتاب "انوارِ اقطاب ویلور" (۲) جناب شیخ عبدالرحیم کامی ویلوری کی انگریزی تصنیف "خانقاہِ مکان حضرت قطب ویلور سے کہیں زیادہ مذکورہ مقالہ میں حسنِ ترتیب اور صحت واقعات کا خیال رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت قربی ویلوریؒ کی اردو خدمات پر مولوی بشیرالحق صاحب کا ایک بسوط مقالہ سال نامہ "صغیر" (۳) ویلور میں شائع ہوا تھا جو آپ کی ژرف نگاہی اور ادبی صلاحیتوں کی نشان دہی کرنے کے لیے کافی ہے۔ آپ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء میں موجودہ سجادہ نشین آستانہ قطب ویلورؒ حضرت مولانا ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری کی بیعت اور خلافت سے سرفراز ہوئے ہیں۔ فی الحال مدرسہ کی تدریس کے علاوہ مسجد حضرت علی سلطانؒ گاندھی روڈ ویلور کی امامت و خطابت کے منصب پر فائز ہیں۔ مولوی بشیرالحق قریشی ان دنوں پروفیسر مولانا سید قدرت اللہ باقوی صاحب کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی تحقیق میں مصروف ہیں۔

دارالعلوم لطیفیہ کے فیض یافتہ گان کی اردو خدمات کے مفصل تذکرے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم دارالعلوم کے سرپرستوں کا مختصر تعارف و تذکرہ کیا جائے۔

حواشی

(۱) مطبوعہ ۱۹۵۸ء بنگلور (مولانا ادیب خاور کا یہ تذکرہ اقطاب ویلور کے مطبوعہ تذکروں میں اولین تذکرہ ہے)۔ ناشر مدرسہ لطیفیہ ویلور

(۲) مطبوعہ ۱۳۸۳ھ ۱۹۶۳ء برقی قومی پریس بنگلور ناشر دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

(۳) "سال نامہ صغیر" بابت ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء مدیر راہی فدائی ناشر انجمن اردو مدرسہ باقیات صالحات ویلور

اعلیٰ حضرت مولانا ابو لنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری

آپ شمس العلماء حضرت مولانا مولوی محی الدین سید شاہ عبد اللطیف قادری المعروف بہ حضرت مکی (۱۲۹۸ھ ـ ۱۳۳۸ھ) قدس سرہ کے دوسرے صاحب زادے ہیں ـ آپ کی ولادت ۲۱/ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ بہ وقت طلوع سحر ہوئی ـ مؤلف " خانوادۂ اقطاب ویلور نے لکھا ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت آپ کے والد نے خواب میں دیکھا کہ مکان کے در و دیوار اور شجر و حجر پر " ابو قطب الدین سید محمد باقر " لکھا ہوا ہے ـ خواب کی تعبیر میں نکالی گئی کہ نو مولود کا یہ ہی نام رکھا جائے چناں چہ ایسا ہی ہوا ـ آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ کے جید اساتذہ کرام کے پاس ہوئی ـ آپ نے چند پارے قرآن شریف کے حفظ کیا تھا مگر تکمیل نہیں ہوئی ـ آپ کا رجحان بچپن سے تصوف کی طرف تھا ـ اپنے بڑے بھائی مولانا مولوی الحاج الحافظ ابو الفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبد القادرؒ (۱۳۲۴ھ ـ ۱۳۷۸ھ) سے علم معارف حاصل کیا ـ سلوک و ریاضت کے جملہ مراحل طے کرنے کے بعد برادر بزرگ نے ۱۰/ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ بہ روز جمعہ آپ کو خاندانی بیعت و خلافت سے سرفراز فرمایا اور ایک سو اکانوے سلاسل میں اجازت مرحمت فرمائی ـ اس مبارک و مسعود موقعہ پر آپ کے دونوں بھائی حضرت مولانا الحاج ابو صالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری اور حضرت مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری کو بھی بیعت و خلافت سے مشرف کیا گیا ـ آپ اپنے اور برادر بزرگ کے پردہ فرمانے کے بعد یوم اربعین کے موقعہ پر ۲۲/ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ کو مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے اس موقعہ پر حضرت میراں ابو صالح سید احمد جیلی قادری نے ہدیہ ـ تہنیت پیش کیا جس کا تاریخی عنوان اور آخری شعر اس طرح ہے:

جشنِ انبساط بخش
۱۳۷۸ھ

یہ مسند نشینی کی تاریخ ہے تحیتہ لقا ہے یہ والا مکاں

۱۳۷۸ھ

مولانا ادیب خاور رائے چوٹی نے جو تبریک نامہ پیشِ خدمت کیا اس کا اختتام درج ذیل دو شعر پر ہوا ہے:

اے کہ ترے وجود سے سارے دکن کو برتری — رونق صد حیات ہے دورِ حیاتِ باقری
میں کیا مری بساط کیا، تجھ پہ نثار جاں و دل — ادنیٰ ترین غلام ہے تیرا ادیب خاوری

اعلیٰ حضرت تاحال دارالعلوم لطیفیہ کے سرپرست اور مکان قطب ویلور کے سجادہ نشین ہیں (۱)۔ آپ کی ذات والا صفات اپنے بزرگوں کی کامل و مکمل نمونہ ہے۔ بلند کرداری، بے نفسی، مہمان نوازی اور حق گوئی و بے باکی آپ کے اوصافِ حمیدہ میں نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ عاطفت تادیر ہمارے سروں پر بحال رکھے آمین بجاہ سید المرسلینؐ۔

حواشی

(۱) افسوس کہ آپ کی وفات حسرت آیات ۱۲/ نومبر ۱۹۹۴ء مطابق ۲۱/ جمادی الاخر ۱۴۱۵ھ بہ روز شنبہ بہ وقت ساڑھے چھ ساعت صبح ہوئی۔ تدفین اپنے آبا و اجداد کے گنبد میں حضرت قربی اور حضرت ذوقی علیہم الرحمتہ والرضوان کے بیچوں بیچ ہوئی۔

دار العلوم لطیفیہ کے سابق ناظم (principal) حضرت مولانا ابوالحسن صدرالدین سید شاہ طاہر صاحب قادری معروف بہ حضرت پیر کی شخصیت نہ صرف اس مدرسہ کی بلندی و ترقی میں کوشاں رہی بلکہ اس مدرسہ کے فارغین اور اس گلستان علم کے مستفیدین میں اردو زبان و ادب کی لذت پیدا کرنے اور ان کے ذوق سلیم کو شعر و سخن کی موزونیت سے ہم کنار کرنے میں مقدور بھر کوشش کی۔ چناں چہ آپ ہی کے دور نظامت میں ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں سال نامہ "اللطیف" جاری ہوا تھا جو ابھی تک بہ حمد اللہ پابندی سے ہر سال طبع ہو رہا ہے جس میں مدرسہ کے اساتذۂ کرام کے معیاری مضامین، بیرونی فاضلین کے تحقیقی مقالے اور طلبۃ العلوم کے بہترین نگارشات شامل اشاعت رہتے ہیں۔ حضرت پیر ناظم صاحب کے زیر اہتمام و انصرام دائرۃ المعارف کا قیام عمل میں آیا۔ ہفتہ وار منعقد ہونے والی اس انجمن میں اساتذۂ کرام کی نگرانی میں مختلف موضوعات پر طلبا کی تقریریں ہوتیں۔ بیت بازی کرائی جاتی اور ادبی مباحث ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے دور حاضر میں تصنیف و تالیف کی اہمیت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے مدرسہ ہٰذا میں بہ تاریخ ۹/ شعبان المعظم ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۶ / دسمبر ۱۹۶۳ء بہ روز پنجشنبہ "دار التصنیف والاشاعت" کا افتتاح فرمایا، چناں چہ اس ادارے کی طرف سے درج ذیل کتب و رسائل اشاعت پذیر ہوئے ہیں:

(۱) خانوادۂ اقطاب ویلور مرتب مولانا ادیب خاور (۲) انوار اقطاب ویلور از مولانا طیبب الدین بہاری (۳) رسائل حضرت قربی قدس سرہ از مولانا طیبب الدین (۴) رسالہ بیعت غائب و حاضر از مولانا طیبب الدین (۵) میزان العقائد از مولانا طیبب الدین (۶)) انشائے عقائد ذوقی از مولانا طیبب الدین (۷) جواہر السلوک (حصہ اول ابتدائی دس فوائد) از مولانا سید مصطفیٰ حسین بخاری (۸) خانقاہ مکان حضرت قطب ویلور (انگریزی) از شیخ عبد الرحیم کافی ویلوری۔

حضرت پیر کے دور اہتمام میں دار العلوم لطیفیہ کا الحاق ۱۹۶۵ء میں مدراس یونیورسٹی سے ہوا۔ جس کی وجہ سے یہاں افضل العلما منشی فاضل اور ادیب فاضل کا

نصاب جاری کیا گیا نتیجتاً طلبا العلوم یونیورسٹی کی سندیں اپنی مادرِ علمی میں رہ کر حاصل کر رہے ہیں۔ حضرت پیر کی سحر آگیں شخصیت اساتذۂ کرام اور طلبۃ العلوم کے لیے یکساں جاذب توجہ اور قابلِ قدر رہی ہے۔آپ کی ولادت بہ تاریخ ۱۵/ جمادی الاول ۱۳۳۶ھ بہ روز چہارشنبہ ہوئی۔ ابتدائی فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ، لطیفیہ میں ہوئی۔آپ کا طبعی رجحان انگریزی تعلیم کی طرف تھا لہذا آپ کا داخلہ گورنمنٹ محمڈن ہائی اسکول ویلور میں کیا گیا۔آپ نے ہائی اسکول سے ایس۔ایس۔ایل۔سی کرنے کے بعد محمڈن کالج مدراس میں داخل ہوگئے اور وہاں سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔ لا کالج مدراس پہنچ کر اپنی انگریزی اور قانونی تعلیم کی تکمیل کی، بعدازاں آپ اپنے برادر بزرگ کے حکم پر دارالعلوم لطیفیہ آگئے اور نظامت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ جس کا سلسلہ آپ کی وفات ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۶ء تک جاری رہا۔آپ کا عقدِ سعید ۴/ جمادی الاول ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۱/ فروری ۱۹۵۱ء کو حضرت سید شاہ میراں محی الدین ورنگلی کی دختر نیک اختر سے ہوا(۱)۔جس سے دو لڑکیاں ہوئیں، بڑی صاحب زادی عالی جناب سید شاہ عثمان صاحب قادری عرف فصیح پاشا، بی کام۔ایم۔اے، پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر (زیر نگرانی پروفیسر عابد صفی)موجودہ ناظم دارالعلوم لطیفیہ سے اور دوسری صاحب زادی عالی جناب سید شاہ ہلال احمد صاحب قادری عرف ہلال پاشاہ (ایم۔اے) نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ ویلور سے بیاہی گئیں۔چوں کہ مذکورۃ الصدر دونوں حضرات نہایت متین، سنجیدہ، منکرالمزاج اور صالح اقدار کے حامل ہیں۔اعلیٰ حضرت قبلہ کی حمایت و سرپرستی میں کاروانِ علم و عمل کی رہبری کر رہے ہیں۔اس لیے ان جواں سال قائدین سے بہ جا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان کے عہد میں ماضی کی طرح مستقبل میں بھی یہ چمن علم خوب پھولے پھلے۔اس کے ثمرات دور تک پہنچے اور اس کی خوش بو سارے عالم کے مشامِ جاں کو معطر کرتی رہے۔

مدرسہ، لطیفیہ کی تقریباً پونے تین سو سالہ علمی و ادبی خدمات کا مفصل تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کا اختتام پروفیسر مولانا

یوسف کوکن کی مندرجہ ذیل رائے پر کیا جائے جس کی وقعت و اہمیت گذشتہ صفحات کے مطالعے سے عیاں ہوجاتی ہے۔ بہرحال پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ:

"فارغین دارالعلوم لطیفیہ کی بڑی لمبی فہرست ہے ۔۔۔۔ اس درس گاہ سے صرف فقہیہ اور صوفی ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ بہت اچھے ادیب اور شاعر بھی بنے۔ جنھوں نے فارسی اور اردو شاعری کو بہت زیادہ فروغ دیا، ہر جمعہ رات کو مدرسہ کی انجمن میں طلبا کے سامنے تقریریں کرنے کے بعد آپس میں بیت بازی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو گھنٹوں جاری رہتا تھا۔ بیت بازی کے جوش میں سیکڑوں فارسی اور اردو کے اشعار یاد کرلیا کرتے تھے اور اس طرح ان کا فارسی اور اردو ادب پختہ ہوجاتا تھا ۔۔۔۔ دیارِ کرناٹک (۲) میں دارالعلوم لطیفیہ ہی ایک مدرسہ ہے جو تقریباً ۱۱۳۴ ھجری سے اپنی علمی خدمات انجام دیتا جارہا ہے ۔۔۔۔ حیدرآباد، آندھراپردیش اور ادھر بمبئی، میسور اور ملیبار کے علاقوں میں بھی لطیفیہ کے فارغین کا اثر نظر آئے گا۔ اور یہ علاقے اب بھی اس سے فیض اٹھاتے جارہے ہیں" (۳)۔

حواشی

(۱) خانوادۂ حضرت قطب ویلور کی مایہ ناز و تاریخ ساز شخصیت ص ۲۳ از مولوی حافظ بشیر الحق قریشی قادری مطبوعہ ۱۹۸۷ء جمعیتہ الاصلاح، ادھونی

(۲) قدیم کرناٹک کا رقبہ تقریباً تمام جنوبی ہند کو محیط ہے۔ جس کی تفصیل باب اول میں دی گئی ہے۔

(۳) سال نامہ اللطیف بابت ۱۳۹۰ھ ص ۱۳۴ دارالعلوم لطیفیہ کی علمی خدمات از پروفیسر یوسف کوکن صدر شعبہ عربی فارسی، اردو (مدراس یونیورسٹی مدراس)

○ ○ ○

"مدرسہء باقیات صالحات ویلور کے علمی و ادبی کارنامے"

پر محققین و اہل قلم کی آراء کا خلاصہ

(۱) "آپ (راہی فدائی) کی کتاب مدرسہء باقیات ...... بہت کارآمد کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مدرسہء باقیات اور جنوبی ہند کے علماء کی وقعت اور توقیر میں اور بھی اضافہ ہوگا۔ اللہ آپ کو اجر دے گا۔"

(جناب شمس الرحمن فاروقی۔ الہ آباد)

(۲) "یہ بہت قابلِ تعریف علمی خدمت ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اس کتاب میں بیشتر ان علماء کا اور ان کی علمی خدمات کا تذکرہ ہے جن سے میں واقف نہیں تھا، بعض حضرات کے صرف نام سے آشنا تھا، کام سے نہیں۔ شمالی ھند کے بہت سے لوگ میری طرح ان حضرات کے افادات علمیہ سے بے خبر ہوں گے اس لئے یہ کتاب میری معلومات میں سراسر اضافہ ہوگی۔"

(پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ دہلی)

(۳) "آپ نے واقعی بڑا کام کیا ہے۔ باقیات کی خدمات کا جائزہ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی لے نہیں سکتا تھا۔ میں آپ کے اس کام کی قدر کرتا ہوں اور یقین ہے کہ ہر ذی ہوش آدمی اس کام کو سراہیگا۔"

(پروفیسر حسرت سہروردی۔ ترچناپلی)

(۴) "آپ کی کتاب مدرسہء باقیات........ ایک قابلِ تعریف کتاب ہے اور اردو ادب کی تاریخ کا ضروری حصہ۔ آپ نے واقعی تذکرہ نویسی کی دوسری یعنی جدید قسم میں اضافہ کیا ہے سچ خوش ہوگیا۔"

(جناب کالی داس گپتا رضا۔ ممبئی)

(۵) "آپ نے فی الحقیقت ایک بڑا کام کیا ہے، جو اپنی حوالہ جاتی حیثیت میں ہمیشہ ناگزیر رہے گا۔ اس ادارے (مدرسہ باقیات صالحات) نے اکابر پیدا کیے اور آپ نے انھیں علمی دنیا کا حصہ بنا دیا۔"

(پروفیسر معین الدین عقیل ۔ جاپان)

(۶) "آپ نے بڑی محنت سے مدرسہ کی تاریخ لکھی اور وہاں سے فیض یاب ہونے والے علماء کا تفصیلی ذکر کر کے ان کے حالات محفوظ کر دیے ۔ میں نے اس مدرسہ کا ذکر سنا تھا لیکن اس کی اصل اہمیت کا اندازہ آپ کی کتاب دیکھ کر ہوا۔"

(پروفیسر مختار الدین احمد ۔ علیگڈھ)

(۷) "آپ نے بڑی محنت، ذہانت اور سلیقے سے مقامی علماء اور ادباء کی تحریروں کے تعلق سے اطلاع بہم پہنچائی ہے ۔ اسی نوعیت کے کام زبان و ادب کے ایک بڑے کینوس کی ترتیب میں کافی معاون ثابت ہوتے ہیں۔"

(جناب جوگندر پال ۔ دہلی)

(۸) "آپ کی کتاب مراجع کی حیثیت اختیار کر جائے گی، جب بھی ضرورت پڑے اس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔"

(مولانا خلیل الرحمن اعظمی عمری ۔ عمر آباد ۔ شمالی آرکاٹ)

(۹) "یہ آپ نے بہت عمدہ کام کیا ہے ۔ ؎ نام نیک رفتگاں ضائع مکن! میں اس مدرسہ کے کام سے تو کیا نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ آپ کی کتاب اس مدرسہ کے تعلق سے میرے علم میں اضافے کا باعث ہوئی ہے ۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔"

(پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۔ جموں ۔ کشمیر)

(۱۰) "آپ نے جس محنت اور ریاضت سے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے اور تلاش و جستجو کے بعد جو معلومات فراہم کی ہیں اس نے اس تذکرے کو تاریخی دستاویز بنا دیا

ہے اور جب تک اس طرح کی کامیاب کی کوششیں انجام نہیں پائیں گی وقت تک جنوبی ہند کی کوئی علمی و ادبی تاریخ بھی مرتب نہیں ہوسکے گی۔ آپ کی یہ کاوش اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ بعض حضرات کے بارے میں آپ نے جس وضاحت اور تفصیل سے کام لیا ہے، اس نے اس کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔"

(پروفیسر عظیم الشان صدیقی۔ دہلی)

(۱۱) "علماء و فضلاء مدرسہ باقیات صالحات، ویلور نے جو علمی و ادبی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور مدرسہ کے فیض یافتہ حضرات نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ دین اسلام اور زبان اردو کی تاریخ میں زریں حروف میں تحریر کیے جانے چاہیے۔ آپ نے مدرسہ باقیات صالحات ویلور کی دینی، علمی و ادبی خدمات پر تحقیقی کام کر کے اسلاف کا جو حق تھا اسے ادا کیا ہے۔"

(جناب ششی ٹنڈن۔ آگرہ)

(۱۲) آپ کی گراں قدر تصنیف مدرسہ باقیات .... اردو تحقیق کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔ عام طور پر لوگ شمالی ہند کی ادبی تاریخ پر سر دھنتے ہیں یا ان کی رسائی دکنیات تک ہوتی ہے۔ تمل ناڈو کے علمی و ادبی کارناموں پر آپ تصنیف کے ذریعہ جو حقائق سامنے آئے ہیں ان کو جان کر حیرت و مسرت ہوئی، زباں و بیاں کی نزاکتوں اور لطافتوں کا خیال تمل ناڈو کے اردو شعرا میں کس قدر تھا۔ شمالی ہند کے اساتذہ کے مقابلے میں جنوبی ہند کے اردو شعراء کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ حضرت شاکر وانمباڑی کی قدرت کلام کا اعتراف ہر اہل نظر پر لازم ہے۔ مدرسہ۔ باقیات و صالحات ایک مذہبی ادارہ ہی نہیں، ایک ادبی دبستان کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔"

(جناب ڈاکٹر مختار شمیم صاحب۔ اندور)

(۱۳) "آپ نے اس کی ترتیب میں انتہائی محنت سے کام لیا ہے اور بڑی عرق ریزی

کے بعد مکمل حوالوں کے ساتھ اسے اپنے علاقہ کی ایک دستاویز بنادیا ہے۔
اور اس مخصوص ادارہ کے اہل قلم کو باقی اردو دنیا سے مکمل طور پر متعارف
کرا کر انہیں پوری اردو برادری کا ایک ناگزیر حصہ بنادیا ہے۔"

(جناب قمر سنبھلی صاحب۔دہلی)

(۱۴) "آپ کی اس کتاب سے دکن میں اردو ادب کی رفتار و معیار کے کئی گم شدہ
گوشے سامنے آئے اور یہ نئی کتاب اپنے اسلاف سے جہاں آپ کی محبت کا بین
ثبوت ہے وہیں گم شدہ حقائق کی بازیافت کے عمدہ نمونے بھی ہیں۔آپ کا یہ
کام ادب کی تاریخ میں اضافے کا سبب ہے بلکہ خود آپ کے نام کی بقا کا ذریعہ
بھی ہے۔"

(ڈاکٹر خالد سعید۔بیدر)

(۱۵) "آپ کی عالمانہ کتاب "مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے علمی و ادبی کارنامے"
ملی۔آپ نے "کڈپہ میں اردو" کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری کتاب لکھ دی ہے
"

(پروفیسر گیان چند جین۔لکھنو)

(۱۶) آپ کے مضامین تحقیقی بھی ہیں اور تنقیدی بھی۔آپ جتنی اچھی شاعری
کرتے ہیں اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے ہیں۔لائق توجہ بات یہ ہے کہ آپ نے
اپنے علاقے کے ارباب فن کو روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یہ
اقدام مستحسن بھی ہے اور قابل قدر بھی۔"

(ظہیر غازی پوری۔بہار)

محترم ڈاکٹر مولانا راہی فدائی کی تحقیقی تصنیف "دارالعلوم لطیفیہ ویلور کا ادبی منظر نامہ" کے لیے مادہ تاریخ و قطعہ تاریخ طباعت

مادہ ہائے تاریخ

"یا کریمُ یا غنیُ یا مجیب"

۱۴۱۸ھ

"یا قدیمُ یا حفیظُ یا خبیر"

۱۹۹۷ء

"بے بہا منظر نامہ خاص"

۱۹۹۷ء

قطعہ تاریخ طباعت

بیتے دنوں کے علم و ادب کا
نام و نسب ہے منظر نامہ
قطب زماں کا ذکر ہے اس میں
رحمت رب ہے منظر نامہ
حضرت قربی تا تقوی
بزم طرب ہے منظرنامہ
سال اشاعت اس کا افسر
طاق ادب ہے منظر نامہ

۱۴۱۸ھ

نتیجہ فکر رزاق افسر، ۳۹۱۱ بزم اردو، حیدر علی روڈ، لشکر محلہ، میسور ۵۷۰۰۰۷